زکوٰۃ کے جدید مسائل

اور اس کے شرعی احکام

حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی مدظلہ

اس کتاب میں جن اہم مسائل سے بحث کی گئی ہے ان میں سے چند یہ ہیں:
زکوٰۃ کا مفہوم، نصاب زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، کمپنیز پر زکوٰۃ، اموال تجارت پر
زکوٰۃ، ہیرے اور جواہرات پر زکوٰۃ، شیئرز پر زکوٰۃ، ان قرضوں کی تفصیل جو
وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں، رفاہی اداروں کی املاک پر زکوٰۃ، مال حرام پر زکوٰۃ

تاثرات:
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ العالی
مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی
شیخ الاسلام حضرت مولانا جسٹس مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی

جلد اوّل

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

34965877

چند تاثرات برائے اسلامی فقہ اکیڈمی

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ

صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

"اسلامک فقہ اکیڈمی ہند" ایک ایسا ادارہ اور تنظیم ہے جس پر ہندوستانی مسلمانوں ...... بالخصوص علماء اور دینی غیرت وفکر رکھنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو فخر اور فخر سے زیادہ خدا کا شکر کرنے کا حق حاصل ہے، یہ ایک خالص تعمیری، فکری، علمی اور فقہی تنظیم اور اجتماعیت ہے جس میں ملک کے ممتاز، صحیح العقیدہ وصحیح الفکر اور وسیع العلم علماء اور کارکن شامل ہیں"۔

مفتی اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی مدظلہ العالی

صدر دارالعلوم کراچی

"مجھے بے انتہا مسرت بھی ہے اور کسی قدر حسرت بھی، مسرت اس بات کی کہ ہندوستان کے علماء کرام نے وہ عظیم الشان کام شروع کیا ہے جس کی پورے عالم اسلام اور اقلیت والے ملکوں کو شدید ضرورت ہے۔ اور حسرت یہ ہے کہ ہم پاکستان میں ہونے کے باوجود منظم اور بڑے پیمانہ پر یہ کام شروع نہیں کرسکے...... فقہ اکیڈمی نے بڑا اہم قدم اٹھایا ہے، مدت سے اس کا انتظار تھا"۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

الحمد للہ اس وقت پانچویں فقہی سمینار منعقدہ اعظم گڑھ ۳۰؍اکتوبر تا ۲؍نومبر ۱۹۹۲ء کے مقالات ومباحث پر مشتمل مجموعہ کی دوسری جلد ہدیۂ ناظرین کررہے ہیں، پہلی جلد میں زکوٰۃ سے متعلق ایک اہم موضوع مصارف زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کے مفہوم کی تعیین سے متعلق جملہ مقالات شائع کئے جاچکے ہیں جو اپنے موضوع پر انتہائی جامع اور بڑا علمی ذخیرہ ہے۔

اب دوسری جلد پیش خدمت ہے جس میں مسائل زکوٰۃ سے متعلق حاجت اصلیہ، دین کی زکوٰۃ، تجارت میں پیشگی دی ہوئی قیمت، اور کرایہ دکان ومکان میں دی گئی رقم پر زکوٰۃ، ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کا مسئلہ، پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ، مدارس اسلامیہ میں طلبہ کو دئے جانے والے وظائف، مدرسے کے اموال زکوٰۃ، مال حرام کی زکوٰۃ، سفراء ومحصلین ومہتمم مدرسہ کی حیثیت، جیسے اہم جدید مسائل پر تحقیقی مقالات شائع کئے جارہے ہیں۔

ہندوستان کے خاص پس منظر میں انشورنس کی گنجائش کے مسئلہ پر چوتھے فقہی سمینار منعقدہ حیدرآباد ۹؍تا ۱۲؍اگست ۱۹۹۱ء میں تفصیلی بحث ہوئی، اور پھر چند افراد پر مشتمل ایک کمیٹی کو تجویز مرتب کرنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ ان حضرات نے غور کرنے کے بعد یہ محسوس کیا کہ فسادات کی صورت میں انشورنس کے ذریعہ رقم ملنے کی ضمانت ہے یا نہیں؟ اس کی وضاحت ضروری ہے، چنانچہ نامزد شدہ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی سمینار کے اجلاس عام میں تشکیل دی گئی، جنہیں مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرکے اور ماہرین سے پوری معلومات حاصل کرکے کوئی قطعی رائے قائم کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس دوران انشورنس سے متعلق اصل قوانین منگوائے گئے اور پھر یہ مسئلہ پانچویں فقہی سمینار منعقدہ اعظم گڑھ میں اس کمیٹی کی نشست میں پیش ہوا اور اس وضاحت کے بعد کہ انشورنس کی اسکیمیں بنیادی طور پر فسادات میں ہونے والے

حادثات کو کور کرتی ہیں۔ البتہ بعض اضافی مفادات اس صورت میں نہیں ملتے۔ کمیٹی نے باتفاق رائے ہندوستان کے مخصوص پس منظر میں انشورنش کی اجازت دی، علماء میں سے حضرت مولانا مفتی نعمت اللہ صاحب استاذ حدیث دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا مفتی حبیب الرحمٰن صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، مولانا مفتی حبیب اللہ قاسمی مفتی ریاض العلوم گوریني، حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مفتی دارالعلوم دیوبند، حضرت مولانا عتیق احمد قاسمی صاحب استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، مولانا زبیر احمد قاسمی اشرف العلوم کنہواں سیتامڑھی، مولانا انیس الرحمٰن قاسمی نائب قاضی امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا رفیق المنان قاسمی احیاء العلوم مبارکپور، مولانا سید مصطفےٰ رفاعی ندوی صدر الاصلاح بنگلور، مولانا معاذ الاسلام مرادآباد، مولانا عبداللہ اجراڑہ میرٹھ، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی حیدرآباد، مولانا سلطان احمد اصلاحی ادارۂ تحقیق اسلامی علی گڑھ، مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی دارالافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ، مولانا صدرالحسن ندوی وغیرہ نے اس تجویز پر دستخط کئے۔

مولانا مفتی اشفاق احمد صاحب مہتمم جامعہ شرعیہ فیض العلوم سرائے میر نے اس تجویز کی تائید اس نوٹ کے ساتھ کی کہ:

"مبتلی بہ کی صوابدید پر اجازت کی گنجائش ہے"

گویا اصولی طور پر اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہ انشورنش کرایا جائے یا نہیں ہر شخص کو اپنی انفرادی حالت کے مطابق طے کرنے کا اختیار انھوں نے دیا، ان کی رائے اصل تجویز سے متصادم نہیں ہے۔ مولانا مفتی شبیر احمد مفتی مدرسہ شاہی مرادآباد نے املاک کے بیمہ کی اجازت دیتے ہوئے زندگی کے بیمہ کی اجازت سے اختلاف کیا، انہی نوٹس کے ساتھ یہ تجویز شائع ہوئی۔

افسوس ہے کہ فقہ و فتاوی کے اس مسئلہ کو میدان سیاست کی گیند بنا دیا گیا، اور مفتی اشفاق احمد صاحب کی طرف سے شائع ہونے والے ایک اشتہار کو ہزاروں کی تعداد میں شائع کرا کر ملک بھر میں تقسیم کیا گیا، حالاں کہ یہ کوئی نیا فیصلہ نہیں تھا، مجلس تحقیقات شرعیہ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مورخہ ۵ار۶ار دسمبر ۱۹۶۵ء کو مندرجہ ذیل فیصلہ کیا ہے:

مجلس یہ رائے رکھتی ہے کہ اگرچہ انشورنش کی سب شکلوں کے لئے ربوا و قمار (سود اور جوا) لازم ہے، اور ایک کلمہ گو کے لئے ہر حال میں اصول پر قائم رہنے کی کوشش کرنا ہی واجب

ہے لیکن جان و مال کے تحفظ و بقا کا جو مقام شریعت اسلامیہ میں ہے مجلس اسے بھی وزن دیتی ہے نیز مجلس صورت حال سے بھی صرف نظر نہیں کر سکتی کہ موجودہ دور میں تمدن کی ترقی اور بین الاقوامی ریاستوں سے انشورنس انسانی زندگی میں اس طرح دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے بغیر اجتماعی اور کاروباری زندگی میں طرح طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں اور جان و مال کے تحفظ کے لئے بھی بعض حالات میں اس سے مفر ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ضرورت شدیدہ کے پیش نظر اگر کوئی شخص اپنی زندگی یا اپنے مال یا اپنی جائداد کا بیمہ کرائے تو مذکورہ بالا ائمہ کرام کے قول کی بنا پر شرعاً اس کی گنجائش ہے۔

تنبیہ: اوپر کی عبارت میں لفظ "ضرورت شدیدہ" سے مراد ہے کہ جانی یا مالی و دینی یا مالی کے ناقابل برداشت نقصان کا اندیشہ قوی ہو۔ ضرورت شدیدہ موجود ہے یا نہیں ہونے کا فیصلہ مجلس کے نزدیک مبتلی بہ (جو شدید دشواریوں میں مبتلا ہو کر بیمہ کرانا چاہتا ہے) کی رائے پر منحصر ہے، جو خود کو عند اللہ جوابدہ سمجھ کر علماء کے مشورہ سے قائم کرے۔"

ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس پر دار العلوم دیوبند کے اکابر علماء نے انشورنس کی موجودہ حالات میں اجازت کا فتویٰ دیا تھا جسے ادارہ مباحث فقہیہ جمعیۃ علماء ہند نے شائع کیا۔ اس فتویٰ کی نقل بھی ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

ان حالات میں یہ مسئلہ باب حاجت و ضرورت اور ہندوستان کے مخصوص حالات سے متعلق ہے اور اس خالص فقہی مسئلہ کو کسی قیمت پر بھی سیاست کے میدان کی گیند نہیں بنایا جانا چاہیے۔

مجاہد الاسلام قاسمی
۲۴ جولائی ۱۹۹۲ء

سوالنامہ زکوٰۃ

(۱) محورِ اوّل

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

وجوب زکوٰۃ کی دو شرطیں جن کا تعلق محل زکوٰۃ یعنی اموال سے ہے۔

پہلی شرط ــــ ملک تام

ملک تام سے کیا مراد ہے؟ اس ذیل میں چند سوالات۔

سوال ۱: مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولیابی تک نہیں ہوئی ہے، وہ قیمت جو ادا کی جا چکی اور وہ مال جو خریدار کے ملک میں آچکا لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

سوال ۲: کرایہ کے مکان میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس نقد کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، کرایہ دار پر یا مالک مکان پر؟

سوال ۳: جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟

سوال ۴: وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟
اگر یہ اموال حرام حلال مال میں اس طرح مخلوط ہوگئے ہوں کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہو تو اس صورت میں ان مخلوط اموال میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہے؟

سوال ۵: دین کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک ہے لیکن قبضہ نہیں یا مدیون پر جس کے قبضہ و تصرف میں ہے لیکن اس کے ملک میں نہیں یا دین کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی کیا اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا ہو اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو ایسی صورت میں اس مدیون پر زکوٰۃ واجب قرار دی جا سکتی ہے۔

وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی قسمیں اور وجوب زکوٰۃ کا حکم اور اگر زکوٰۃ واجب ہوگی تو کب اور وصولیابی کے بعد سابق کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی یا وصول ہونے کے بعد مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی؟

سوال ۶: سرکاری محکموں اور مختلف پرائیویٹ کمپنیز میں جو لوگ ملازم ہیں ان کی ماہانہ یافت میں سے ایک حصہ وضع کر کے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کر دیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکار یا کمپنی اپنے ملازم کے مستقبل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پوری رقم ملازم کو دے دی جاتی ہے، دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے بعض اوقات ہر دو قسم کی مذکورہ رقوم پر سرکار یا کمپنی انٹرسٹ کے نام سے بھی کچھ اضافہ جوڑ کر آخر میں وہ مجموعی رقم ملازمین کو ادا کرتی ہے، یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ کہلاتی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ کی مذکورہ بالا رقوم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے وقت واجب ہوگی تو سابق کی بھی واجب ہوگی یا آئندہ سال گذرنے پر؟

دوسری شرط نما — نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں۔
تیسری شرط — حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا۔

حاجتِ اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

(۱) کیا حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا؟
چوتھی شرط ـــــ دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

(۱) دین طویل الاجل، آج کے دور میں زراعتی قرض Agricultural loan تعمیر مکان کے لیے قرض Building Construction Loan اور اس طرح کے مختلف قرض سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کے لیے ۵ سال سے لے کر ۳۰، ۴۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے، اس مدت کے دوران قسط وار قرض کی ادائیگی واجب ہوتی ہے، اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لیے پانچ کروڑ روپئے قرض لیے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے یعنی سالانہ دس لاکھ روپئے ادا کرنا ہے یا کسی شخص نے ٹریکٹر کی خریداری کے لیے ایک لاکھ روپیہ قرض لیا جسے دس سال میں دس دس ہزار سالانہ کے لحاظ سے ادا کرنا ہے، ان صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا سالانہ واجب الادا قسط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی؟
اسلام میں کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے چند اور سوالات۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکاء ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں، بعض ایسی صورتیں ہو سکتی ہیں جس میں کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت کروڑوں روپئے کو پہنچتا ہو جس میں نصاب وجوب زکوٰۃ موجود ہے، لیکن اس کے شرکاء اور حصہ داروں کی تعداد اتنی بڑی ہے کہ کمپنی کی مجموعی مالیت کی تقسیم حصہ داروں پر کی جائے تو ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب

نہیں ہوتا یا کچھ لوگ صاحب نصاب نہیں ہوتے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا؟

ہیرے اور جواہرات

(۱) ہیرے اور جواہرات کی تجارت کی جاتی ہے، جو لوگ ہیرے اور جواہرات کی تجارت کرتے ہیں بظاہر وہ اموال تجارت ہونے کی وجہ سے ان پر تو زکوٰۃ واجب ہوگی ہی لیکن دوسرا سوال یہ ابھرتا ہے کہ جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپئے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ ہیرے جواہرات جو ان کا اصلیہ زینا نہیں ہیں اور بڑی مالیت رکھتے ہیں، شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟
بعض اوقات خواتین محض تزئین و آرائش کے لیے ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا ہے وجوب زکوٰۃ کے بارے میں ان کا کیا حکم ہوگا؟

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین کس نرخ سے کیا جائے، اپنی لاگت کے حساب سے کریں یا اس دن کی قوت خرید کا اعتبار کیا جائے، پھر یہ کہ تھوک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا پھٹکر فروختگی کا اعتبار ہوگا؟
جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں، سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں وہ اراضی بھی اموال زکوٰۃ میں شمار ہوں گی؟ اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب قوت خرید کے اعتبار سے ہوگا یا متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا؟

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

مختلف تجارتی کمپنیاں اپنے شیئرز فروخت کرتی ہیں یہ شرکت کی ایک صورت ہے کمپنی

قائم کرتے وقت کچھ اکائیاں طے کر لی جاتی ہیں، ہر یونٹ (اکائی) ایک شیئر ہوتا ہے اور اس کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے، کمپنی جو کچھ منافع کمائے گی شیئر ہولڈرس اس میں اپنے حصے کے تناسب سے نفع کے حق دار ہوں گے، شیئرز دراصل کسی تجارتی کمپنی کے ایک خاص حصہ کی ملکیت ہے، واضح رہے کہ بعد کو ان شیئرز کی خرید و فروخت ہوتی ہے اور کمپنی کے نفع و نقصان اور اس کے ساکھ کے پیش نظر ان شیئرز کی قیمت گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

پہلا سوال یہ ہے کہ ان شیئرز پر ایک تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت ان شیئرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت کو سامنے رکھ کر کیا جائے گا یا بہ وقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ ہو اس کا اعتبار کیا جائے گا؟

بونڈس سے مراد یہ ہے کہ اکثر حکومتیں یا مختلف کمپنیز لوگوں سے قرضے مانگتی ہیں اور ان قرضوں کی واپسی کے لیے کچھ مدت (۵ سال، دس سال وغیرہ) مقرر کرتی ہیں اور کچھ شرح فیصد سود کا بھی اعلان کرتی ہیں اور بہ طور ثبوت قرض دہندہ کو سارٹیفکٹ ایشو کرتی ہیں وہی بونڈ ہے، سوال یہاں پر صرف اتنا ہے کہ جو کچھ سود کے نام پر دیا جاتا ہے اس کی حرمت میں تو کوئی شبہ نہیں ہے؟ قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس کی زکوٰۃ اسے ادا کرنی ہوگی یا نہیں؟ اور اگر ادا کرنی ہوگی تو سال بہ سال یا بونڈ کے کیش کرانے کے وقت، سبھی گذرے ہوئے برسوں کی یا صرف آئندہ کی؟

محور ثانی ـــــ نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں سے کون سا نصاب اصل تسلیم کیا جائے؟ آج کے دور میں جب کہ سونے اور چاندی کی نرخ میں زمین و آسمان کا فرق ہے، نصاب حرمت زکوٰۃ (غنا یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لیے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) اور اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی یا سونے کے نصاب سے؟

محور ثالث ـــــ مصارف زکوٰۃ

(۱) کیا یہ صورت درست ہوگی کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوٰۃ

ہے، ادارہ اس کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرتا ہے، اس کے طعام پر ماہانہ خرچ سو روپے آتا ہے، اس کی رہائش کے لیے جو مکان فراہم کیا گیا ہے (مکان کی تعمیر عام چندے سے کی گئی ہے) بازار نرخ کے حساب سے اس کا کرایہ ۲۵ روپئے ماہانہ ہے، اساتذہ کے شہریہ (ماہانہ تنخواہ) وغیرہ پر جو خرچ آتا ہے اس کو اگر طلبہ کی خدمت یا متعلق انتظامی امور پر مامور ہے ان کا مجموعی شہریہ تقسیم کیے جانے پر فی طالب علم ۲۵ روپئے ماہوار پڑتا ہے، اس طرح ایک طالب علم پر کل اخراجات ماہانہ مثلاً ڈھائی سو (۲۵۰) روپئے آتے ہیں، مدرسہ یہ نظام بناتا ہے کہ ہر طالب علم سے ڈھائی سو روپئے ماہانہ لیے جائیں، مستطیع طلبا اپنے پاس سے یہ اخراجات ادا کریں اور غیر مستطیع طلبہ کی طرف سے یہ مقررہ فیس مدرسہ مدزکوٰۃ سے ادا کرے یا مدرسہ اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دیدے اور وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کردے، کیا یہ صورت جائز ہوگی؟

ذیل میں ایک سوال یہ بھی ہے کہ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے یا مستحقین زکوٰۃ کا؟

(۲) سوال یہ ہے کہ مدارس کے لیے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر کیے جاتے ہیں وہ ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں اور ساتھ ساتھ وہ عملہ جو حساب کتاب کے لیے مقرر ہوتا ہے اسے بھی ماہانہ تنخواہ دی جاتی ہے، یہ محسوس کیا جارہا ہے کہ ماہانہ تنخواہ پر مقرر کیے ہوئے سفراء و محصلین کے ذریعہ جو آمدنی ہوتی ہے اور ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہنچتا ہے، آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زائد آتا ہے، بعض مدارس میں متعین شرح فی صد کمیشن دیا جاتا ہے، اس صورت میں خرچ کے تناسب کے مقابلہ میں آمد کا تناسب بہتر رہتا ہے، سوال یہ ہے کہ کیا ایسا کرنا جائز ہوگا اور اسے العاملین علیہا کے تحت داخل مانا جائے گا؟ اگر کمیشن کی صورت کو جائز قرار دیا جائے تو کیا شرح فی صد کے تعین کی کوئی خاص حد شرعاً ضروری ہے؟

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے، کیا اس کی ماہانہ تنخواہ مدزکوٰۃ سے ادا کی جاسکتی ہے، جب کہ وہ لوگ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں؟

ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

سوال ۱: کیا زکوٰۃ شیئرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت پر ادا کی جائے یا اس سے ہونے والی آمدنی پر؟ اگر زکوٰۃ آمدنی
پر واجب الادا ہے تو یہ غیر صافی آمدنی پر واجب الادا ہے یا صافی آمدنی پر یعنی وہ خالص آمدنی
جس میں سے اخراجات منہا کر دیے جائیں؟۔

میں نے یہ پڑھا ہے کہ اگر شیئرز کو جنسِ تجارت (خرید و فروخت) اور اس کی تجارت کی طرح
استعمال کیا جائے تو زکوٰۃ ان شیئرز کی بازاری قیمت اور ان کی آمدنی پر واجب الادا ہوتی ہے
میں اس نکتہ کی وضاحت چاہتا ہوں، مزید یہ کہ ایسی صورت میں کہ شیئرز کو مسلسل خریدا اور بیچا
جاتا ہے، نفع بھی ہو سکتا ہے اور نقصان بھی۔ اس لیے زکوٰۃ کس اساس پر ادا کی جائے؟۔

شیئرز کو اگر زیادہ مدت تک پاس رکھا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ زکوٰۃ صرف آمدنی پر
واجب الادا ہے، اگر کسی وجہ سے مالک ان شیئرز کو بیچنے پر مجبور ہو تو اس صورت میں کیا ہوگا؟
کیا اس کو ان کی بازاری قیمت پر ادا کرنا ہوگا یا ان کے نفع پر یا ان سے حاصل ہونے والی آمدنی پر؟۔

سوال ۲: ایک کاروباری ادارہ میں کیا زکوٰۃ کاروبار سے ہونے والے نفع پر واجب الادا ہے یا کسی مقررہ
خاص طور پر موجودہ اسٹاک پر؟

میں نے افزائشِ جانوروں کے کیس میں پڑھا ہے کہ اگر جانوروں کی خرید و فروخت ہوتی ہو تو زکوٰۃ
مقررہ خاص تاریخ پر فارم میں موجود جانوروں کی بازاری قیمت (Market rate) پر
واجب الادا ہوگی۔ البتہ ایسی صورت میں کہ یہ جانوروں والی اشیاء کی فروخت کا ذریعہ ہوں جیسے
دودھ، انڈا، تب زکوٰۃ دودھ، انڈوں پر عائد ہوگی اور جانوروں پر نہیں۔

سوال ۳: سرمایہ اندوزی، تمسکات کی صورت میں زکوٰۃ خالص یا صافی آمدنی یعنی اخراجات کی

بعد پہنچنے والی آمدنی پر واجب الادا ہے۔ چونکہ ہر شخص اخراجات ہر فرد کے جدا اور ہر سماجی طبقہ کے الگ ہوتے ہیں اس لیے شخصی اخراجات کی تحدید کے لیے کیا کوئی معیار مقرر کیا جا سکتا ہے؟

انٹرسٹ اور یوزری اکثر ہم معنی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں

رینڈم ہاؤس ڈکشنری میں انٹرسٹ کی تعریف یوں کی گئی ہے ..... کسی جائداد کی ملکیت یا تجارت یا کاروبار کی ملکیت میں قانونی حصہ، حق یا سند ملکیت .... رقم جو ادا کی جائے یا عائد کی جائے۔ پیسے کے استعمال پر یا کسی پراجکٹ یا کاروبار شروع کرنے یا جاری رکھنے کے لیے لیے گئے قرض پر ......

یوزری کی ڈکشنری میں اس طرح تعریف کی گئی ہے .... ایک حد سے زیادہ بڑھے ہوئے شرح انٹرسٹ پر پیسے قرض دینا یا قرض دینے کی عادت۔

اسلام یوزری پر پابندی لگاتا ہے کیونکہ مجبور افراد کے استحصال کا کھلا ہوا عمل ہے۔ آج کے معاشی نظام میں انٹرسٹ تمام کاروباری دین کے اندر موجود ہے۔ ایک شخص صرف اپنی بقا کی ضرورت کے لیے قرض نہیں لیتا بلکہ اس رقم کو بڑھانے کے لیے، دولت پیدا کرنے کے لیے اور قرض دار کے لیے اور معاشرے کے لیے عام طور پر مواقع پیدا کرنے کے لیے قرض لیتا ہے۔ قرض دار قرض دینے والے فرد یا ادارے کو ایک مقررہ منافع کی ضمانت دیتا ہے، جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اور جہاں ہم گزر بسر کرتے ہیں ایک شخص مقررہ شرح انٹرسٹ سے کچھ لیے یا دیے بغیر رہ سکتا ہے۔

ہندوستان اسلامی ریاست نہیں ہے، ہر موڑ پر انٹرسٹ دینا پڑتا ہے یا لینا پڑتا ہے چند مثالیں درج ہیں:

(۱) زمینداری کے خاتمہ کے بعد ان املاک کے مالکوں کو معاوضہ میں ۳ فی صد انٹرسٹ کے زمینداری بانڈز دیے گئے۔

(۲) اگر کوئی شخص اپنے اثاثہ کو فروخت کرتا ہے تو اس کو کیپیٹل دینے والا کیپیٹل گینس Capacity ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے، اس ٹیکس سے بچنے کے لیے وہ شخص مجبور ہے کہ اس رقم کو بعض to pay مقررہ سیکیورٹیز تمسکات میں جیسے کیپیٹل گینس یونٹ میں لگائے جن پر کم شرح سے مگر مقررہ

شرح سے انٹرسٹ دیا جاتا ہے۔

(۳) شخصی آمدنی پر ٹیکس کی شرح ساری دنیا کے مقابلہ میں ہندوستان میں سب سے زیادہ اونچی ہے۔ کئی صورتوں میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص کی ۵۰ فی صد سے زیادہ آمدنی ٹیکس والوں نے ہضم کرلی۔ اس ظالمانہ محصول کی زد سے بچنے کا قانونی طریقہ یہ ہے کہ حکومت کے بعض اسٹاکس یا بانڈز میں رقم لگائی جائے جن پر کم مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ملتا ہے۔

(۴) پراویڈنٹ فنڈ ہماری آمدنی سے کی جانے والی لازمی منہائیوں پر مشتمل ہوتا ہے جس پر کمپنی کم مگر مقررہ شرح سے انٹرسٹ ادا کرتی ہے۔ تنخواہ یاب لوگوں کے لیے پراویڈنٹ فنڈ ہی بڑھاپے میں بچت کا واحد راستہ ہوتا ہے۔

اگر کسی کے پاس پیسہ ہے تو اس کے تغیر پذیر آمدنی پیدا کرنے والے سرمایہ کاری کے مواقع ہیں۔ جائداد یا شیئرز میں رقم لگانا سرمایہ کاری کے دو اہم ذرائع ہیں جن میں تغیر پذیر نفع حاصل ہوتا ہے۔

مگر بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں آج شیئرز مارکیٹ جوئے کا اڈا بن گئی ہے جہاں مارکیٹ پر کنٹرول کرنے والوں کی من مانی سے یا سیاسی تبدیلیوں سے افواہوں سے قیمتیں بنتی اور بگڑتی ہیں، شیئرز کی قیمتوں کا کوئی تعلق متعلقہ کمپنی کی مالی حالت سے نہیں ہوتا۔

اسی طرح ایک شخص جائداد خریدنے میں ایک مقررہ حد سے زیادہ کی جائداد نہیں لے سکتا ورنہ اس حد سے زیادہ کی جائداد سیلنگ (Ceiling) کے تحت حکومت لے لیتی ہے۔ ان حالات میں کیا حکومت کی سیکورٹیز / بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسڈ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار دی جاسکتی ہے؟۔

جوابات سوالنامہ بابت زکوٰۃ

از ——— مولانا محمد عبید اللہ الاسعدی، الجامعۃ العربیۃ، ہتھورا باندہ۔

ملک تام سے کیا مراد ہے

ملک تام کا مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی کسی مال پر ملکیت اس طور پر ثابت ہو کہ وہ اس مال مملوک میں حسب مرضی تصرف پر قادر ہو، یعنی شریعت کی حدود میں جب چاہے جو چاہے تصرف کر سکتا ہو، ہمارے فقہاء کی زبان میں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ رقبۃً بھی اس کا مملوک ہو اور یداً بھی[1]۔ یعنی اس شئی کی ملکیت اور اس میں تصرف دونوں چیزیں جس آدمی کو حاصل ہوں اس کی ملک تام مانی جائے گی، اسی لیے ان اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے کہ جن میں ملکیت تو پائی جائے مگر تصرف سے آدمی عاجز ہو، مثلاً جو مال کھو گیا ہو اور اس کا کوئی پتہ نہ چلتا ہو، اسی طرح جو سمندر میں گر گیا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت اور غیر موصول مال تجارت کی زکوٰۃ

۱ ——— خریدار نے اپنا جو مال کسی چیز کے خریدنے کے لیے فروخت کنندہ کے سپرد کر دیا وہ خریدار کی ملکیت سے نکل کر فروخت کنندہ کی ملک میں پہونچ گیا، لہٰذا اس کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی۔

۲ ——— خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو جانے اور مشتری (خریدار) کی طرف سے قیمت کے ادا کر دینے کے بعد اگرچہ مال تجارت پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے مگر جب تک قبضہ نہ ہو یہ ملک تام یا مطلق

---

[1] بدائع ۲/۹، شامی ۲/۴

نہیں ہوتی، اس لیے کہ قبضہ کے بغیر خریدار سامان میں کسی تصرف سے عاجز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ اس پر نہیں ہوگی۔[1]

البتہ چونکہ مدار اس کا اس پر ہے کہ آدمی ملک کے بعد بھی تصرف سے عاجز ہو، اس لیے اگر بدون قبضہ بھی آدمی تصرف کرسکتا ہو، یعنی جن اموال یا جن بازاروں میں کسی شخص کو محض خریدنے کے بعد پورے مالکانہ تصرفات کا حق حاصل ہوجاتا ہو، ان میں چونکہ اس شرط کا تحقق ہوگا، لہٰذا خریدار کو اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی اگرچہ مال ابھی اس کے شہر یا اس کے گودام میں نہ پہنچا ہو۔

کرایہ دار کی طرف سے پیشگی رقم یا ڈپازٹ کی زکوٰۃ

۱۔ کرایہ دار جو رقم بطور کرایہ پہلے سے ادا کردیتا ہے وہ اس کی ملک سے نکل کر کرایہ کے سامان کے مالک کی ملک میں داخل ہوجاتی ہے اور اس پیشگی کرایہ کی رقم پر اس کی ملک تام ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ موجر یعنی کرایہ پر سامان دینے والے پر ہوگی۔

۲۔ جو پیسہ کرایہ دار بطور ڈپازٹ یعنی زرِ ضمانت ادا کرتا ہے وہ کرایہ دار ہی کی ملک ہوتا ہے، اس لیے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہی ہوگی۔ فقہ حنفی کی کتابوں میں بیع وفاء کی جو صورت معروف ہے اس میں علامہ شامیؒ نے مشتری یعنی پیسہ دینے والے پر وجوب کو ترجیح دی ہے۔[2] اور بیع وفاء میں خریدار کی طرف سے دی گئی رقم کی حیثیت ڈپازٹ جیسی ہوتی ہے۔

البتہ اس زکوٰۃ کی ادائیگی معاملے کے ختم ہونے سے پہلے کرایہ دار پر لازم نہیں ہوگی، اس لیے کہ اس سے پہلے پہلے اس کی حیثیت قرض کے مال کی ہے، جس میں زکوٰۃ اگرچہ گزشتہ سالوں کی ادا کرنی پڑتی ہے مگر قبضہ میں آنے کے بعد، اس سے پہلے نہیں۔

مدارس و اداروں کی املاک پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کی شرطوں سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کا وجوب شخصی املاک میں ہوتا ہے خواہ یہ ملک

---

[1] شامی ۳/۱۰ [2] شامی ۴/۱۰۔

انفراداً ہو یا اجتماعاً، قومی و ملی املاک محل زکوٰۃ نہیں ہیں، اس لیے بیت المال میں جمع شدہ اموال میں زکوٰۃ نہیں ہے اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مال وقف میں زکوٰۃ نہیں ہے[۱]۔

جمع شدہ مال حرام پر زکوٰۃ

مال حرام پر اس شخص کی ملکیت ثابت نہیں ہوتی جس کے قبضے میں وہ جمع ہو رہا ہے یا جو کسی طرح سے اس کو حاصل کر رہا ہے، جہاں تک سوال ہے خلط کا تو آج کل نوٹ ہی رشوت و سود میں آتے ہیں، ان کی جو حیثیت ہے اس میں خلط کو مؤثر نہ ہونا چاہیے، اور اگر مؤثر بھی ہو تو بھی زکوٰۃ تو پاکیزہ کمائی والے مصد میں ہوگی نہ کہ حرام میں جیسا کہ فقہاء کی تصریحات و تفصیلات سے ظاہر ہے۔

دین کی زکوٰۃ کس پر ہوگی؟

۱۔۔۔۔۔ دین کی زکوٰۃ دائن پر ہی ہوگی، اس لیے کہ دین کا مال اسی کی ملک ہوتا ہے۔ البتہ جب تک دائن کا قبضہ نہ ہو تب تک مطالبہ نہیں ہوگا اور قبضہ کے بعد مطالبہ میں تفصیل ہے اس لیے کہ دین کے مختلف صورتیں و اسباب ہوتے ہیں۔

۲۔۔۔۔۔ دین کی زکوٰۃ کسی بھی صورت میں مدیون سے لیے جانے کا سوال ہی نہیں ہے، اگرچہ مدیون اس سے کتنا ہی نفع اٹھائے۔ اس لیے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک ایک بنیادی شرط ہے اور دائن کا مالک صرف دائن ہوتا ہے، مدیون اس پر قبضہ اور اس میں تصرف کے باوجود بھی اس کا ایسا معنی مالک نہیں ہوتا کہ اس کی وجہ سے اس پر شرعی مطالبات عائد ہوں۔

۳۔۔۔۔۔ دین کی وصولیابی و ناامیدی کے مسائل کے سلسلہ میں تفصیل یہ ہے کہ:

الف:۔۔۔۔۔ چونکہ ملک کے ساتھ "تام و مطلق" کی قید لگی ہے، اس لیے اصولی طور پر اسی دین کی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کی وصولیابی اور جس میں تصرف پر آدمی قادر ہو۔

ب:۔۔۔۔۔ نیز دین پر زکوٰۃ کی بابت یہ بھی ایک اصولی بات ہے کہ کسی بھی قسم کے دین کی وصولیابی سے پہلے

۱۔ ہدایہ ۲/۹، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۴۳، ۷۴۴، ۷۰۵/۷۱۹۔

اس کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوتا، اگرچہ یہ وصولیابی جزئی ہو اور اسی جزئی وصولیابی پر اس وصول شدہ جزء کی زکوٰۃ لازم قرار دی جائے۔

ج۔۔۔ اگر کسی دائن کے پاس اس کے دین کے علاوہ کوئی مال موجب زکوٰۃ موجود ہے جس پر سال گزر چکا ہے تو جو بھی دین آدمی کو حصول ہو موجود کے ساتھ ملا کر اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، خواہ دین جس قسم کا ہو۔

د۔۔۔ اور اگر قرض دائن کی رقم کے علاوہ کوئی مال نصاب موجب زکوٰۃ دائن کے پاس موجود نہیں ہے تو۔

۱۔۔۔ جو قرض و دین اس کا تجارتی ہو یا نقد لیا دیا گیا ہو اگر وہ بقدر نصاب ہے اور اس پر سال گزر چکا ہے، پھر اس کے بعد اس کی وصولیابی ہو رہی ہے تو جو ملتا جائے اس کے حساب سے زکوٰۃ نکالتا جائے، اس کے لیے نہ وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی ضرورت ہے اور نہ بقدر نصاب وصولیابی کی، اور نہ ہی کسی مقدار خاص کی[1]

۲۔۔۔ جو غیر تجارتی دین ہے مثلاً اپنی ضرورت کا کوئی سامان بیچ دیا تھا تو اگر بقدر نصاب اور سال گزرا ہوا ہے تو جب پورے نصاب کی وصولیابی ہوگی تب ہی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، البتہ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کی شرط نہیں ہے۔

۳۔۔۔ اور بعض صورتوں میں وصولیابی کے بعد سال گزرنے کی بھی شرط ہے، اس کا مطلب یہ ہوا، عام طور سے جو لوگوں کا دوسروں پر قرض ہوتا ہے اور وہ تجارتی ثمن دین کا یا ضروریات کے لیے نقد کے ثمن دین کا ہوتا ہے، اس میں وصولیابی پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔۔۔ البتہ دین کی تیسری قسم جس میں مہر کو بھی شمار کیا گیا ہے اس میں وصولیابی کے بعد سال کا گزرنا بھی ضروری ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

اس فنڈ کی جو نوعیت ہے کہ وصولیابی سے پہلے آدمی کو اس میں تصرف کا حق نہیں ہوتا، ہاں بطور قرض لے سکتا ہے، مگر پھر واپس کرنا پڑتا ہے اس لیے اس کی حیثیت ایک قسم کے دین کی ہے۔

---

[1] احسن الفتاویٰ ۴/۲۶۳۔

لہٰذا وصولیابی سے پہلے اس پر کسی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اور وصول یابی کے بعد اگر آدمی کے پاس دوسرا نقد موجود ہے تو اس کے ساتھ جوڑ کر بغیر ولان حول اور نصاب کی قید کے بغیر اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور اگر اس کے علاوہ کوئی مال نہیں تھا تو جب بقدر نصاب ہو اور سال گزر جائے تب زکوٰۃ ہوگی۔ اس لیے کہ فقہاء حنفیہ کے اصول کے مطابق یہ فنڈ دین کی تیسری قسم میں شامل ہے پھر یہ کہ ملک کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی اور وراثت پر قبضہ کے بغیر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ــــــ تو یہ فنڈ آدمی کا حق تو ہے اس لیے کہ معاملہ میں طے کیا گیا ہے مگر جب تک قبضہ میں نہ آئے یعنی وصول نہ ہو اس کی ملک نہیں قرار پائے گا۔[1]

شرط نما

وجوب زکوٰۃ کے لیے وہ مال جس میں زکوٰۃ واجب ہو رہی ہو اس کا نامی ہونا ایک بنیادی شرط ہے۔ الفقہ الاسلامی میں ہے:

"لان معنى الزكاة وهو النماء ـ لا يحصل الا بالمال النامي"[2]

یہ شرط اس لیے ہے کہ لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنی "زیادتی" کا حصول ایسے ہی مال کے ذریعہ ہو سکتا ہے جو کہ بڑھنے والا ہو۔

البتہ اس شرط کے اعتبار کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ واقعۃً وعملاً بڑھ رہا ہو بلکہ یہ بھی کافی ہے کہ بڑھنے کے حال میں ہو اس لیے کہ قدرت نے اس کو ایسا ہی بنایا ہے، جیسے کہ سونا و چاندی اور آج کل روپیہ وغیرہ جو کہ سونے و چاندی کی جیسی حیثیت رکھتا ہے یا یہ کہ آدمی کی غرض اس مال کو اپنے پاس رکھنے سے یہی ہے جیسے مال تجارت خواہ وہ سال بھر کے عرصہ میں فروخت ہوا ہو اور کچھ بڑھا ہو یا یہ کہ اب بھی دوکان میں موجود ہو یا اس میں آدمی کو گھاٹا ہوا ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بڑھنے کا تعلق خود اس شئی سے ہو جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، نہ کہ اس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے، یہ بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ آج کل بعض حضرات نے

---

[1] راجع لذالك احسن الفتاوىٰ ۴/۲۹۰، وامداد الفتاوىٰ ۲/۴۹/۵۰، جواهر الفقه وغيره

[2] الفقه الاسلامي ۲/۷۴۰۔

کرایہ کا ذریعہ بنائی جانے والی املاک کو مالِ نامی تسلیم کیا ہے اور ان کی حیثیت دیگر اموالِ نامیہ کی قرار دی ہے حالانکہ عام طور سے فقہاء اس کی نفی کرتے رہے ہیں، یہ کرتے ہیں: امام احمد نے کرایہ کا ذریعہ بنائے جانے والے زیور پر زکوٰۃ واجب قرار دی ہے تو اس کے سونا اور چاندی ہونے کی وجہ سے اور زینتی استعمال میں نہ ہونے کی وجہ سے، پھر یہ کہ فقہاء نے مخصوص اشیاء کے علاوہ بعض اموالِ تجارت میں زکوٰۃ کو ذکر کیا ہے اور اسباب نمائی تجارت کے ساتھ توالد و تناسل کو ذکر کیا ہے، کرایہ کا تذکرہ تو بظاہر کہیں ملتا نہیں ہے۔

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ

یہ صحیح ہے کہ شریعت اسراف و تنعم پسندیدہ نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ کسی نص میں یہ بات نہیں آئی ہے اور نہ فقہاء کی تعریف میں کہ آدمی کے کھانے پینے کا اور پہننے اوڑھنے کا ایک معیار متعین ہے وہی حاجت ہے اور ماسوا اس سے زائد ہے بلکہ تفصیلات سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مال زکوٰۃ میں ایجابِ زکوٰۃ کے لیے دوسری شرطوں کے ساتھ یہ مطلوب ہے کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، رہنے و سہنے کی ضروریات میں سال بھر خرچ کرنے کے بعد آدمی کے پاس بقدر نصاب مال موجود ہو، خواہ وہ معمولی حالات میں بھی اور تنعم میں بھی، یا یہ کہ سال بھر کی ضروریات میں صرف کیے جانے والے مال سے الگ نصاب اس کے پاس موجود ہو۔

مثلاً ایک آدمی کے پاس بکر و عمر کو بقدر نصاب مالِ زکوٰۃ موجود ہے اور جب سال ختم ہوا تو سال بھر اس مال کی آمدنی و نفع یا اصل کو خرچ کرنے کے بعد بقدر نصاب مال اس کے پاس موجود ہے یا بکر و عمر کو اس کے پاس دو نصاب موجود ہیں۔ ایک اس نے رکھا ہے سال بھر کی ضروریات میں صرف کرنے کے لیے اور ایک زائد ہے تو دونوں صورتوں میں اس کے پاس ضرورت سے فاضل و فارغ

لہ نقد زکاۃ میں نمو کی شرط پر گفتگو کرتے ہوئے ج ۱ ص ۱۳۰ پر سطر ۹ میں مال عتیق کی تعریف میں شامی نے بحر الرائق سے نقل کیا ہے: العتیق الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات و نحوھا۔ اس عبارت میں کرایہ کا خصوصیت سے لفظ درمیان میں آیا ہے اور نہ تحریر میں اور نہ بظاہر یہ لفظ احناف کی دوسری کتابوں میں ملتا ہے، اللہ بہتر جانتے ہیں کہ یہ کہاں سے آگیا؟

نصاب موجود ہے۔

نیز شریعت ایجاب زکوٰۃ کے لیے صرف یہ دیکھتی ہے کہ آدمی کے پاس شروع سال وآخر میں بقدر نصاب مال زکوٰۃ موجود ہے، اس نے اس درمیان کتنا کمایا اور کہاں کہاں ؟ کیا و کیسے صرف کیا اس سے بحث نہیں ہوتی البتہ دوسری صورت جو ذکر کی گئی ہے اس میں ضروریات کے لیے محفوظ کیے جانے والے سرمایہ میں آدمی کا جو واقعی معیار ہو اسے اس کی رعایت کرنی ہوگی۔

اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کے کھانے اور پینے کا معیار الگ الگ ہوتا ہے جب شریعت نے اس میں پابند نہیں بنایا ہے تو کسی زمانہ و ماحول کی بھی پابندی نہیں ہوگی، کتب فقہ کی تصریحات سے ایسا ہی سمجھ میں آتا ہے۔

دین اور زکوٰۃ

اگر آدمی مالدار ہونے کے ساتھ مدیون ہو تو زکوٰۃ کا کیا حکم ہے تفصیل گزر چکی ہے، اور فقہاء کی تصریحات سے کوئی فرق اس اعتبار سے سمجھ میں نہیں آتا کہ قرض طویل المدت ہو تو سالانہ قسط کا شمار کر کے باقی پر زکوٰۃ ہو بلکہ دین کی پوری رقم سے زکوٰۃ ساقط ہوگی اگرچہ معاہدہ کے مطابق دسیوں سال بعد پورے قرض کی ادائیگی کی نوبت آئے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

ایجاب زکوٰۃ کے لیے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا بقدر نصاب ہونا ضروری ہے۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے وغیرہ جب تجارت کے لیے نہ ہوں تو بالاتفاق زکوٰۃ نہیں[1] اس لیے کہ یہ سونے وچاندی کی طرح طبعاً اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں، لہٰذا ان میں نما کے تحقق کے لیے ان کی تجارت ضروری ہے،

---

[1] شامی ۲/ ۱۲ ، الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/ ۵۹۵۔

ان کے شیئرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

دوسرا رجحان بعض علماء عصر کا یہ ہے کہ شیئرز پر زکوٰۃ بغیر کسی تفصیل کے ہے، اس لیے کہ اس وقت کے عرف میں "شیئرز" خود ایک سامان تجارت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اسی حیثیت سے ان کی خرید و فروخت ہوتی ہے، لوگ خرید و فروخت میں ان کی مجموعی حیثیت کو دیکھتے ہیں اور تفصیلات کے درپے نہیں ہوتے ـــــ اور واقعہ یہ ہے کہ اس وقت عرف نے خود شیئر کو ایک مال و سامان کی حیثیت عطا کردی ہے، اس لیے اس رجحان کو قبول کیا جا سکتا ہے، جب کہ اس کے مطابق زکوٰۃ کی ادائیگی میں سہولت بھی ہے اگرچہ تجارتی کمپنیاں کس قدر آلات و اسباب میں اور کس قدر سامان تجارت میں لگاتی ہیں، اس کے جاننے میں بھی اس لیے زحمت نہیں ہے کہ کمپنیاں پوری تفصیل شائع کرتی رہتی ہیں، اور شیئرز کے مالکان کو پوری تفصیل سے باخبر رکھتی ہیں اس لیے آدمی آسانی کے ساتھ تفصیل سے واقف ہو کر شیئرز کی زکوٰۃ دے سکتا ہے لیکن زیادہ آسان یہی معلوم ہوتا ہے کہ شیئرز کی پوری رقم پر اجمالاً اور مجموعی طور پر زکوٰۃ نکالی جائے۔

باؤنڈس کی زکوٰۃ

باؤنڈ میں لگائی گئی رقم قرض ہوتی ہے اور فقہاء حنفیہ کی تفصیل کے مطابق یہ دین، دین قوی ہوگا، اس لیے وصولیابی پر بشرط نصاب گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی، لیکن اس میں لگائے گئے اصل سرمایہ کی اس پر جو مزید رقم آدمی کو ملتی ہے وہ سود ہے اس پر زکوٰۃ نہیں ہوگی[1]

سونے و چاندی میں سے اصل نصاب

زکوٰۃ سے متعلق نصوص اور عام فقہاء کی تصریحات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جیسے سونا و چاندی میں سے ہر ایک خلقۃً، طبعاً، اور استعمالاً ثمن ہے اسی طرح نصاب زکوٰۃ میں بھی دونوں

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فقہ الزکوٰۃ ۱/۵۲۳-۵۲۶ [2] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۶۳۔

میں سے ہر ایک کا نصاب مستقل ہے، جیسے جانوروں کا نصاب مستقل ہے دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر متفرع نہیں ہے، دیت کی بابت بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اصل اونٹ تھا، لہذا اس کی قیمت کو معیار بنا کر کمی و بیشی کی گئی[1] مگر سونے و چاندی کے نصاب کے متعلق احقر کا خیال ہے کہ کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے بلکہ صورت حال یہ ہے کہ چاندی کے نصاب سے متعلق نصوص زیادہ ہیں۔ اور وہ قوت میں بھی فائق ہیں، اسی لیے چاندی کا نصاب اتفاقی ہے اور سونے کے نصاب کی بابت کچھ اختلاف رہا ہے بلکہ مشہور تابعی حضرت عطاء کا بیان تو یہ ہے کہ اس عہد میں چاندی ہی زیادہ لگی تھی یعنی دراہم نہ کہ دینار[2]۔

بہرحال واقعہ یہ ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک مستقل ہے لہذا جہاں جس کے نصاب میں فقراء کا فائدہ ہو یعنی آدمی صاحب نصاب قرار پائے وہیں اس نصاب کا اعتبار ہوگا، اگرچہ دونوں کے نصابوں کی قیمتوں میں تفاوت فاحش پایا جاتا ہو، جیسا کہ آج کل عام طور سے ہے اور چوں کہ چاندی کے نصاب کی مالیت ہر عہد میں کم رہی ہے (ابتدائی عہود کو چھوڑ کر) اس لیے علماء کا عام رجحان چاندی کے نصاب اور اس کی قیمت کے اعتبار کا رہا ہے، اور ہے۔ اور اس باب میں "انفع للفقراء" کے اعتبار کا قاعدہ کتب فقہ میں اور فقہاء کے یہاں عام ہے[3]۔

مصارفِ زکوٰۃ

طلباء کو ماہانہ وظیفہ

س ـــــ سوال میں مذکور نظام کے مطابق طلبہ کو ماہانہ رقم بطور وظیفہ دینا اور پھر ان کے واجبی مصارف میں صرف کے لیے اس رقم کا مدرسہ میں ان سے جمع کرانا۔ بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا بلکہ زکوٰۃ کی رقم کو صحیح طور پر صرف کرنے کی اس سے بہتر بے داغ کوئی شکل سمجھ میں نہیں آتی، آج کل

---

[1] ملاحظہ ہو: مشکوٰۃ، باب الدیات الفصل الثانی ۲/۳۰۳، متعدد روایات ہیں جو کہ صراحۃً یا دلالۃً اس مفہوم کو بتاتی ہیں [2] فقہ الزکوٰۃ ۱/۲۶۰ ج ۳ ۱۵۰ [3] الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۷۷۱، شامی ۲/۳۱ تا ۳۲۔

دنیوی تعلیم میں رہائش و تعلیم کا خرچ عام ہے، دینی تعلیم میں بھی بہت سے لوگ ان امور پر خرچ کرتے ہیں یا اس کا مزاج رکھتے ہیں، اس لیے مستطیع طلباء سے رہائش و تعلیم کے مصارف لیے جاسکتے ہیں نیز ان سے جو مصارف لیے جاتے ہیں ان کی استطاعت کے مطابق ان میں کمی بھی کی جاسکتی ہے، مثلاً یہ کہ وہ صرف طعام کے مصارف تو اپنے پاس سے دیں اور باقی مصارف مدرسہ سے لے کر جمع کریں۔

اہل مدرسہ کس کے وکیل

سوال ـــــ عملاً اور واقعۃً تو اہل مدارس کے لیے نہ زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے توکیل پائی جاتی ہے اور نہ مستحقین کی طرف سے، ہاں کبھی کبھی دینے والے ایسی باتیں مثلاً تم آپ کو دیرہے ہیں مصرف میں صرف کے آپ ذمہ دار ہیں، کہہ دیا کرتے ہیں اس لیے یہ توکیل انتظاماً اور کام چلانے کے لیے ہے، بعض اکابر دیوبند کی تحریرات میں طلباء کی طرف سے توکیل کی بات ملتی ہے، مفتی شفیع صاحب نے بھی اخیر میں اس کی طرف رجوع کرلیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی اہل مدرسہ کی طرف سے طلباء کے ہر قسم کے مصارف میں براہ راست زکوٰۃ کی رقم کا لگانا محل تامل ہے مثلاً رہائشی ضرورتوں میں جب کہ وہ رہ کر چلے جائیں گے اور یوں وہ ملک تو بنیں گے نہیں۔ بیت المال کے نظام میں بظاہر اس انداز کی کسی شکل میں زکوٰۃ کے مال کا صرف کرنا معلوم نہیں ہوتا، کم از کم مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری کی تحریر کے مطابق دینے والوں کے بعد عدم واپسی اور جمع شدہ مال میں عدم وجوب زکوٰۃ کی حد تک تو یہ بات قبول کرہی لینی چاہیے۔ اس طرح جب تک مال زکوٰۃ صرف نہ ہو تب تک عدم ادائے گی زکوٰۃ کی مالیت بھی یعنی یہ کہ ذمہ داران وکیل طلباء ہونے کی وجہ سے ان کی طرف سے قابض ہوئے، لہذا دینے والوں کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور نہ ان کا کوئی حق باقی رہا اور نہ ہی ذمہ داری ـــــ باقی اس قبضہ کو مکمل طور پر طلباء کا قبضہ مان لینے اور پھر ہر قسم کے مصارف میں صرف کرنے میں ضرورت غور و تحقیق کی ہے، جن حضرات کی تحریرات سے سند پکڑی جاتی ہے، ان کی نیز دوسرے عام ارباب افتاء کی تصریحات تو یہی ہیں کہ اہل مدرسہ کو مال زکوٰۃ طلباء کے ہاتھ میں ہی ان کی ضروریات کی صورت میں دینا چاہیے، مثلاً کھانا و کپڑا وغیرہ اور ادارے کی دوسری ضروریات میں ان کے واسطے سے بطور تملیک رقم کو خرچ کرنا چاہیے۔

بہرحال یہ اہل مدارس کی ضروریات کے لیے غیر مفید و لغو حیلے کے بجائے ایک مفید و مناسب

توجیہ ہے، کچھ لوگ اس پر عمل بھی کر رہے ہیں، مگر ضرورت تنقیح و تحقیق کی ہے۔

عاملین زکوٰۃ اور ان کا معاوضہ

حق بہ (الف) ـــــ عاملین زکوٰۃ حکومت مسلمہ کے کارندے ہوتے ہیں، اور اس واسطے سے وہ فقراء کے وکیل ہوتے ہیں، اہل مدارس کو بھی اگر فقراء کا وکیل مان لیا جائے تو سفراء و محصلین چندہ ان کے کارندے ہوں گے، اور ان کو ان کے عمل کے عوض زکوٰۃ کا دینا درست ہوگا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی نے متعدد فتاویٰ میں اور قوت کے ساتھ سفراء کو مال زکوٰۃ میں سے ان کے عمل کا معاوضہ دینے کو ذکر کیا ہے۔ لیکن صرف اسی حد تک انہوں نے گنجائش دی ہے مزید صرف میں دیگر ارباب افتاء کی طرح انکار یا تملیک وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے[۱]

(ب) ـــــ یہ معاوضہ متعین مشاہرہ ہونا چاہیے، کمیشن درست نہیں ہے، حدیث قفیز طحان کی صحت و قوت کی وجہ سے اور ان عقلی وجوہ کی بناء پر جو فقہاء نے قفیز طحان کی حدیث کے سلسلہ میں کمیشن پر چندہ سے متعلق احقر کے مبسوط مقالے کا مطالعہ کیا جائے۔

(ج) ـــــ مشاہرہ یا فیصد کی بنیاد پر معاوضہ (اگر اس کی کوئی جائز شکل ممکن ہو) اس کی شرعاً تحدید یہ ہے وہ بے کام کرانے والے کی ضرورت اور کفایت کی رعایت، اور اس بنیاد پر اس کو اس کے مال و معیار کے مطابق متوسط معاوضہ دیا جائے جس میں نہ تو انتہائی تنگی سے کام لیا جائے کہ معاملہ تقتیر کی حد میں داخل ہو جائے اور نہ اتنی سخاوت سے کہ معاوضہ تبذیر کی حدود کو بھی تجاوز کرنے لگے۔ فقہاء و محققین نے عامل زکوٰۃ کے حق میں اس کی وضاحت کے ساتھ تصریح کی ہے[۲] بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ جو شخص متوسط معاوضہ لے کر کام کرنے پر تیار ہو اسی سے کام لیا جائے[۳]

---

[۱] کفایت المفتی ۴/ ۲۶۱، ۲۹۹ [۲] معارف القرآن ۴/ ۳۹۹ بحوالہ احکام القرآن للجصاص والقرطبی۔ امام طبری نے اپنی تفسیر میں حضرت عمرؓ وغیرہ سے اسی کو نقل کیا ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے، تفسیر طبری ۱۰/ ۱۱۱، الفقہ الاسلامی ۲/ ص ۸۷۸۔ البتہ احناف کے یہاں یہ قید ہے کہ اگر عامل کی ضروریات نصف سے زائد کی متقاضی ہوں تو نصف سے زائد نہیں دیں گے۔ شامی ۲/ ۵۹، ۶۰۔ [۳] شامی ۲/ ۶۰۔

(د) ـــ جو لوگ سفراء کو عاملین زکوٰۃ کے تحت داخل مانتے ہیں ان کے قول پر زکوٰۃ کی آمد و خرچ کا حساب کرنے والوں کو صرف اس کام کا معاوضہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جا سکتا ہے، مثلاً مفتی کفایت اللہ صاحب کے فتویٰ کی روشنی میں، نیز اہل مدرسہ کو طلباء کا وکیل قرار دینے پر بھی درست ہے۔

(ہ) ـــ اور احتیاط اس میں ہے کہ جب چندہ کرنے والوں اور حساب لکھنے والوں کا کام زکوٰۃ کے علاوہ دوسری مدوں کی رقوم سے متعلق بھی ہوتا ہے اور یوں بھی عاملین زکوٰۃ میں واقعتہً جو بات پائی جاتی ہے وہ یہاں نہیں پائی جاتی ـــ زکوٰۃ کی رقم سے براہ راست ایسا کوئی کام کرنے والوں کو ان کے کام کا معاوضہ نہ دیا جائے۔

خلاصۂ زکوٰۃ

ملک تام سے کیا مراد ہے: اپنے مملوکہ مال میں حسب مرضی تصرف پر قادر ہونا۔

پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ خریدار پر نہیں ہوگی، بلکہ فروخت کنندہ پر۔

غیر موصول مال تجارت

کی زکوٰۃ ملک تام نہ ہونے کی بناء پر خریدار پر نہیں ہوگی۔ اور بیع کردہ قبضہ کے بغیر تصرف میں آزاد ہو۔

پیشگی کرایہ کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان و سامان پر ہوگی۔

ڈپازٹ کی رقم کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی مگر رقم کے واپس ہونے کے بعد۔

مدارس وغیرہ کی املاک پر زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

مال حرام پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

دین کی زکوٰۃ

صرف دائن پر ہوگی اور دین کی واپسی کے بعد اگر اس کے علاوہ اس کے پاس نصاب ہے تو اس کے ساتھ ملا کر اور اگر دین ہی نصاب ہے تو عام قرض و تجارتی دین میں جو وصول ہو اس پر گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ہوگی ——— اور بعض صورتوں میں تفصیل ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ کا حکم زکوٰۃ میں قرض کا ہے اور اس قسم میں شامل ہے جس میں زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گذرنے پر ہوتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا مال موجب زکوٰۃ موجود نہ ہو۔

شرط نما وجوب زکوٰۃ کے لیے نما یعنی مال کی بڑھوتری ایک بنیادی شرط ہے خواہ وہ بڑھوتری اس لیے مانی جائے کہ مالک نے مال کے ساتھ ایسی صورت و نیت اختیار کر رکھی ہے، مثلاً تجارت یا یہ کہ وہ طبعی طور پر ایسی ہو کہ تجارت و معاملات کی روح ہو، جیسے سونا و چاندی وغیرہ۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ کا مطلب ہے آدمی کی سال بھر کی کھانے پینے و پہننے، اوڑھنے، رہنے سہنے کی واقعی ضروریات میں جو کچھ صرف ہو جائے یا اعتدال کے ساتھ جو کچھ صرف کرنے کے لیے طے کیا جائے اس میں اشخاص و ازمان کا اختلاف ہو سکتا ہے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

شرکا پر ہوگی، جب کہ ہر ایک کی ملک بقدر نصاب ہو یا ان پر جن کی ملک بقدر نصاب ہو

ہیرے اور جواہرات اور ان جیسی چیزوں پر جب استعمال ہوں تو نما کی شرط کے

فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں ہے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ جو بھی مال تجارت ہو خواہ زمین و مکان بشرط نصاب اس پر زکوٰۃ۔ ورثاء لے گی کے دن کی مالیت اور قیمت کے حساب سے۔

شیئرز پر زکوٰۃ شیئرز کی مالیت پر زکوٰۃ ہے مگر اس جعفر پر جو تجارت میں معروف ہو اور آج کے عرف میں یہ خود مال تجارت ہیں اس لیے اجمالی و مجموعی رقم پر بھی زکوٰۃ ہو سکتی ہے۔

باونڈس پر زکوٰۃ

اصل رقم پر ہوگی اور مال قرض پر زکوٰۃ کے ضابطے کے تحت، اس لیے کہ یہ رقم قرض ہوتی ہے

سونے و چاندی میں اصل نصاب سونے و چاندی میں سے ہر ایک نصاب کے باب میں مستقل ہے اور شارع نے دونوں کی استقلالاً تعیین کی ہے ایک کی دوسرے پر بنا کرتے ہوئے نہیں۔

طلباء کو ماہانہ وظیفہ

کی شکل میں زکوٰۃ ان کے جملہ مصارف کو نوز کر دی جا سکتی ہے۔

اہل مدرسہ کی وکالت

یوں تو سرمایہ داروں کی طرف سے مانی جاتی ہے مگر اکابر کی ایک جماعت طلباء کا وکیل مانتی ہے۔

عاملین زکوٰۃ (سفراء مدارس)

الف:- کو مفتی کفایت اللہ صاحب زکوٰۃ سے تنخواہ و معاوضہ دینا جائز کہتے ہیں اگر اہل مدارس کو فقراء و طلباء کا وکیل مان لیں تو دوسرے حضرات کے نزدیک درست ہے۔ ب:- لیکن معاوضہ متعین ہونا چاہیے۔ ج:- معاوضہ کی تعیین میں کام کرنے والوں کی ضرورت کا اور محنت کا لحاظ کیا جائے (د) گنجائش دینے والوں کے قول پر زکوٰۃ کا حساب کرنے والوں کو بھی زکوٰۃ سے تنخواہ دی جا سکتی ہے۔

سوالنامہ کا اجمالی جواب

از مولانا برہان الدین سنبھلی، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

۱۔۔۔۔ محور اول

جیسا کہ صورت ہے اموال نامیہ میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

ملک تام: جس پر آدمی کو مالکانہ (مثلاً بیع، ہبہ وغیرہ) کا شرعاً تصرف کا پورا اختیار ہو اور اس میں وہ کسی دوسرے کی اجازت کا محتاج نہ ہو، اگر اس کے قبضہ میں مال بالفعل نہیں ہے مگر اس پر قبضہ پہلے ہو چکا ہو۔

ذیلی سوالات کا جواب

جس مال (مبیع) کی قیمت ادا کر دی گئی ہو اور وہ مال (مبیع) قبضہ میں نہیں آیا ہو، اگر عقد تام ہونے کے بعد قیمت ادا کی گئی ہے تو اس مال (مبیع) کی چاہے ابھی قبضہ میں نہ آیا ہو، زکوٰۃ مشتری پر لازم ہوگی (اگر وہ مال تجارت ہے) البتہ قیمت کی زکوٰۃ اب مشتری پر لازم نہ ہوگی کیونکہ وہ قیمت مشتری کی ملکیت سے نکل گئی البتہ اس قیمت کی زکوٰۃ بائع پر جو کہ اب اس قیمت کا مالک بن چکا ہے، لازم ہوگی، (اگر وہ صاحب نصاب ہے اور حولان حول ہو چکا ہے)۔

۲۔۔۔ اگر کرایہ دار کی طرف سے مالک مکان (یا دکان وغیرہ) کو دی گئی رقم بطور اجرت (کرایہ) دی گئی ہے تو اس رقم کی زکوٰۃ (اسباب و شرائط وجوب پائے جانے کی صورت میں) مالک مکان (یا دکان) پر لازم ہوگی لیکن اگر یہ رقم کرایہ دار نے بطور ضمانت دی ہے تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہوگی (اسباب و شرائط وجوب کی موجودگی میں) کیونکہ اس رقم کی حیثیت قرض کی ہے (اگر تصرف کا اختیار دیا

ہے) یا امانت کی، دونوں صورتوں میں اس کی زکوٰۃ رقم دینے والے پر لازم ہوگی۔

۳ـــــ جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو کی شکل میں مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کی حیثیت کا محل نظر ہے۔ علاوہ ازیں شریعت میں اس کی نظیر ملنا ہی مشکل ہے (سوائے بیع بخیار الخیار کی شکل کے، وہ بھی مختلف فیہ ہے) کہ ایسا مال بھی ہو سکتا ہے جس کا کوئی مالک متعین نہ ہو، لہٰذا یہ سوال ہی خود محل سوال ہے۔ (ہاں یہ ممکن ہے کہ مالک معلوم نہ ہو) - مدارس میں جمع کی جانے والی رقم پر اہل مدارس کے ذمہ داروں کی ملکیت کا قائم ہونا (طلبہ مستحق زکوٰۃ کی نیابت میں) اکابر علماء کا راجح قول ہے جسے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اختیار کیا ہے، علاوہ حضرت تھانوی کا بعد میں حق ہونا بھی بتایا ہے، حضرت گنگوہی اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کا متفق قول ہونا تو معروف ہی ہے[1] لہٰذا اس رقم کی ـــــ جو کہ مدارس کے ذمہ داروں کے قبضہ کے اندر طلبہ مستحق زکوٰۃ کی ملکیت میں ہے ـــــ زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہ ہوگی۔

۴ـــــ مال حرام و حلال کے مخلوط ہو جانے کی شکل میں بھی ـــــ چونکہ بقدر حرام کا تصدق واجب ہے اور اس کے بقدر گویا دین واجب الاداء ہے ـــــ صرف حلال مال کی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور کل حرام مال کے بقدر تصدق واجب ہوگا (جیسا کہ شامی کی مصادرۃ السلطان وغیرہ والی بحث سے مستفاد ہوتا ہے)۔

۵ـــــ دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی (جیسا کہ ظاہر ہے) اگر مدیون ادائے دین میں وسعت کے باوجود ٹال مٹول کرتا ہو تو گناہ گار ہوگا، مگر زکوٰۃ کی ادائیگی اس کے ذمہ نہ ہوگی۔ ہاں! اگر اس نے دین سے تجارت کے ذریعہ نفع حاصل کیا تو نفع کے بقدر مال کی زکوٰۃ (اسباب و شرائط کے ساتھ) مدیون پر واجب ہوگا۔ (جیسا کہ مال مستفاد کی)۔

دائن دین کی وصولیابی کی امید کی صورت میں ہر سال کی زکوٰۃ چاہے ہر سال ادا کرے یا بعد وصولیابی پر تمام گذشتہ سالوں کی، دونوں شکلیں جائز ہیں، لیکن اگر مال وصول ہونے کی امید بالکل نہ ہو اور مال ضمار کے مثل ہو، تو اس کا حکم مال ضمار جیسا ہوگا۔

---

(۱) دیکھو: جواہر الفقہ ج [illegible] طبع دیوبند

ت ــــ ریٹائرمنٹ کے بعد پراویڈنٹ فنڈ کے وصول ہوجانے کی صورت میں ہی اس پر ملکیت آئے گی اس سے قبل نہیں، لہٰذا اس سے متعلق تمام مالی ذمہ داریاں ــــ وجوب زکوٰۃ وغیرہ ــــ بعد میں ہی متحقق ہوں گی، اس سے پہلے نہیں، اس لیے زکوٰۃ بھی وصولیابی کے بعد ہی واجب ہوگی، گذشتہ مدت کی واجب نہ ہوگی۔

دوسری شرط نما یعنی اضافہ کی صلاحیت

اس کی دو قسمیں ہیں۔ حقیقی و حکمی۔ حقیقی کی مثال مالِ تجارت، سوائم وغیرہ۔
حکمی کی مثال نقدین یا اس کے قائم مقام کرنسی (خواہ وہ کاغذ کی ہو یا دھات کی)۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت کا مفہوم تو معروف ہے اور تمام متعلق کتابوں میں موجود ہے۔ کتب فقہ کے مطالعہ سے یہ بھی مستفاد ہوتا ہے کہ ہر دور اور ہر احول کے اعتبار سے ان چیزوں کا تعین ہوگا، جن پر "حاجیات" کا اطلاق ہو سکتا ہے اور کتب فقہ کی تفصیلات پیش نظر رکھنے سے حیثیت کے فرق سے بھی حاجیات کے مصداق میں فرق ہونا مفہوم ہوتا ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ اس کا جواب عام کتب فقہ میں ملتا ہی ہے، سوالنامہ میں کوئی نئی بات نہیں دریافت کی گئی ہے اس لیے اس سوال کا جواب دینا ضروری نہیں معلوم ہوا ــــ دین کی معروف تین قسموں ــــ قوی، متوسط، ضعیف ــــ میں سے پہلی دو قسمیں متفقہ طور پر مانع زکوٰۃ ہیں۔
ہر دین قوی مانع زکوٰۃ ہے خواہ وہ طویل المیعاد ہو یا قصیر المیعاد، خواہ قلیل مقدار میں ہو یا کثیر میں، اس لیے پورا قرض منہا کرنے کے بعد ــــ خواہ وہ لاکھوں میں ہو اور اس کی ادائے گی طویل مدت میں کیا جانا طے ہو ــــ اگر بقدر نصاب کا مالک رہتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

کمپنیز میں زکوٰۃ: کمپنی میں شریک ہر فرد کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا، جس شریک کا حصہ یا اس کی

ملکیت میں کل مال) نصاب زکوٰۃ کے بقدر رہوگا اس پر زکوٰۃ ۔ اپنے حصہ کے بقدر ۔ واجب ہوگی اور جس کا حصہ (اور ملکیت میں کل مال) نصاب سے کم ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

ہیرے جواہرات

اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ ان کی مالیت کتنی ہی ہو اور خواہ وہ انکم ٹکس (یا زکوٰۃ) سے بچنے کی غرض سے ہی خریدے گئے ہوں، البتہ ہیرے جواہرات حوائج اصلیہ میں سے نہ ہونے کی بنا پر ۔۔۔ ان کے مالکین پر ۔۔۔ صدقۂ فطر اور قربانی کا وجوب ہوگا (بشرطیکہ جواہرات کی قیمت بقدر نصاب ہو) اور ان کے مالکین صدقات واجبہ کا مصرف نہیں ہوں گے۔ یہی حکم ان خواتین کے بارے میں بھی ہوگا جن کے پاس ہیرے جواہرات ہیں خواہ وہ تزیین کے لیے ہوں یا کسی اور غرض سے (بس تجارتی مقصد سے نہ ہوں)۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کا ذکر تمام کتب فقہیہ حنفیہ میں ملتا ہے، مثلاً شامی میں ہے:

"لا زكاة في اللآلي والجواهر إلا أن تكون للتجارة" (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

صاحب نصاب تاجر حولان حول کے وقت جتنے مال کا مالک ہے اور اس وقت اس کی ملکیت میں موجود مال تجارت کی جو قیمت ہے (یعنی اس مال کی جو قیمت اسے ملے گی) اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ تاجر اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کے بقدر، اگر خوردہ فروش ہے تو خوردہ قیمت کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وہ تجارتی مال خواہ منقول ہو یا غیر منقول (اراضی وغیرہ) سب کا حکم یکساں ہوگا، یعنی وہی جو اوپر مذکور ہوا کہ حولان حول کے وقت تاجر کو جو قیمت ملے گی اس کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

---

(۱) رد المحتار ۲/۱۴

شیئرز اور بانڈس کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ وہ شیئرز در اصل علامت (یا سند) ہوتے ہیں اس مال کی، جو کمپنی کی ملکیت میں ہے — مالِ تجارت — ہے۔

شیئرز کے مالک کے پاس حولانِ حول کے وقت موجود جو قیمت شیئرز کی ہوگی اسی کے بقدر پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس شخص نے جو قرضہ کسی کو — خواہ حکومت کو — دیا ہے اصل قرضہ پر — نہ کہ سود پر — زکوٰۃ واجب ہوگی، قرض دینے والے پر ان تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی جو قرض کی ادائے گی میں لگیں گے، اب چاہے ہر سال زکوٰۃ ادا کرتا رہے یا تمام سالوں کی — وصولیٔ قرضہ کے بعد — اکٹھا کردے۔

محورِ ثانی:

چاندی سونے میں سے جو نصاب بھی انفع للفقراء ہو، وہی اصل تسلیم کیا جائے گا۔

محورِ ثالث:

مصارفِ زکوٰۃ

۱ — طالب علم پر آنے والے کل اخراجات (بشمول رہائش و تعلیمی فیس) کے بقدر اگر مدِ زکوٰۃ سے مدرسہ کے ذمہ دار، مستحقِ زکوٰۃ طالب علم کو رقم پہلے دے دیں اور پھر وہاں سے وصول کرلیں تو یہ شکل جائز ہے۔ چیک سے ادائے گی کی شکل میں ادائے گی اس وقت سمجھی جائے گی جب کہ چیک کی رقم طالب علم کو وصول ہو جائے، اگر اس کا بینک میں کھاتہ ہے تو اس کے کھاتہ میں اندراج ہو جانے اس کے بغیر نہ ہوگی۔

(بحوالہ) اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت گنگوہی رح، حضرت سہارن پوری رح، حضرت تھانوی رح اور مولانا مفتی محمد شفیع رحمہم اللہ کا آخری نقطۂ نظر یہ رہا ہے کہ مدرسہ کے ذمہ داران (مہتمم وغیرہ) طلبہ کے وکیل ہوتے ہیں، لہٰذا ان کا قبضہ طلبہ کے قبضہ کے قائم مقام ہے۔

۲ — زکوٰۃ وصول کرنے پر — مدارس کے سفراء وغیرہ کو — کمیشن دینا شرعاً درست نہیں، انہیں العاملین علیہا کے تحت داخل کرنا بھی مشکل ہے، کیوں کہ العاملین کی تعریف یہ کی گئی ہے:

* ھو الذی یبعثہ الإمام لأخذ الصدقات؟ (احکام القرآن جصاص ص۱۲۳/۳)

جصاص رازی نے جبری وصولی کا حق بھی امام کے لیے اسی سے ثابت کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مدارس کے ذمہ دار نہ امام ہیں اور نہ انہیں جبری وصولی کا حق ہے۔ مدارس کے منشی وغیرہ جو زکوٰۃ کی آمد وصرف کے حساب کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہیں ان کو زکوٰۃ کی مد سے تنخواہ دینا ـــــ شرعاً ـــــ درست نہیں۔

فی سبیل اللہ کا مصداق صرف وہ ہے جسے خیر القرون میں مصرف قرار دیا گیا یعنی اصطلاحی جہاد میں مشغول افراد۔ بقیہ اقوال ضعیف اور بعض ـــــ مثلاً سوالنامہ میں مذکور دوسرا و تیسرا ـــــ تو نہایت ضعیف ہیں۔ ایسے کمزور دلائل جیسے کہ ان اقوال کے قائلین نے دیے ہیں ان ـــــ کی بنیاد پر تو ہر غلط کو صحیح ثابت کیا جا سکتا ہے، اس طرح پوری شریعت ہی کو مسخ کیا جا سکتا ہے ـــــ یوں بھی جمہور کے قول ہی میں سلامتی ہے اور بغیر شدید مجبوری کے اس سے عدول جائز نہیں سمجھا گیا۔ قرون اولیٰ میں اگر کسی آیت کی تشریح میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو تیسرے قول کا اختیار کرنا درست نہیں، کیوں کہ یہ بھی ایک طرح کا خرق اجماع ہے (جسے اصولیین نے " لاقائل بالفصل " جیسی تعبیرات میں بیان کیا ہے) اور پھر اس طریقہ سے تو ہر غلط بات کو صحیح قرار دینے بلکہ ہر خواہش کے لیے سند دریافت کرنے کا دروازہ کھل جائے گا۔

الف: ـــــ فی سبیل اللہ کا مصداق اصلاً تو غازی ہے، زیادہ سے زیادہ منقطع الحاج کو امام محمدؒ کے قول کی رو سے بھی شامل کیا جا سکتا ہے، کیوں کہ اس کی شمولیت پر احادیث صحیحہ دال ہیں (جن کا ذکر سوال نامہ میں بھی ہے)۔

ب: ـــــ احناف کے نقطۂ نظر سے ہر مصرف کے لیے (سوائے " العاملین علیہا " کے) فقر شرط ہے۔

ہ ـــــ مصارف زکوٰۃ بھی ـــــ رکعات صلوٰۃ کی طرح ـــــ قیاس کا محل نہیں۔ ظاہر ہے کہ فکری وقلمی جہاد نئی تعبیریں ہیں، بنا بریں جہاد قلمی وفکری فی سبیل اللہ کا مصداق نہیں بن سکتے اور ان میں مشغول لوگ (اگر وہ محتاج نہیں ہیں) مستحق زکوٰۃ نہیں۔

زکوٰۃ کے مصارف آٹھ ہی میں منحصر ہیں اور یہ حصر اضافی نہیں حقیقی ہے۔ کسی بڑے سے عالم ـــــ حتیٰ کہ صحابہ کے ـــــ تفردات اور شاذ اقوال پر مدار رکھنا سلف کے طریقہ کے خلاف ہونے کے ساتھ نہایت خطرناک اقدام ہے، جس سے بہت سی بے راہ رویوں ـــــ بلکہ گمراہیوں ـــــ کے لیے راستہ کھل سکتا ہے۔ امام اوزاعیؒ کا یہ قول " من أخذ بنوادر الإسلام خرج عن الإسلام " قابل توجہ ہے۔

سوالنامہ کا جواب

از: — حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب، دارالعلوم دیوبند

الجواب وباللہ التوفیق

زکوٰۃ مال نامی میں واجب ہوتی ہے خواہ نامی بالذات ہو یا نامی بالغرض، اپنے قیود و شروط سے اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم ہے۔

پہلی شرط مملوک ہونے کی تکمیل ہونا ہے، اور ملک تام سے وہ ملک مراد ہے جو مملوک کی یداً اور رقبتاً دونوں طرح سے حاصل ہو اور ملک رقبتہ سے مراد خرید و فروخت کا مالک ہونا ہے۔ اور ملک یداً سے مراد اپنے قبضہ و تصرف میں ہونا ہے۔

جواب (۱) ان مذکورہ دونوں صورتوں میں ادائیگی زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ ان صورتوں میں قسطی خریداری پر ابھی ملک نہ تو رقبتہ حاصل ہے اور نہ یداً حاصل ہے، بہت سے بہت وعدۂ تملیک ہے اور محض اس میں وجوب زکوٰۃ متحقق نہیں ہوتا۔

(۲) صرف کرایہ دار پر واجب ہوگی۔

(۳) ان اداروں و مدارس سے مراد اگر دینی تعلیم کے ادارے و مدارس ہیں تو ان میں دینی تعلیم کے لیے آئی ہوئی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اس مسئلہ کی تفصیل و مدلل بحث منتخبات نظام الفتاویٰ میں بہ زیر عنوان (مدارس میں آئی ہوئی رقوم کا شرعی حکم) آچکی ہے، وہاں

دیکھی جا سکتی ہے۔

(۲) جب کوئی حرام مال اپنی ملک میں آ جائے تو چونکہ یہ مال مملوک بہ ملک خبیث ہوگا اس لیے اس کا پہلا حکم یہ ہے کہ اس کو حسب ضابطۂ شرعیہ مالک تک پہونچائے یعنی رد الی رب المال کر دیا جائے جیسا کہ فقہی کتب کی ان عبارتوں سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً

(الف) اذا علم المالك بعينه فلا شك في حرمته ووجوب رده عليه (أي على رب المال)۔ (۱)

(ب) واما اذا كان عند رجل مال خبيث (حرام) فاما ان ملكه بعقد فاسد او حصل له بغير عقد ولا يمكنه ان يرده الى مالكه ويريد ان يدفع مظلمته عن نفسه فليس له حيلة الا ان يدفعه الى الفقراء لانه لو انفق على نفسه فقد استحكم ما ارتكبه من الفعل الحرام (الى قوله) ولكن يريد دفع المعصية عن نفسه يدل على مسائل اللقطة۔ (۲)

(ج) ويبرأ بردها ولو بغير علم المالك في البزازية غصب دراهم انسان من كيسه ثم ردها فيه بلا علمه برئ وكذا (يبرأ) لو سلمه اليه بجهة أخرى كهبة او ايداع (ولم يرده) او شراء وكذا لو اطعمه فاكله (۳) وتحته قول رد المحتار الشامي ـ وفيه [illegible] لما غصبه فلم يقبله مالكه فحمله الغاصب الى بيته برئ وان لم يقبض۔ (۴)

پھر جو بچ جائے اس کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے مسلم غرباء و مساکین کو تملیکاً دے کر جلد سے جلد اپنی ملک سے نکال دیا جائے۔ ہاں اس کو اگر رد الی رب المال کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ حائل ہو مثلاً آج کل ہندوستان کے حکومتی (نیشنل) بینکوں سے سود میں ملنے والی رقوم کو اگر بینکوں ہی میں چھوڑ دیں تاکہ رد الی رب المال ہو جائے تو اگر اصحاب بینک اس کو اپنے مصرف کھاتے میں ڈال دیں تو عموماً

---

(۱) ۳/۴ (۲) بذل المجهود ۴/۱/۲ (۳) درمختار على هامش الشامي ۵/۱۰

(۴) شامی من کتاب الغصب ۵/۱۲۹

ایسے کاموں میں استعمال ہوں گی جس سے اسلام اور مسلمانوں کے نقصان کا غالب اندیشہ ہے اس لیے حکم شرعی یہ دیا جاتا ہے کہ وہاں نہ چھوڑ دے بلکہ وہاں سے نکال کر خود کسی مناسب سبیل سے رد الی رب المال کردے کما اشرت الیہ بقولہ۔ یا کوئی اور واقعاتی پریشانی حائل ہو مثلاً کوئی جانی یا مالی پریشانی یا عزت نفس کی پامالی کا قوی اندیشہ وغیرہ ہو تو اس طرح رد الی رب المال کردے کہ مالک کو معلوم بھی نہ ہو اور وہ مال اس کی ملک میں پہونچ جائے اس کے نظائر کتب فقہ میں بکثرت ملتے ہیں۔ کما تری انت ایضاً۔ نیز اس کی تفصیل اور اس کا حکم شرعی ہندوستان کے ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کا رد الی رب المال کے سلسلہ میں منتخبات نظام الفتاوی ۔۔۔۔ ردر بحث احکام حوادث الفتاوی ملتا ہے کہ ان بینکوں سے ملنے والی سودی رقم کو بینک میں نہ چھوڑے بلکہ وہاں سے نکال کر خود پہلے حکومت کے غیر شرعی مطالبات میں جو واجب الادا ہے دے دے۔ مثلاً روڈ ٹیکس، یا دوسرے ٹیکس، کورٹ فیس وغیرہ۔ پانی یا بجلی کے مطالبہ میں نہ دے کیوں کہ وہ عقود مبادلہ کا ایک بدل ہے جو شرعاً بھی درست ہے۔

ایک شبہ

بعض حضرات شبہ یہ کرتے ہیں کہ بینک سے ملنے والی سودی رقوم کا مالک حکومت کب ہوتی ہے کہ اس کو رد کیا جائے بلکہ ان رقوم کا مالک تو بینک میں رقم جمع کرنے والے ہوتے ہیں پس اگر رد کرنا ہی ہے تو ان کی طرف رد کیا جائے۔

شبہ کا ازالہ

جواب یہ ہے کہ بینک میں جو رقم رکھی جاتی ہے وہ یا تو کسی قانونی مجبوری سے یا محض بغرض حفاظت داخل کی جاتی ہے، کسی عوض لینے کی نیت سے جمع کرنا درست ہی نہیں ہے، اسی لیے فکس ڈپازٹ میں جمع کرنا ممنوع و ناجائز ہوتا ہے۔

اور جو رقم محض حفاظت کے لیے جمع کی جائے گی وہ بینک میں بعینہٖ امانت ہوگی اور اس پر بینک کا تصرف کرنا شرعاً جائز نہ ہوگا اور جب ان داخل شدہ رقوم کو بینک خلط ملط کردے یا اس کو اپنے کام میں صرف کردے تو وہ امانت شرعاً قرض بن جاتی ہے اور امانت کا معاملہ مبدل بہ معاملہ قرض ہو کر مستقرض مالک

ہوجاتا ہے، حتی کہ اس پر ضمان (واجب الاداء) ہوجاتا ہے۔ پس شرعی ضابطے کے مطابق شرعاً بینک مقروض ہو کر اپنے ان تصرفات کی وجہ سے ان رقوم کا خود مالک ہوگیا، اور بینک حکومتی یا نیشنل ہوجانے کی وجہ سے حقیقۃً حکومت ان رقوم کی مالک ہوگئی اور یہ عملہ بینک حکومت کے محض نمائندہ اور وکیل ہوں گے، لہٰذا ان رقوم کا رد کرنا حکومت کی جانب لازم ہوگا نہ کہ رد کرنا جمع کرنے والوں کی طرف۔ کما لا یخفی علی من لہ خبرۃ بالفقہ والاصول۔

رہ گئی یہ بات کہ اگر حرام مال حلال مال میں اس طرح مخلوط ہوجائے کہ اس میں تمیز و امتیاز مشکل و متعذر ہوجائے تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا؟

اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ کاغذات و اندراجات کے حساب و کتاب کے ذریعہ یا پھر اپنی یادداشت سے خوب غور و خوض سے جتنی مقدار حلال مال کی متعین ہو اس کی تو زکوٰۃ حسب ضابطہ شرع ادا کردے اور اس سے زائد کو اس کے وبال سے بچنے کی نیت سے بجائے زکوٰۃ ادا کرنے کے کل مال حرام بقسط واحد اگر قدرت میں ہو، ورنہ باقساط متعددہ حسب استطاعت جہاں تک جلد ہوسکے بطور تصدق فقراء و مساکین کو دے کر اپنی ملک سے نکال دے۔ فقط۔

سوال (۵) کا شرعی حکم: دین کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب ہے جس کی ملک وہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگرچہ دین کی تین قسمیں ہیں، دین قوی، دین متوسط اور دین ضعیف اور ہر ایک کے احکام الگ الگ ہیں، مگر تسہیلاً للعمل اور انفع للفقراء ہونے کے پیش نظر راجح قول یہی ہے کہ جتنی مقدار جس وقت وصول ہوتی جائے اسی وقت اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا چاہیے اور اگرچہ دین قوی و غیر قوی کے اعتبار سے نفس وجوب میں کچھ تفصیل و اختلاف ہے مگر اس طریقہ عمل سے عمل کرنے میں کسی کے نزدیک وجہ اختلاف نہ رہے گی۔

سوال (۶) کا شرعی حکم: یہ ہے کہ ملازم کی تنخواہ سے جو جزو تنخواہ ملازم کے قبضہ میں جانے سے قبل محکمہ وضع کرتا ہے اور بعد ختم ملازمت وضع کی ہوئی رقم میں اضافہ کرکے دیتا ہے خواہ سود کے نام سے دے، مگر وہ زیادتی شرعاً سود نہیں ہوتی خواہ دوران ملازمت میں ملازم اپنے ہی جمع کردہ روپیہ سے کچھ روپیہ لے اور محکمہ اس کو قرض کے نام سے دے اور اس پر کچھ زائد رقم سود کے نام سے وصول کرکے اسی ملازم کے فنڈ میں جمع کرے اس پر بھی شرعاً سود کی تعریف صادق نہ آنے سے سود کا حکم نہ ہوگا بلکہ اس کو محکمہ کا انعام قرار دیا جاتا ہے۔ کما حققہ العلامۃ التھانوی فی فتاواہ۔

کیوں کہ اپنے مملوکہ مال میں جب عقد معاوضہ کا معاملہ کرے تو فضل ربوا اور سود ہوتا ہے اور یہاں جو پیشگی تنخواہ کی گئی ہے ابھی اس میں اجیر (ملازم) کا صرف استحقاق ملک ثابت ہوتا ہے اور استحقاق ملک دوسری چیز ہے اور تحقق ملک دوسری چیز ہے۔ اور تحقق ملک تو قبضہ کرنے کے بعد صادق آئے گی اور تحقق ملک سے قبل مملوک ہونا صحیح نہیں لہٰذا اس تحقق ملک سے قبل جتنا بھی دیں گے وہ بجائے سود ہونے کے شرعاً صرف انعام قرار پائے گا اور ملازم کا اس پر اپنے مملوک کی طرح تصرف کرنا درست رہے گا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زکوٰۃ تو اپنے مملوک مال میں واجب ہوتی ہے لہٰذا قبضہ میں آنے سے قبل قبل اس پر اسی صاحب فنڈ پر زکوٰۃ کی ادائے گی کا وجوب بھی نہ ہوگا کیوں کہ شرعاً یہ اصول مسلم ہے کہ سبب وجوب کے تحقق سے پہلے نفس وجوب بھی نہیں ہوتا جیسا کہ زکوٰۃ کے وجوب کا سبب مقدار نصاب کا مالک ہوتا ہے اور جب تک مقدار نصاب کا مالک نہیں ہوتا اس وقت تک نفس وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی نہیں ہوتا۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وصول ہونے کے بعد سابق زمانہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہ ہوگی، جیسا کہ مالک نصاب ہونا جو نفس وجوب زکوٰۃ کا سبب ہے۔ نفس وجوب سے قبل قبل کوئی ادا کرے تو زکوٰۃ کی ادائے گی صحیح شمار نہ ہوگی، جس طرح کسی معین وقت کی فرض نماز کے نفس وجوب کا سبب اس فرض کے وقت کا تحقق ہوتا ہے اور اس سبب (وقت نماز) کے تحقق سے قبل قبل فرض ادا کر دے تو فرض ادا نہ ہوگا، ہاں نفس وجوب کے متحقق ہو جانے کے بعد جب بھی ادا کرے تو ادائے گی صحیح ہوگی۔ اسی طرح یہاں بھی ایسا ہی ہوگا کہ نفس وجوب زکوٰۃ جب تک اس رقم کے پانے والے پر یعنی مقدار نصاب ملک ثابت ہونے پر ادائے گی زکوٰۃ بھی درست ہوگی ورنہ صحیح نہ ہوگی۔ پھر نفس وجوب کے تحقق کے بعد اگر چاہے تو پیشگی ادائے گی بھی صحیح ہو سکے گی۔ فقط

رہ گئی یہ بات کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے شرط ہے کہ نصاب زکوٰۃ کی مقدار ایسے مال نامی کا مالک ہو جو اس کی حاجت اصلیہ سے اور بار دین سے فارغ ہو لہٰذا ان تینوں (مال نامی کی اور حاجت اصلیہ کی اور دین سے فارغ ہونے کی) مختصر تشریح کر دی جاتی ہے۔

مال نامی: مال نامی چند قسم پر ہوتے ہیں۔

(الف) خلقۃً مال نامی ہونا جس کو اللہ نے پیدا ہی فرمایا نمو کے لیے جیسے سونا چاندی اور اس سے بنی ہوئی ہر وہ چیز خواہ زیور ہو یا اس کے علاوہ کوئی چیز ہو۔ اور چاندی یا سونے کا سکہ جیسے دینار درہم

اشرفی یا چاندی کا روپیہ، اور اصطلاح میں اس کو سکہ نافقہ خلقیہ کہتے ہیں۔

(ب) وہ چیزیں جن کو اللہ نے نمو کے لیے نہیں پیدا فرمایا ہے بلکہ لوگوں نے اس کو مال نامی کے قائم مقام قرار دے دیا ہے اور سونے چاندی کے علاوہ جاری سکہ قرار دے دیا ہے جیسے غیر چاندی کا پیسہ روپیہ اور کاغذی نوٹ، پونڈ، ڈالر، ریال وغیرہ۔ اس کو اصطلاح میں سکہ نافقہ غیر خلقیہ کہتے ہیں۔

(ج) وہ مال جس کی تجارت کرتے ہیں۔

یہ تینوں قسمیں مال نامی کی ہیں، اول نامی خلقۃً، دوسری نامی حکماً و عرفاً، تیسری نامی عملاً۔

جب یہ تینوں یا ان میں سے کوئی ایک نصاب کی مقدار کے برابر ملک میں آجائے اور حاجتِ اصلیہ سے اور بار دین سے فارغ ہو جائے تو نفس زکوٰۃ کا وجوب ہو جائے گا اور حاجت اصلیہ سے وہ حاجتیں مراد ہیں جو اپنے اور اپنے ذمہ میں داخل شدہ اہل و عیال کی روزمرہ کی ضروریات سے فاضل ہو کر سال بھر فاضل رہ جائیں۔ اسی طرح دین سے فارغ ہونے سے مراد یہ ہے کہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت سے جو دین لیا جائے اس سے فارغ ہو۔ اتنے مال کا نفس مالک ہو جانے سے زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا۔ اور جب اتنی مقدار پورے سال بھر مذکورہ ضروریات سے فارغ رہ جائے تو اس کے زکوٰۃ کی ادائے گی بھی واجب ہو جائے گی۔ البتہ بے ضرورت واقعی قرض لینا ممنوع ہے۔ کیوں کہ اصل یہی ہے کہ ہر انسان ہر ذمہ سے بری رہے اور جب ضرورت واقعی ہو تو قرض لینا درست رہے گا۔ اگر غیر سودی قرض نہ ملے تو حاجت شدیدہ میں سودی قرض لینا یا سودی معاملہ کر لینا بھی جائز ہو جاتا ہے جیسا کہ،

"ویجوز للمحتاج الاستقراض بالربح (الاشباہ والنظائر)"

کے جزئیہ سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی مزید تشریح آئندہ آجائے گی۔

ہاں اس ضمن میں ایک یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ صاحب خود تو مقروض یا دین میں دبا ہوا نہیں ہیں بلکہ اپنی ملکیت اور سامان تجارت کے بعد قرض و دین دوسروں کو دے دیا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا۔ کیا ادائے گی زکوٰۃ میں یہ دینا تو حائل تو نہ ہوگا اگر ہوگا تو اس میں کیا تفصیل ہے اس کو بقدر ضرورت ہم پہلے ذکر کر آئے ہیں اور وہ حل کرنے کے لیے کافی ہے اس لیے اب اس پر مزید لکھنے کی حاجت نہیں۔

هذا ما تيسر لي الآن والباقي سيأتي على حسب الاستطاعة

فقط واللہ اعلم

سوالات منسلکہ کے صفحہ ۲ کے پچھلے حصے میں طویل الاجل دین کی گفتگو ہے۔ اس دین کا حاصل تجارتی دین ہے۔ اس دین کو انسان خواہ قانونی مجبوری یا محض اپنے خالص اختیار سے کاروبار کرنے یا چلانے کے لیے حاصل کرتا ہے حاجت اصلیہ کی تعریف اس پر صادق نہیں آتی کما ھو أنفاس تعریف الحاجة الاصلیة۔ لہٰذا یہ قرض وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہونے میں مانع نہ ہوگا، بلکہ وہ حاجت اصلیہ کی شرعی سابق تعریف میں قرض کی جتنی مقدار حائل ہوگی اس کے وضع کرنے کے بعد باقی سب پر وجوب زکوٰۃ کا حکم عائد ہوگا۔

کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ پہلے معلوم ہونی چاہیے پھر حکم شرعی لگانا چاہیے۔ کمپنیوں کی حقیقت شرعیہ اولاً شرکت عنان کی ہوتی ہے اور شیئرز خریدنے والے سب شرکا کمپنی اور شرعاً مالک ہوتے ہیں اور عملۂ کمپنی یعنی کمپنی میں کام کرنے والے وکیل وہ مسئول ہوتے ہیں، مگر یہ لوگ بمدد قانون وقت خود مالک بن جاتے ہیں، اور اس میں جمع شدہ حصص میں کچھ مقدار اپنا یا کمپنی کی بضاعت (پونجی) قرار دیتے ہیں اور کچھ کو فرنیچر و آلات مشین وغیرہ میں شمار کرتے ہیں اور کچھ کو کاروبار میں لگاتے ہیں، ان سب واقعاتی امور میں بھی وہ شرعاً غصب ہی شمار ہوگا اور اس پر غصب ہی کے احکام جاری ہوں گے۔ اور یہ مسلّم ہے کہ شئ مغصوب پر جب تک مغصوب بعینہٖ یا اس کا بدل وصول نہ ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ کا وجوب یا رد کے احکام شرعاً درست نہیں ہوتے۔ اس لیے کمپنیاں کے ان حصوں کو جب تک بیچ کر نقد نہ کر لیا جائے اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم متوجہ نہ ہوگا۔

ہیرے جواہرات کی خرید و فروخت کا جب کاروبار کریں تو اموال تجارت میں ان کا شمار ہو کر سال پورا ہونے پر اس کا عام کاروبار کرنے والوں کے یہاں اس کی جو قیمت ہوگی اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں دینا ہوگا، اور اگر کاروبار نہیں کرتا ہے تو واجب نہ ہوگی۔ البتہ اگر زکوٰۃ سے بچنے کے لیے ایسا کرتا ہے تو سخت خطرناک جرم ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی وبال میں غیر شعوری طور پر سب ہلاک ہو جائے کہ یہ عمل ایک قسم کی نافرمانی کا اور شاید گستاخی کا درجہ ہو سکتا ہے۔

" واشار الیہ قولہ تعالیٰ: لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی ولا تجہروا لہ بالقول کجہر بعضکم لبعض ان تحبط أعمالکم وانتم لا تشعرون۔

ہاں اگر وجوب زکوٰۃ کو ساقط کرنے کی نیت نہ ہو بلکہ محض تزئین و آرائش کے لیے ہو جیسا کہ عورتیں رکھتی ہیں یا کسی حادثہ یا اچانک ضرورت پر کام آجانے کے لیے اپنے پاس رکھتے ہوں تو اس کی گنجائش

خرچ کرنا جائز ہے، ہاں اگر زبردستی نہ لیں بلکہ لوگوں کی مرضی و خوشی سے لیں تو یہ لینا اور اس کے عوض میں زیادہ دینا سود شمار ہوگا اور اس کو ان کے وہاں چھوڑنا جائز نہ رہے گا بلکہ ان سے لے کر غرباء و مساکین میں صدقہ کر دینا چاہیے محور ثانی کا حکم شرعی بیان گزر چکا۔

محور ثالث

الف، یہ معاملہ شرعاً ادائے گی زکوٰۃ سے بری ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اور صحیح یہ ثالث (۲۔ب) اس کی ساری گفتگو ناتجربہ کاری اور شرعی اصول سے ناواقفیت سے ناشی ہوگی۔ اس کی جائز اور مذکورہ خطرات سے محفوظ صورت یہ ہو سکتی ہے کہ سفراء کو بالمقطع تنخواہ مقرر کیا جائے پھر ان کو جس علاقہ میں بغرض وصول چندہ بھیجا جائے اور اس علاقہ کی عام چندہ کا اندازہ کر کے اس طرح کہا جائے کہ آپ تمام وصول کردہ رقم مدرسہ کے خزانہ میں بھیجتے جائیں اور جب آپ سفر پورا کر کے واپس آئیں گے تو آپ کی تمام وصول اس مذکورہ رقم سے جتنی زائد ہوگی اس کا اتنا فی صد آپ کو بطور انعام دیا جائے گا۔ اسی طرح مدرسہ کے لیے بیش از بیش رقم وصول کرنے کا شوق پیدا ہوکر خرچ کے اوسط کا زیادہ ہونا اور آمد کے کم ہونے کا خطرہ نہیں رہے گا۔ رہ گیا دیگر ملازمین کی تنخواہ تو اولاً اس کو عطیہ کی رقم سے دیا جائے گا اور اگر کم پڑے تو تملیک مستحق کے حیلہ سے دیا جائے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور ملازمت ضرورت سے زائد شعبوں کی قائم نہ کیا جائے کہ بلاوجہ مدرسہ پر بار اور ان ملازمین وغیرہ کو عاملین علیہا کے تحت کرنے کی حاجت بھی نہ رہے گی۔

زکوٰۃ و فی سبیل اللہ

اس میں شک نہیں کہ جناب نے اس سلسلہ میں بے انتہا محنت فرمائی ہے کہ تقریباً ہر مکتب فکر کی رائیں مع ان کے دلائل بھی بیان فرما دیا ہے۔ آپ کی چھان بین ذاتی کاوش ہے۔ نعم اکم اللہ۔

سوالات کے جوابات

از:۔ مولانا نعمت اللہ قاسمی، دارالعلوم، دیوبند

ملک تام

(۱) ملک تام سے مراد جو رقبۃً و یداً مملوک ہو۔

ھو ما اجتمع فیہ الملک والید اما اذا وجد الملک دون الید کالصداق قبل القبض او وجد الید دون الملک کملک المکاتب والمدیون لاتجب فیہ الزکوٰۃ کذا فی السراج الوھاج۔ (۱)

لان المراد بالتام المملوک رقبۃ و یداً (۲) — فلا زکوٰۃ علی مکاتب لعدم الملک التام ای لعدم الید فی حق السید وعدم ملک الرقبۃ فی حق المکاتب۔ (۳)

(۲) جس مال تجارت کی قیمت ادا کردی گئی ہے، مگر اب تک قبضہ نہیں ہوا، قبل القبض زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

"ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ۔

(۱) عالمگیری، ص ۱۷۲ (۲) شامی ۲/۶ (۳) شامی ۲/۷

اور قبضہ کرنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرے یا نہیں تو اس میں اختلاف ہے۔ (۱)

واما المبیع قبل القبض فقیل لایکون نصابا والصحیح انہ یکون

نصابا کذا فی المحیط السرخسی۔

اور صاحب بحر نے بھی لکھا ہے کہ مبیع بائع کی بعد القبض زکوٰۃ ادا کرے گا۔

ذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض

قیل لایکون نصابا لان الملک فیہ ناقص بافتقاد الید والصحیح انہ

نصابا لانہ عوض مال وقد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر

یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعا فعلی ھذا قولہم

لاتجب الزکوٰۃ معناہ قبل قبضہ واما بعد قبضہ فتجب الزکوٰۃ

فیما مضی کالدین القوی (۱)

مگر علامہ شامی نے لکھا ہے کہ قاضی خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس پر ثمن بائع کی زکوٰۃ واجب

نہیں ہوگی۔

اما بعدہ فیزکیہ عما مضی کما فہمہ فی البحر عن عبارۃ المحیط

فراجعہ لکن فی الخانیۃ رجل لہ سائمۃ اشتراھا رجل للسائمۃ

ولم یقبضہا حتی حال الحول ثم قبضہا لازکوٰۃ علی المشتری

فیما مضی لانہا کانت مضمونۃ علی البائع بالثمن ومقتضی التعلیل

عدم الفرق بین ما اشتراھا للسائمۃ او للتجارۃ فتامل۔ (۲)

(۳) اور بائع نے ثمن پر قبضہ کیا ہے وہ مالک ہو گیا لہٰذا اس کی زکوٰۃ بائع پر ہے نہ کہ مشتری پر۔

وفی الخانیۃ اشتری عبدا للتجارۃ یساوی مائتی درہم ونقد الثمن ولم یقبض

العبد حتی حال الحول فمات العبد عند البائع کان علی بائع العبد

زکوٰۃ انما عین لانہ ملک الثمن ولا زکوٰۃ علی المشتری لان الثمن

---

(۱) عالمگیری ص ۱۷۱ (۲) بحر ص ۲۰۰ (۳) شامی ۲/ ...

زال عن ملکہ إلی البائع۔" (۱)

(۴) کرایہ پر دی گئی پیشگی رقم۔ اس رقم کا مالک، مالکِ مکان ہو گیا لہٰذا اس کے ذمہ ہی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ "اذا عجل الاجرۃ لایملک الاسترداد" (۲)

اور علامہ شامی نے آگے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

"وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری ان الزکوٰۃ فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفها اهل بخاری ان الزکوٰۃ فی الاجرۃ المعجلۃ تجب علی الآجر لانہ ملکہ قبل الفسخ وان کان یلحقہ دین بعد الحول بالفسخ۔"

ڈیپازٹ کی رقم پر زکوٰۃ

اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر ہوگی اس لیے کہ وہ بطور قرض کے دیے ہوتے ہیں۔

"الدین القوی کقرض قلت الظاهر ان منہ مال المرصد المشهور فی دیارنا لانہ اذا انفق المستاجر لدار الوقف علی عمارتها الضروریۃ بامر القاضی للضرورۃ الداعیۃ الیہ یکون بمنزلۃ استقراض المتولی من المستاجر" (۳)

(۵) مدارس میں جمع رقم پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

"وسبب افتراضها ملک نصاب۔۔۔ فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک۔"

(۶) مال مخلوط میں مال حرام کی مقدار نکالنے پر بقدر نصاب بچتا ہے تو اس باقی مقدار میں زکوٰۃ ہوگا

"ولو خلط السلطان المال المغصوب بمالہ ملکہ فتجب الزکوٰۃ فیہ ۔۔۔ هذا اذا کان لہ مال غیر ما استهلکہ بالخلط وفی فصل العاشر

---

(۱) بحر ص ۲۰۲ (۲) ۵/۶ (۳) شامی ۲/۲۶

من الشامی نقلاً عن فتاوی الحجة من ملك اموالا غير طيبة او غصب اموالا وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامنا وان لم يكن له سواها نصاب فلا زكاة فيه عليه لانه مديون ومال المديون لا ينعقد سببا لوجوب الزكاة عندنا فافاد بقوله وان لم يكن له سواها نصاب ان وجوب الزكاة مقيد بما اذا كان له نصاب سواها۔ (۱)

دین کی زکوٰۃ کس پر

دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، مدیون پر کسی حال میں بھی نہ ہوگی۔

وصول یابی اور عدم وصول یابی کے اعتبار سے دین کے اقسام

(۱) جس کا مدیون اقرار کرتا ہو۔

(۲) جس کا مدیون انکار کرتا ہو، مگر دائن کے پاس شہادت موجود ہے۔

(۳) مدیون انکار کرتا ہے اور دائن کے پاس شہادت موجود نہیں ہے۔

ان تینوں صورتوں میں مدیون کے اندر دین کی ادائے گی کی استطاعت ہے یا استطاعت نہیں ہے اور معسر ہے، چنانچہ فقہاء نے صرف اس دین کو جس کا مدیون انکار کرتا ہے اور کوئی شہادت بھی دائن کے پاس نہیں ہے اس کو مال ضمار کے حکم میں رکھتے تھے مگر حالات کی تبدیلی سے اس کو بھی مال ضمار کے حکم میں رکھنے لگے جس پر شہادت موجود ہو اس لیے کہ عدالت کے ذریعہ قرض وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے اس کے بعد حالات میں اور زیادہ تبدیلی آئی کہ آدمی اقرار بھی کرتا ہے اور دین کی ادائے گی پر قادر بھی ہے پھر بھی ٹال مٹول کرتا ہے اور ادا نہیں کرتا ہے اور دائن کے لیے وصول کرنا بہت مشکل ہو گیا ہے جس کی بنا پر بعض فقہاء نے اقسام دین کی مزید دو قسمیں قرار دیں۔

(۴) جس دین کی وصول یابی کی بالکل امید نہیں یا امید ضعیف ہے۔

---

(۱) شامی ۲/۲۵

(۲) جس دین کی وصول یابی کی امید قوی ہے

جس دین کی وصول یابی کی امید قوی ہے اگر وہ دین قوی ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر دین متوسط ہے یا ضعیف ہے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جس کے ملنے کی امید بھی نہیں یا ضعیف امید تھی اگر وہ مل جائے تو وہ مال مستفاد کے حکم میں ہوگا۔

" قلت قد مر اول الزکوٰۃ اختلاف التصحیح فیه ومال الرحمتی الیٰ هذ وقال بل فی زماننا یقر المدیون بالدین وبملائة ولا یقدر الدائن علیٰ تخلیصه فهو بمنزلة العدم " (۱)

پراویڈنٹ پر زکوٰۃ

ملازمت کی وجہ سے اجرت کا استحقاق ہے مگر جب تک قبضہ نہ کرے ملک تام حاصل نہیں ہے بلکہ عند الاحناف یہ دین متوسط ہے، لہذا دین متوسط میں اصح روایت کی بنا پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہیں ہے۔

نامی کی حقیقت

نمو، یعنی بڑھوتری، نمو حقیقی توالد و تناسل یا تجارت کی شکل میں ہو تقدیری نمو اور اضافہ کرنے پر قدرت کا ہونا، بایں طور کہ وہ مال خود اس کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔

وفی الشرع هو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادة بالتوالد والتناسل والتجارات، والتقدیری تمکنه من الزیادة بکون المال فی یده او ید نائبه " (۲)

حقیقۃً نمو و اضافہ مراد نہیں ہے:

لانعنی به حقیقة النما لان ذلک غیر معتبر انما نعنی به کونه

---

(۱) شامی ۲/۱۳   (۲) شامی ۲/۷

المال معدا للاستنماء للتجارة او بالاسامة۔ (۱)

حوائج اصلیہ کی تعریف

جس کے بغیر زندگی بسر کرنا دشوار ہو:

قال ابن الملك هي ما يدفع الهلاك عن الانسان كالنفقة ودار

السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد

او تقديرا كالدين فان المديون محتاج الى قضاءه بما في يده

من النصاب دفعا عن نفسه الحبس۔ (۲)

انسان کی بہت سی ضرورتیں ہیں اور موجودہ دور میں بہت سی غیر ضروری چیزوں کو لوگوں نے اپنے طور پر ضروری کرلیا ہے مگر زکوٰۃ کے سلسلہ میں حوائج اصلیہ سے مراد وہی ضرورت ہے جس کے بغیر چارہ نہ ہو، حوائج اصلیہ میں حالات کے اعتبار سے اور اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے والے کی حیثیت کے اعتبار سے کمی بیشی ہوسکتی ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

ہر اس دین سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ آدمی کی طرف سے ہو وہ دین حقوق اللہ کے قبیل سے ہو جیسے زکوٰۃ ، یا حقوق العباد کے قبیل سے ہو، پھر دین معجل ہو یا دین مؤجل ہو، چونکہ دین کی ادائے گی حوائج اصلیہ میں داخل ہے۔ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے حوائج اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے، اس لیے مدیون ہوتے ہوئے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔

فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد سواء كان لله كزكوة

وخراج او للعبد ولو كفالة او مؤجلا ولو صداق زوجته المؤجل للفراق

---

(۱) بدائع ۲/۱۱ (۲) شامی ۲/۶

و نفقتہ لزمتہ لقضاء او رضاء ۔

یہی قول امام مالکؒ اور احمدؒ کا بھی ہے، مگر امام شافعیؒ کے یہاں زکوٰۃ کے وجوب کے لیے دین سے محفوظ ہونا شرط نہیں ہے۔

طویل الاجل قرضوں کا حکم

موجودہ دور میں زراعتی یا کارخانہ قائم کرنے کے لیے بڑی بڑی رقمیں حکومت سے لی جاتی ہیں اور اس سے خوب نفع بھی کمایا جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ کے قول پر ہر طرح کے دیون کو وضع کرنے کے بعد اس کے پاس بہ قدر نصاب ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

مگر جب اس طرح کے قرضوں کا عام رواج ہو جائے اور ان دیون کو مانع زکوٰۃ قرار دیا جائے تو زکوٰۃ کی وصول یابی بہت زیادہ متاثر ہوگی، شرعاً یہ بات مشروعیت زکوٰۃ کی حکمت کے منافی ہے اس لیے تجارتی دین کو حوائج اصلیہ میں شمار کرنا مشکل ہے، اگر امام شافعیؒ کا قول لیا جائے تو اس سے مالک کا ضرور نقصان ہے، اس لیے اگر درمیانی شکل نکالی جائے، جیسے بعض فقہاء نے دین مہر میں معجل اور مؤجل کی تفریق کی ہے تو مناسب ہوگا، لیکن اس میں اجتماعی فیصلہ معتبر ہوگا، انفرادی رائے کا کوئی اعتبار ہوگا بلکہ ایسی صورت میں یا تو ائمہ ثلاثہ کے قول کو اختیار کیا جائے یا پھر امام شافعیؒ کے قول پر حالات کی بنا پر فتویٰ دیا جائے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

اقتصادی تجارتی ترقی کے ساتھ شرکت کی ایک قسم وجود میں آئی ہے، جس میں خود کمپنی کو ایک شخص حکمی قرار دیا جاتا ہے اور کمپنی کے لیے ذمہ ثابت کیا جاتا ہے اور کمپنی کا یہ ذمہ شرکاء کے ذمے سے الگ ہوتا ہے، فقہاء نے اگرچہ اس لفظ کو استعمال نہیں کیا ہے مگر بہت سے ایسے احکامات بیان کیے ہیں جو شخص حکمی کے نظریہ پر منطبق ہیں۔

مثلاً مسجد اور اسی طرح دیگر اداروں کے لیے وصیت کرنا راجح قول کے مطابق بلا تفصیل صحیح ہے۔ شامی میں ہے:

ینبغی ان یفتی لصحۃ الوصیۃ للازھر ویصرف لطلبتہ کما یقضی بہ العرف۔

اوقاف کے لیے حقوق ثابت ہوتے ہیں اس طرح اوقاف پر دوسروں کے حقوق ثابت ہوتے ہیں اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے اور وقف کی ضروریات کے لیے متولی سامان خریدتا ہے اور وقف سے اس کی قیمت ادا کی جاتی ہے اور ضرورت کے وقت وقف کا متولی قاضی کی اجازت سے وقف کے لیے قرض لیتا ہے تو خود وقف مقروض ہوتا ہے اس طرح خود حکومت کو شخص حکمی قرار دے کر اس پر احکامات متفرع کیے جاتے ہیں۔

چوں کہ اموال زکوٰۃ میں احناف کے یہاں خلطۃ الشیوع اور خلطۃ الجوار کسی کا اعتبار نہیں ہے بلکہ ہر شخص اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے گا، دیگر ائمہ مویشی کی زکوٰۃ میں خلطۃ الشیوع جس کو وہ حضرات خلطۃ الاعیان سے اور خلطۃ الجوار جس کو وہ حضرات خلطۃ الاوصاف سے تعبیر کرتے ہیں، دونوں طرح کی خلطۃ کا کچھ شرائط کے ساتھ اعتبار کرتے ہوئے اس کو شخص حکمی قرار دیتے ہیں اور اس پر زکوٰۃ کو واجب کہتے ہیں۔ مویشی کی زکوٰۃ کے علاوہ اموال تجارت وغیرہ میں خلطۃ الشیوع یا خلطۃ الجوار کا اعتبار کرنے میں اختلاف ہے:

"وان اختلطوا فی غیر ھذا اخذ من کل واحد منھم علی انفرادہ اذا کان ما یخصہ تجب الزکوٰۃ ومعناہ اذا اختلطوا فی غیر السائمۃ کالذھب والفضۃ وعروض التجارۃ والزروع والثمار لم تؤثر خلطتھم شیئاً وکان حکمھم حکم المنفردین وھذا قول اکثر اھل العلم......

وعن احمد فی روایۃ اخری ان شرکۃ الاعیان تؤثر فی غیر الماشیۃ اذا کان بینھم نصاب یشترکون فیہ فعلیھم زکوٰۃ .... اما خلطۃ الاوصاف فلا مدخل لھا فی غیر الماشیۃ وھی الثمار والزروع والنقدان بحال" [1]

---

[1] مغنی ابن قدامہ ۲/۶۱۹

اور حضرت امام شافعیؒ کے یہاں صحیح قول کے مطابق مویشی کے علاوہ دیگر اموال میں خلطہ کا اعتبار ہے۔

قال اصحابنا تؤثر الخلطة فی غیر الماشیة وھی الثمار والزروع و النقدان وعروض التجارة اما خلطة الاوصاف ففیہا قولان القدیم لایثبت والجدید الصحیح یثبت اما خلطة الجوار ففیہا طرق۔ والاصح ثبوتہما جمیعا فی الجمیع ۔ (۱)

مگر خلطہ کے تحقق کے لیے ایک شرط یہ بھی ہے کہ سب شرکاء مسلمان ہوں۔

ویشترط ان یکون الخلیطان من اھل الزکوٰۃ فان کان احدھما ذمیا اومکاتبا لم یعتد بخلطتہ۔ (۲)

قال اصحابنا نوعا الخلطة یشترکان فی اشتراط امور تختص خلطة الجوار بشروط فمن المشترك کون المختلط نصابا.....

ومنہا کون الخالطین ممن یجب علیہ الزکوٰۃ فلو کان احدھما کافرا اومکاتبا فلا اثر للخلطة۔ (۳)

اس بنا پر اگر کمپنی کے تمام شرکاء مسلم ہوں تو شوافع کے قاعدہ کے مطابق کمپنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگرچہ بعض شرکاء کا حصہ انفرادی طور پر مقدار نصاب نہ ہو اور جب کمپنی زکوٰۃ ادا کردے تو اس کے شرکاء کو الگ سے اس کی زکوٰۃ نہیں نکالنی ہوگی، اگر کمپنی کے تمام شرکاء مسلمان ہوں تو سہولت کے پیش نظر امام شافعیؒ کے قول کو اختیار کیا جاسکتا ہے۔ اگر تمام شرکاء مسلمان نہیں ہیں بلکہ کچھ غیر مسلم ہیں تو سب ائمہ کے نزدیک ہر حصہ دار کو اپنے حصہ کی الگ الگ زکوٰۃ نکالنی ہوگی۔

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات کو زینت کے لیے اور کسی غیر تجارتی مقصد کے لیے خرید رکھا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال نامی ہونا شرط ہے چاہے حقیقتاً نامی ہو یا تقدیراً، اور

---

(۱) شرح المہذب ۵/۳۵ (۲) مغنی ۲/۶۰۹ (۳) شرح المہذب ۵/۴۴۳

یہ مال نامی نہیں ہیں اور حوائج اصلیہ میں بھی داخل نہیں ہیں، مگر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے حوائج اصلیہ سے زائد کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا نامی ہونا بھی شرط ہے۔ حوائج اصلیہ سے زائد ہونے کا اثر زکوٰۃ لینے پر پڑے گا۔

وکذا الکتب وان لم تکن لاھلہا اذا لم ینو التجارۃ غیر ان الاھل لہ اخذ الزکوٰۃ وان ساوت نصابًا۔ (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ ــــ نرخ کا تعین

سامان تجارت میں نرخ کے تعین میں اپنی لاگت کا اعتبار نہیں بلکہ بازار بھاؤ کا اعتبار ہوگا اس لیے اگر نرخ کم ہوگیا اور لاگت اعتبار کیا جائے تو مالک کا ضرور نقصان ہے اور اگر نرخ بڑھ گیا تو لاگت کا اعتبار کرنے میں لازم آتا ہے کہ صرف راس المال کی زکوٰۃ ادا کرے جب کہ راس المال اور نفع دونوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہے تو کس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

امام صاحبؒ کے بیان کے مطابق حولان حول کے وقت کا اور صاحبینؒ کے بیان کے مطابق جس دن زکوٰۃ ادا کرے گا اس دن کے نرخ کا اعتبار ہوگا۔

وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء بالاجماع۔ (۲)

نرخ میں تھوک کا اعتبار ہوگا یا پھٹکر کا ؟

انفع للفقراء کا اعتبار کیا جائے جیسا کہ نصاب کے سلسلے میں فقہاء نے اعتبار کیا ہے یا جس طرح کی تجارت کرتا ہے، اگر تھوک فروش ہے تو تھوک کی قیمت کا اعتبار کرے اور اگر پھٹکر فروش ہے تو پھٹکر کا اعتبار کرے مگر نقد قیمت کا اعتبار ہوگا ادھار قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

(۳) بونڈز دین قوی کے قبیل سے ہے اس لیے سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شیئرز کے سلسلے میں لکھا جاچکا ہے کہ تجارتی کمپنیاں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، بعض میں پورا حصہ مال

---

(۱) شامی ۲/ (۲) شامی ۲/۲۲

نامی ہوتا ہے بعض میں کچھ مال غیرنامی کی شکل میں ہوتا ہے اور کچھ نامی شکل میں جو نامی ہے اسی پر زکوٰۃ ہے اور غیرنامی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے حصص بنفسہ نامی نہیں ہیں، ہاں اگر حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدتا ہے تو خود حصص مال تجارت ہوں گے، ورنہ مال تجارت کے قبیل سے نہیں ہوں گے۔

پورے حصص یا حصص کے کچھ حصہ پر زکوٰۃ

حنفیہ کے اصول کے مطابق اس کے حصہ میں جتنا حصہ کمپنی کے غیرنامی اثاثوں میں صرف ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جتنا حصہ نقد رقم یا مال تجارت کی شکل میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اگر اس نے حصص کو خرید و فروخت کی غرض سے خریدا ہے تو کل حصہ مال تجارت ہو گیا ایسی صورت میں کل حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

نصاب زکوٰۃ

زکوٰۃ کے وجوب کے لیے مال نامی اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ مقدار نصاب کا مالک ہونا بھی ہے تاکہ زکوٰۃ نکالنے پر مالک کو کسی طرح کا ضرر و نقصان نہ ہو جو قابل اعتبار ہو، سونے چاندی دونوں کو جب شریعت نے معیار قرار دیا ہے تو خواہ مخواہ کسی ایک کو قرار دینا بے دلیل ہوگا۔ تفاوت کی صورت میں اموال زکوٰۃ کی قیمت میں چاندی کے نرخ کا اعتبار کیا جائے یا سونے کا یہ مسئلہ روح شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء نے بہت پہلے طے کر دیا ہے۔

تقوم السلع اذا حال الحول بالالاحظ من عين او ورق ولا يعتبر ما اشتريت به يعني اذا حال الحول على العروض وقيمتها بالفضة دون النصاب وبالذهب يبلغ نصابا قومنا بالذهب لتجب الزكوٰة فيها ولهذا قال ابوحنيفة (ملتقى ۳۲/۱)

ولو بلغ احدهما نصابا دون الاخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحدهما نصابا دون الأخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ احدهما نصابا خمسا و بالآخر اقل قومه بالانفع للفقير۔ سراج شامی ۲/۱۔

مہتمم مدرسہ کی حیثیت

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا بھی وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ کا بھی جس کی وجہ سے زکوٰۃ دینے والوں نے سفراء کو زکوٰۃ دی اس کی زکوٰۃ ادا ہوگئی، جیسے حکومت اسلامی کے مصدق و ساعی کو زکوٰۃ دیتے ہی زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے اس لیے کہ امیر المومنین اور اس کے واسطے عاملین مستحقین زکوٰۃ کے وکیل ہیں، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوریؒ نے حضرت مولانا تھانویؒ کو اسی طرح کا جواب لکھا تھا جس پر وہ بھی مطمئن ہو گئے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے بھی اسی طرح لکھا ہے کہ مہتمم مدرسہ کا قیم و نائب جملہ طلبہ ہوتے ہیں جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے، پس جو شئی مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ طلبہ کا قبضہ ہے اسی کے قبضہ سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کی ہوگئی، اگرچہ وہ مجہول الکیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے۔

طلبہ پر فیس مقرر کرنا اور اس کو مد زکوٰۃ سے ادا کرنا

طلبہ پر کمرہ کا کرایہ، تعلیمی فیس، بجلی کی اجرت اور طعام کی قیمت مقرر کر کے ان کے ذمہ اس کو لازم کرنا درست ہے اور جب طلبہ مدیون ہو جائیں تو ان کے دین کو مد زکوٰۃ سے ادا کرنا بایں طور کہ ان کو مد زکوٰۃ سے مقررہ روپیہ دیا جائے اور وہ مدرسہ میں داخل کریں، صحیح اور درست ہے اور بہت سے مدارس میں اس طرح کا نظم پایا جاتا ہے، البتہ مہتمم مدرسہ اور خود بدون طلبہ کے وکیل بنائے ہوئے ادا کرے گا تو وہ زکوٰۃ ادا نہ ہوگی بلکہ طلبہ باقاعدہ مہتمم مدرسہ کو وکیل بنائیں کہ آپ ہماری طرف سے ہمارا مقررہ وظیفہ وصول کر کے ہمارے دین میں محسوب کر لیں تو صحیح ہوگا۔

نوٹ: ابتداء میں مہتمم مدرسہ کو مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کیا گیا ہے، مگر اس میں کسی طالب علم کا تعین نہیں ہے اس لیے اس وکالت کی بنا پر طلبہ پر مدرسہ کا کوئی متعین حق ثابت نہیں ہوتا ہے ہاں جب مدرسہ باقاعدہ طلبہ کا وظیفہ مقرر کرے اس وقت لڑکوں کو استحقاق حاصل ہوگا، اس لیے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لیے طلبہ باقاعدہ وکیل بنائیں اس لیے اس وکالت کی بنیاد پر طلبہ کا وظیفہ بہ مد زکوٰۃ مقرر کرے تو اس وقت میں زکوٰۃ کا استحقاق ہوگا، اس لیے اس کو وصول کر کے ان کے دین میں محسوب کرنے کے لیے باقاعدہ وکیل بنانا ضروری ہوگا۔

سفراء مدارس کو مد زکوٰۃ سے تنخواہ دینا

جب مہتمم مدرسہ کو مثل امیر مستحقین زکوٰۃ کا وکیل تسلیم کر لیا گیا تو محصلین و سفراء عاملین میں داخل ہو جائیں گے اور ان کو ان کی کارکردگی کے مطابق مد زکوٰۃ سے بطور عمالہ دیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان کی وصول کردہ زکوٰۃ میں سے نصف سے زائد دینا جائز نہ ہوگا اور جب یہ بطور اجارہ نہیں ہے بطور عمالہ ہے تو کمیشن بھی صحیح ہوگا۔

فیعطی بقدر عمله مایکفیه واعوانه بالوسط لکن لایزاد علی نصف مایقبضه۔ (۱)

حساب لکھنے والوں کو ان کی کارکردگی کے بہ قدر مد زکوٰۃ سے دیا جا سکتا ہے اس لیے کہ وہ بھی عاملین کے حکم میں ہیں۔

فی سبیل اللہ سے مراد

لغت کے اعتبار سے فی سبیل اللہ کا ہر نیک کام پر ہوتا ہے مگر عرف شرع میں عام طور پر جہاد پر اطلاق ہوتا ہے۔ ابن اثیرؒ نے ذکر کیا ہے:

السبیل فی الاصل الطریق وسبیل اللہ عام علی کل عمل خالص سلك به طریق التقرب إلی اللہ عزوجل باداء الفرائض والنوافل وانواع التطوعات واذا اطلق فهو علی الغالب واقع علی الجهاد حتی صار لکثرة الاستعمال کانه مقصور علیه۔

اور ائمہ اربعہ نے مصارف زکوٰۃ میں جہاد ہی مراد لیا ہے اور حدیث لاتحل الصدقة لغنی إلا لخمسة لغاز فی سبیل اللہ میں بھی غازی کے ساتھ مقید کر دیا گیا ہے۔

غازی میں عند الاحناف فقر کی شرط ہے مگر صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ مالدار مجاہد جب مقیم ہے اس وقت اس کو سواری اسامان سفر و آلات جنگ کی ضرورت نہیں ہے مگر جب جہاد کا ارادہ کرے گا

---

(۱) شامی ۵۹/

تو اس کو ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی، اس کی ضرورت کو مد زکوٰۃ سے پورا کیا جائے گا۔

أما استثناء الغازي فمحمول على حال حدوث الحاجة وسماه غنيا على اعتبار ما كان قبل حدوث الحاجة وهو أن يكون غنيا ثم تحدث له الحاجة بأن كان له دار يسكنها ومتاع يمتهنه وثياب يلبسها وله مع ذلك فضل مائتي درهم حتى لا تحل له الصدقة ثم يعزم على الخروج في سفر غزو فيحتاج إلى آلة سفر وسلاح يستعمله في غزوه ومركب يغزو عليه ما يستعين به في حاجته التي تحدث له في سفره وهو في مقامه غني الخ۔[1]

دیگر ائمہ یہ بھی کہتے ہیں اگر فرق ہے تو اس بات میں کہ اس کے عیال کا نفقہ بھی مد زکوٰۃ سے ادا کیا جائے یا نہیں:

قال النووي في الروضة هل يعطى جميع المؤنة أم ما زاد بسبب السفر وجهان قال النووي في بعض شروح المفتاح انه يعطى الغازي نفقته ونفقة عياله وسكت الجمهور عن نفقة العيال لكن اعطاؤها ليس ببعيد۔

انما الصدقات کا حصر

اس میں حصر حقیقی ہے۔ یہاں پر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تعمیم صحیح نہیں ہے اس لیے کہ جن ضرورتوں کا سوال نامے میں ذکر کیا گیا ہے زمانۂ رسالت سے ائمہ کے دور تک اس طرح کی ضرورتیں پائی جاتی تھیں اس کے باوجود کہیں سے یہ ثابت نہیں ہے کہ ان ضرورتوں میں زکوٰۃ کی مد رقم کو خرچ کیا جائے۔ اسلام نے اس طرح کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے علاوہ دیگر صدقات کی ترغیب دی ہے ہم کو اسی پہلو پر زور دینا چاہیے۔

---

(۱) بدائع ۴۶

زکوٰۃ کے شرعی احکام

از:- مفتی حبیب الرحمٰن خیرآبادی دارالعلوم دیوبند

زکوٰۃ کے احکام سے متعلق سوالات پر مشتمل سوال نامہ کے جوابات اختصار کے ساتھ بالترتیب ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱)

شریعت اسلام میں ملک تام سے مراد وہ ملک ہے جس میں مالک کا قبضہ بھی ہو، لہٰذا وجوب زکوٰۃ میں اگر ان دونوں میں سے ایک چیز بھی مفقود ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو اور مال اب تک مشتری کے قبضہ میں نہ آیا ہو تو چونکہ قیمت کی ادائیگی کے بعد بائع اس قیمت کا مالک بن گیا اور اس پر قابض بھی ہو گیا اس لیے بائع کے ذمہ اس قیمت پر (نصاب وحولانِ حول کے بعد) زکوٰۃ واجب ہوگی اور مال چونکہ مشتری کے قبضہ میں نہیں آیا گو مشتری اس کا مالک ہے مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي ... تام صفة ملك خرج مال المكاتب أي خرج والتقييد به لأن المراد بالتام المملوك رقبة ويداً .... خرج به أيضاً كما في البحر ما اشتراه للتجارة قبل القبض والآبق بعد للتجارة" (شامی ۲/۲۳)

واطلق الملك فانصرف إلى الكامل وهو المملوك رقبة ويداً فلايجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض" (۱)

وفي الدرالمختار فرع عن سببه بقوله فلازكوٰة على مكاتب لعدم الملك التام ولافي كسب ماذون ولافي مرهون بعد قبضه ولا فيما اشتراه للتجارة قبل قبضه" (۲)

(۲)

کرایہ کی جو رقم پیشگی دی جاتی ہے اور فسخ یا مدت پوری ہونے کے بعد واپس کی جاتی ہے وہ رقم بطور وثیقہ کے رکھی جاتی ہے جس طرح پر شئی مرہون بطور وثیقہ رکھی جاتی ہے اور چوں کہ اس رقم پر ملک تام کسی کی نہیں ہے، کرایہ پر لینے والا اس رقم کا مالک تو ہے مگر اس کا اس پر قبضہ نہیں ہے اور کرایہ پر دینے والا اس رقم کا مالک نہیں، البتہ قبضہ ضرور ہے اس لیے اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"قوله (ولافي مرهون) أي لاعلى المرتهن لعدم ملك الرقبة ولاعلى الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لايزكي عن السنين الماضية وهومعنى قول الشارح بعد قبضه ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن ولوكان الرهن أزيد من الدين" (۳)

(۳)

مدارس اور اداروں میں جو رقم آتی ہے ارباب مدارس مثل عمال بیت المال کے معطین اور آخذین ہر دو کی طرف سے وکلا ہیں، مالک نہیں ہیں، لہٰذا مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم میں ملکیت نہ پائے جانے کی وجہ سے ان رقوم میں زکوٰۃ واجب نہیں نہ معطین کی طرف سے نہ آخذین کی طرف سے۔

"وسبب افتراضها ملك نصاب حولي تام" (۴)

---

(۱) بحرالرائق ۲/۲۰۳ (۲) درمختار ۲/۲۶۳ (۳) شامی ۲/۲۶۳ (۴) درمختار مع الشامی ۲/۲۶۹

(۴)

خالص مال حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں، کیوں کہ اس کا مالک معلوم ہونے کی صورت میں وہ مال الرد الی صاحب المال کے اصول کے پیش نظر واجب الرد ہے، اور اگر مالک معلوم نہیں تو کل مال واجب التصدق ہے، اور مال حرام جب مال حلال کے ساتھ خلط ہوجاتا ہے تو وہ مستہلک ہوجاتا ہے اور استہلاک سے مستہلک کے ذمہ دَین ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ دیکھا جائے گا اگر مال مخلوط میں سے بہ قدر مال حرام نکال کر نصاب تک پہونچتا ہے تو باقی مال پر یعنی نصاب تک پہنچنے والے اس مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بہ قدر نصاب نہیں بچتا ہے تو پھر اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

" ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكوٰة فيه ويورث عنه لأن الخلط استهلاك إذا لم يكن تمييزه عند أبي حنيفة وقوله أرفق اذ قلما يخلوا مال من غصب وهذا إذا كان له مال غيرما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه وإلا فلا زكوٰة كما لو كان الكل خبيثاً كما في النهر وفي فصل العاشر من التاتارخانيه عن فتاوى الحجة من ملك اموالاً غير طيبة او غصب أموالاً وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامناً و إن لم يكن له سواها نصاب فلا زكوٰة عليه فيها وان بلغت نصاباً لأنه مديون ومال المديون لا ينعقد سبباً للوجوب لوجوب الزكوٰة عندنا فأفاد بقوله وإن لم يكن له سواها نصاب الخ أن وجوب الزكوٰة مقيد بما إذا كان له نصاب سواها "[1]

(۵)

دَین کی وصولیابی کی امید نہ ہو تو اس دَین پر زکوٰۃ واجب نہیں اور اگر دَین کی وصول یابی کی امید ہو تو پھر دَین کے تین درجے ہوں گے۔ (۱) دَین قوی (۲) دَین متوسط (۳) دَین ضعیف

---

(۱) شامی ۲/۲۹۱

دَین قوی وہ ہے کہلاتا ہے جو مالِ تجارت یا سونے چاندی کے بدلے میں کسی کے ذمہ واجب ہوا ہو۔ اور متوسط وہ دَین ہے جو مال ہی کے بدلے میں واجب ہوا ہو مگر وہ مالِ تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو بلکہ ان کے علاوہ کوئی اور سامان ہو۔ اور دَین ضعیف وہ دَین کہلاتا ہے جو کسی مال کے بدلے میں مدیون کے ذمہ واجب نہ ہوا ہو، جیسے دَینِ مہر، بدلِ خلع، میراث، وصیت وغیرہ۔

ان تینوں دیون کا حکم یہ ہے کہ دَین قوی اگر بقدر نصاب ہے اور چالیس درہم پر اس کا قبضہ ہو جائے تو اس میں ایامِ ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ اور دین ضعیف پر ایامِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ قبضہ ہونے کے بعد حسبِ ضابطہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔ رہا دین متوسط کا حکم تو حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے نزدیک دَینِ متوسط میں اصح روایت کے مطابق ایامِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ وصول ہونے کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، بشرطیکہ وہ بقدر نصاب ہو۔

اگر مدیون کے ذمہ ایسا دین ہے جس کا طالب بندہ ہے جیسے قرض، نذر، زکوٰۃ، مالِ خراج، دَینِ مہر وغیرہ تو مدیون کے اتنے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں جتنا مال اس کے ذمہ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر اس سے زائد مال بقدر نصاب موجود ہو تو اس پر حسبِ ضابطۂ شرعیہ زکوٰۃ واجب ہوگی، مدیون قرض کی ادائے گی پر قدرت کے باوجود اگر قرض ادا نہ کرے تو وہ مال مدیون کے ذمہ دَین ہی میں مشغول سمجھا جائے گا اور اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، البتہ اگر اس مشغول فی دار الدین مال کو تجارت میں لگائے اور اتنا نفع ہو کر دین کی ادائگی کے بعد بقدر نصاب مال، مدیون کے پاس بچتا ہو تو اس پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"واعلم أن الديون عند الامام ثلثة: قوی و متوسط و ضعيف فتجب زكوتها إذا تم نصابا وحال الحول لكن لا فورًا بل عند قبض اربعين درهما يلزم درهم وعند قبض مأتين منه لغيرها أی من بدل لغير تجارة وهو المتوسط وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده أی بعد القبض من دين ضعيف -(۱)

فلو كان له نصاب حال عليه حولان ولم يزكه فيهما لا زكوٰة عليه فى الحول الثانى(۲)

---

(۱) شامی، نعمانیہ ۲/۳۵، ۳۶ (۲) شامی مطبوعہ پاکستان ۲/۳۶

پراویڈنٹ فنڈ جو حکومت کے ذمہ واجب الاداء ہے، ملازم اس رقم کا صرف استحقاق رکھتا ہے، اس رقم پر مالک وقابض نہیں ہوا ہے، اس رقم کو نہ تو دین قوی بنایا جا سکتا ہے، نہ دین متوسط بلکہ یہ دَین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں بلکہ قبضہ میں آنے کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، لہٰذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا بھی یہی حکم ہوگا۔

"ویشترط أن یتمکن من الاستنماء بکون المال فی یدہ أو ید نائبہ فإن لم یتمکن من الاستنماء فلا زکوٰۃ علیہ وذلک مثل مال الضمار وھو کل ما بقی أصلہ فی ملکہ ولکن زال من یدہ زوالا لا یرجیٰ عودہ فی الغالب ومن مال الضمار الدین المجحود والمغصوب اذا لم یکن علیہا بینۃ " (۱)

وجملۃ الأحکام فی الدیون أنہا علی ثلث مراتب فی قول أبی حنیفۃ دین قوی ودین ضعیف ودین متوسط کذا قال عامۃ المشائخ اما القوی فھو الذی وجب بدلاً عن مال التجارۃ کثمن عرض التجارۃ من ثیاب التجارۃ وعبید التجارۃ ولا خلاف فی وجوب الزکوٰۃ فیہ إلا أنہ لا یخاطب بإداء شئ من زکوٰۃ ما مضیٰ مالم یقبض اربعین درھماً وأما الدین الضعیف فھو الذی وجب بدلاً عن شئ سواء وجب لہ بغیر صنعہ کالمیراث أو بصنعہ کما یوصیۃ أو وجب بدلاً عما لیس بمال کالمھر وبدل الخلع والصلح من قصاص وبدل الکتابۃ ولا زکوٰۃ فیہ مالم یقبض کلہ ویحول علیہا الحول بعد القبض. وأما الدین الوسط فما وجب لہ بدلاً من مال لیس للتجارۃ کثمن عبد الخدمۃ وثمن ثیاب

---

(۱) عالمگیری (۱۷۴/۱)

البدلة والسنة وفيه روايتان عنه ذكر في الاصل أنه تجب فيه الزكوة قبل القبض لكن لايخاطب بالاداء مالم يقبض مأتي درهم فاذا قبض مأتي درهم زكیٰ لما مضى و روى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة أنه لازكوٰة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو أصح الروايتين منه"[1]

فارغ عن دين له مطالب من جملة العباد سواء كان لله كزكوٰة وخراج ولوكفالة أو مؤجلا ولو صداق زوجة المؤجل للفراق الخ ۔ (۲)

وفي الشامي قوله كزكوٰة فلوكان له نصاب حال عليه حولان ولم يزكه فيهما لازكوٰة عليه في الحول الثاني" (۳)

(۷)

حقیقتِ نما اور اس کی قسمیں

نما کی حقیقت یہ ہے کہ مال ایسی حیثیت میں ہو کہ اس میں بڑھوتری اور زیادتی ہو سکے خواہ وہ حقیقی ہو، جیسے توالد و تناسل و تجارت ۔ یا تقدیری ہو، جیسے مالک کو اس مال کے بڑھانے کی قدرت ہو خواہ وہ مالک کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نائب کے قبضہ میں رہ کر ہو یا نمو خلقی ہو، جیسے سونا چاندی، اس میں چاہے تجارت کی نیت کرے یا نہ کرے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، یا نمو فعلی ہو یعنی سونا چاندی کے علاوہ دیگر سامان، اگر اس میں تجارت و اسامت اور عملاً ان چیزوں میں تجارت کی ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے، خواہ ان چیزوں میں تجارت کی نیت صراحۃً یا دلالۃً ہو۔

"ومنها كون النصاب ناميا حقيقة بالتوالد والتناسل والتجارة أو تقديرا بأن يتمكن من الاستنماء بكون المال في يده

---

(۱) بدائع ۱۰/۲ (۲) درمختار (۳) شامی ۲۶/۲

أو في يد نائبه وينقسم كل واحد منهما إلى قسمين خلقي وفعلي فالخلقي الذهب والفضة لأنهما لا يصلحان للانتفاع بأعيانهما في دفع الحوائج الأصلية فتجب الزكوٰة فيهما نوى التجارة أو لم ينو أصلاً أو نوى النفقة والفعلي ما سواهما ويكون الاستنماء فيه بنية التجارة والإسامة ونية التجارة والإسامة لاتعتبر مالم تتصل بفعل التجارة أو الإسامة بقرينة أن يكون المملوك للتجارة سواء كان ذلك العقد شراءً أو إجارة وسواء كان ذلك الثمن من النقود والعروض وأما الدلالة أن يشتري عيناً من الأعيان بعروض التجارة أو يواجر التي للتجارة بعرض من العروض فتصير للتجارة وإن لم ينو التجارة صريحاً"(۱)

(۸)

حاجتِ اصلیہ

حاجتِ اصلیہ سے مراد وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعہ انسان اپنی جان کو ہلاکت اور بے عزتی سے محفوظ رکھ سکے، نان ونفقہ، رہائش کے لیے مکان، جنگ کے سامان، سردی گرمی سے حفاظت کے لیے کپڑے، یہ حاجت اصلیہ حقیقی ہے، اس کے علاوہ دین حاجت تقدیری میں داخل ہے، کیوں کہ مدیون اپنی جان دائن کے ہاتھ سے بچانے کے لیے اس کی ادائے گی کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح آلات حرفت، متاع بیت، سواری کا جانور، علماء کے لیے کتابیں یہ چیزیں بھی حاجت اصلیہ میں داخل ہیں، لہٰذا اگر صاحب مال کے پاس اپنی حاجت اصلیہ کو پورا کرنے کے بعد اتنا مال بچا ہو جو بہ قدر نصاب ہو تو سال گزرنے کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"وفارغ عن حاجته الأصلية لأن المشغول بها كالمعدوم وفسره ابن ملك بما يدفع عنه الهلاك تحقيقاً كثيابه أو تقديراً كدينه"(۲)

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۰۳ (۲) درمختار

قوله وهو ما يدفع الهلاك عن الإنسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج إليها لدفع الحر والبرد أو تقديرا كالدين فإن المديون محتاج إلى قضائه بما في يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فإن الجهل عندهم كالهلاك فإذا كان له دراهم مستحقة بصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة (۱)

جب حاجت اصلیہ میں یہ بات اصل قرار پائی کہ انسان جس سے بآسانی اپنی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کر سکے تو ہر دور اور ہر ماحول میں اپنی جان و عزت کی حفاظت کے لیے جتنی مالیت کی حاجت ہو وہ حاجت اصلیہ میں داخل ہوگی۔

(۹)

حکومت کی طرف سے جو قرض ملتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے کئی سال کی لمبی مہلت ملتی ہے، اور سالانہ ایک متعین مقدار قرض کی ادائیگی اس کے ذمہ رہتی ہے تو ان صورتوں میں اس کے اموال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے مدیون کے ذمہ پورا قرض منہا کرنے کے بعد اگر بقدر نصاب مال بچتا ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، سالانہ واجب الادا قسط وضع کرنے کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ فقہی عبارات سے یہی سمجھ میں آتا ہے۔

"وسببه أي سبب افتراضها ملك نصاب حولي تام فارغ عن دين له مطالب من جهة العباد" (۲)

(۱۰)

اگر کسی کی مجموعی مالیت بقدر نصاب ہو جائے اور شرکاء کی تعداد کے اعتبار سے تقسیم کرنے کے بعد کسی شریک کے حصہ میں بقدر نصاب مال نہ ہو تو اس رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ اگر تقسیم کے

---

(۱) شامی ۲/۱۲ (۲) شامی ۲/۴

کے بعد ہر شریک کے حصہ میں یا بعض شریک کے حصہ میں اتنا مال آتا ہو جو بقدر نصاب ہو تو ان شرکاء کے ذمہ اپنے اپنے حصوں میں زکوٰۃ واجب ہوگی، غرض کہ زکوٰۃ کے وجوب میں کمپنی کی عمومی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر شریک کے انفرادی حصے کا اعتبار ہوگا۔

"ولا تجب الزكوٰة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة ۔ (۱)

قوله (في نصاب مشترك) المراد ان يكون بلوغه النصاب بسبب الاشتراك وضم احد المالين إلى الآخر بحيث لا يبلغ مال كل منهما بانفراده نصابا و قوله وان تعدد النصاب الخ أي بحيث يبلغ قبل الضم مال كل واحد بانفراده نصابا فانه يجب حينئذ على كل منهما زكوٰة نصابه "(۲)

(۱۱)

جو حضرات سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کرتے ہیں اگر خریدتے وقت دل میں یہ نیت ہو کہ آئندہ کبھی اس کو بیچ کر روپے حاصل کر لیں گے تو وہ مال تجارت میں شمار ہو کر اس کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور واقعہ یہی ہے کہ سرمایہ بنانے کی نیت سے ہیرے جواہرات جو شخص خریدتا ہے لازمی نیت اس کی یہی ہوتی ہے کہ وہ آئندہ فروخت کرے گا، صرف ہیرے جواہرات جمع کرنے کی نیت سے نہیں رکھتا ہے، البتہ اگر کوئی محض جمع کرنے کی نیت سے خریدے، آئندہ انہیں فروخت کرنے کی کہیں دور تک بھی نیت نہ ہو یا یہ نیت ہو کہ آئندہ اگر کوئی مصلحت یا نفع سمجھوں تو فروخت کر دوں گا ورنہ اسے گھر میں جمع رکھیں گے۔ خواہ وہ کتنی بھی مالیت کے ہوں، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اور خواتین تزئین کے لیے جو ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں اس میں حقیقۃً نمو ہے نہ دلالۃً اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

"ولا زكوٰة في الجواهر واللآلي إلا ان يتملكها بنية التجارة كسائر

---

(۱) درمختار (۲) شامی ۲/۲۲ حاشیہ

لعروض التجارة؛ قوله ولا زكاة في الجواهر الخ قال في البدائع الأصل

أن ما عدا الحجرين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة بشرط مقارنتها لعقد التجارة

فلو نوى التجارة بعد العقد أو اشترى شيئاً للقنية ناوياً أنه إن وجد

ربحاً باعه لا زكاة عليه (۱)

(۱۲)

جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے سالانہ زکوٰۃ نکالتے وقت اس کی مالیت کا تعین اس نرخ سے ہوگا جو زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں ہوگا یعنی جس قدر نفع یا نقصان کے ساتھ بازار میں وہ سامان بک رہا ہو اسی نفع یا نقصان کے ساتھ نرخ کا تعین کیا جائے گا۔ بازار کا بھاؤ خرید کی قیمت سے زیادہ ہو یا کم۔

"وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الأداء ويقوم

في البلد الذي المال فيه (۲)

وفي الصحيح يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح (۳)

جو لوگ اراضی کی خرید و فروخت کو ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں چونکہ خریدتے وقت ان کی نیت تجارت ہوتی ہے اس لیے وہ اراضی بھی اموال تجارت میں داخل ہوں گی اور ان کا حکم بھی یہی ہوگا یعنی ان اراضی پر بازاری قیمت کا حساب کرتے ہوئے ان کی مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۱۳)

اگر شیئرز کی قیمت نصاب کے بقدر یعنی ۵۲ ½ تولہ چاندی کی قیمت کے برابر پہنچ جائے، یا شیئرز کے علاوہ دیگر نقد روپیہ یا مال تجارت مل کر شیئرز ہولڈر صاحب نصاب بن جائے تو اس کے ذمہ شیئرز پر زکوٰۃ واجب ہے، جس طرح اس کے منافع پر زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ شیئرز کی قیمت میں چونکہ کمپنی کی مشینری، مکانات، فرنیچر وغیرہ کی مالیت بھی شامل ہوتی ہے اور در حقیقت ان چیزوں میں زکوٰۃ واجب

(۱) فتح القدير على هامش [illegible]

(۲) شامی [illegible] حوالہ مذکورہ ایضاً۔

نہیں) اس لیے شیرز کی زکوٰۃ نکالتے وقت کمپنی سے دریافت کرلیا جائے کہ جس قدر رقم شیرز کی مشینری وغیرہ اور فرنیچر وغیرہ میں لگی ہوئی ہے شیر ہولڈر اتنی قیمت شیرز کی کم کرکے زکوٰۃ نکالے، زکوٰۃ دیتے وقت شیرز کی جو قیمت ہوگی وہی نکالی جائے گی۔

"کالدراهم والدنانیر لتعینهما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزکوٰة کیف ما امسکهما" (۱)

(۱۴)

فقہاء کرام نے چاندی کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، لہٰذا ۵۲ ½ تولے چاندی کی قیمت کے برابر کسی کے پاس مال ہو تو اس کو غنی قرار دیا جائے گا، اس کو زکوٰۃ لینا جائز نہ ہوگا اور اس مال پر سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہاء کی تصریح کے پیش نظر اگر سونے چاندی کا نرخ برابر ہو تو کسی ایک کے نرخ کو اصل قرار دیا جائے گا، اگر دونوں میں سے کسی ایک کے نرخ سے مال نصاب تک پہونچ جاتا ہے تو اسی کا اعتبار ہوگا، غرض جس میں فقراء کا نفع ہو اس کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

"فی عروض التجارة قیمتہ نصاب من ذهب أو ورق أی فضة مضروبة فأفاد أن التقویم انما یکون بالمسکوک عملا بالعرف مقوما بأحدهما ان استویا فلو أحدهما أروج تعین التقویم به ولو بلغ بأحدهما نصابا دون الأخر تعین ما یبلغ به ولو بلغ بأحدهما نصابا وخمسا بالأخر اقل قومه بالأنفع للفقیر" (۲)

(۱۵)

اگر مدرسہ والے ہر طالب علم کو ماہانہ جو خرچہ پڑتا ہے مثلاً ۲۵۰ روپے، وہ مد زکوٰۃ سے مستحقین زکوٰۃ طلبہ کو دے دیں اور ان کو یہ سمجھا دیں کہ تم پر ماہانہ ۲۵۰ روپے خرچ پڑتا ہے، تم کو نقدی شکل میں دیا جاتا ہے تم اس رقم کے مالک ہو، تم اپنے اختیار سے مدرسہ کے مطبخ میں جاکر اپنے کھانے کا وظیفہ جمع کردو یا کسی اور دفتر میں جمع کردو، طلبہ اس رقم کے مالک بننے کے بعد مدرسہ میں جاکر وہ رقم جمع کردیں تو یہ صورت

---

(۱) شامی ۱۴/۲ (۲) شامی ۲۹۹/۲

زکوٰۃ کے چند اہم مسائل

از: مولانا محمد طیب الرحمٰن صاحب امیر شریعت شمال مشرق ہند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

دوسری ہجری میں فرضیت رمضان کے قبل زکوٰۃ فرض کیا گیا، قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ۳۲ جگہ میں نماز کے ساتھ ملاکر زکوٰۃ کا ذکر کیا ہے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ نے بے شمار احادیث میں زکوٰۃ ادا کرنے کی تاکید کی ہیں جس سے زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت ثابت ہورہی ہے اس لیے زکوٰۃ کے مسائل کے بارے میں واقفیت حاصل کرنے کی شدید ضرورت ہے، خاص طور پر جن دقیق مسائل کے بارے میں سوال نامہ تیار کرتے ہوئے فقیہ عصر قاضی شریعت حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب نے ارسال کیا ہے ان کی تحقیق کرنا نہایت ہی ضروری ہے کیوں کہ دور حاضر میں یہ مسائل کثیر الوقوع ہیں زمانہ کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے سوال نامہ تیار کرنے کی وجہ سے مفکر زماں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی صاحب یقیناً قابل مبارک باد ہیں۔

محور اول

زکوٰۃ تین قسم کے اموال میں واجب ہوتی ہے،

(۱) نقود (۲) سوائم (۳) اموال تجارت

" اعلم ان الزکوٰۃ لاتجب الا فی نصاب تام ۔اھ (شرح الوقایۃ ۱/۲۱۶)

وفي عمدة الرعاية: حاصله ان الزكوٰة لاتجب في مال وان بلغ مقدار النصاب وحال عليه الحول ايضاً الا اذا وجد ثلثة اشياء احدها الثمنية اه وثانيها السوم اه وثالثها التجارة، اوفيما عداها اذا كانت بنية التجارة تجب فيه الزكوٰة والا لا" (١)

وجوب زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق اموال سے ہے ان میں پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے مراد مملوک بہ اعتبار ملک اور قبض ہے۔ لما فی الجوہرۃ النیرۃ:

"لان الملك التام ما اجتمع فيه الملك واليد" (٢)

وفي رد المحتار: "لان المراد بالتام المملوك رقبة ويداً" (٣)

وفي بدائع الصنائع: ومنها الملك المطلق وهو ان يكون مملوكاً له رقبة ويداً وهذا قول اصحابنا الثلاثة الخ (٤)

(١) کسی مال پر زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام یعنی ملک اور قبض شرط ہے۔ بنا بریں مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس پر مشتری کا ملک بھی نہیں ہے اور قبض بھی نہیں ہے۔ البتہ وہ مال جو مشتری کے ملک میں آ چکا ہے لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ بعض کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بہ سبب ملک ناقص کے اور صحیح قول یہ ہے کہ زکوٰۃ واجب ہوگی البتہ وجوب ادا قبض کے بعد ہوگا دین قوی کی طرح۔ وصول کے بعد ایام ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

لما فی فتاوی عالمگیریؒ: "واما المبيع قبل القبض فقيل لايكون نصاباً والصحيح انه يكون نصاباً كذا في محيط السرخسي."

---

(١) عمدة الرعاية ٢١٨/١ (٢) الجوهرة النيرة ١٣٢/١ (٣) رد المحتار ٥/٢

(٤) بدائع الصنائع ٩/٢ (٥) فتاوىٰ عالمگیری ١٧١/١

فی البحر[1]: وقدمنا ان المبیع قبل القبض لاتجب زکوٰته علی المشتری وذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض قیل لایکون نصابا لان الملک فیہ ناقص بافتقاد الید والصحیح انہ یکون نصابا لانہ عوض عن مال کانت ید ہ ثابتۃ علیہ وقد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعا اھ فعلیٰ ھذا قولھم لاتجب الزکوٰۃ معناہ قبل قبضہ واما بعد قبضہ فتجب زکوٰتہ فیما مضی کالدین القوی وفی شرح النقایۃ[2] (مالک ملکا تاما) ای رقبۃ ویدا فلاتجب علی المشتری فی مال اشتراہ قبل القبض للتجارۃ الخ۔

(۲) کرایہ دار مالک مکان کو کرایہ کی مد میں جو پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دیتا ہے جس کو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کرنا پڑتا ہے ایسی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ دینا ضرورت کی طرف نظر کرتے ہوئے بیع بالوفا پر قیاس کرکے جائز قرار دیا گیا ہے اور بیع بالوفا میں مشتری بائع کو جو قیمت ادا کرتا ہے اس قیمت میں بائع پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا مشتری پر اس میں ائمہ احناف کا اختلاف ہے۔ قول راجح یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی نہ کہ بائع پر اور مسئلہ مسئول عنہا میں کرایہ دار بمنزلہ مشتری ہے اور مالک مکان بمنزلہ بائع، بناء علیہ کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم یا ڈپوزٹ کی زکوٰۃ بھی قول راجح کی بنا پر کرایہ دار پر واجب ہوگی نہ کہ مالک مکان پر۔ لما فی رد المحتار[3]

"نعم یفتی بہ فیما دعت الیہ الحاجۃ وجرت بہ فی المدۃ المدیدۃ العادۃ وتعارفہ الاعیان بلانکیر کالخلو المتعارف کالحوانیت وھو ان یجعل الواقف او المتولی او المالک فی الحانوت قدرا معینا یؤخذ من الساکن الذی یثبت لہ الخلو لا اجارتہا

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۰۵ (۲) شرح النقایۃ ۱/۱۳۶ (۳) رد المحتار ۴/۲۲

لغيره سالم بيد فع اليه المبلغ المرقوم فيفتى بجواز ذلك قياساً على بيع الوفاء الذى تعارفه المتأخرون احتيالاً عن الربا حتى قال فى مجموع النوازل اتفق مشائخنا فى هذا الزمان على صحته بيعاً لاضطرار الناس إلى ذلك ومن القواعد الكلية اذا ضاق الامر اتسع حكمه فيندرج تحتها امثال ذلك مما دعت اليه الضرورة وفى رد المحتار[1]: قلت ينبغى لزومها على المشترى فقط على القول الذى عليه العمل الآن من ان بيع الوفاء منزل منزلة الرهن وعليه فيكون الثمن دينا على البائع تأمل. اھ

(۳) مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقوم جس کا کوئی مالک متعین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام شرط ہے اور مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم اموال موقوفہ کی طرح ہے اس کا کوئی مالک معین نہیں ہے اور اموال موقوفہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

لما فى الفقه على المذاهب الاربعة[2]: "ولا زكوٰة فى المال الموقوف"

(۴) مال حرام اگر مال حلال کے ساتھ مخلوط نہ ہوا ہو بلکہ وہ خالص مال حرام ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ اس پر اس کی ملکیت نہیں ہے بلکہ مال حرام کا مالک اگر معلوم ہے تو سارا مال مالک کو واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک معلوم نہ ہو تو فقراء اور مساکین پر صدقہ کرنا واجب ہے۔ مال حرام اگر مال حلال کے ساتھ مخلوط ہو جائے تو مال مخلوط سے مال حرام کی مقدار نکال کر اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو باقی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدر نصاب نہیں بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ حرام خلط سے مستہلک ہو جاتا ہے اور مقدار مال حرام مستہلک کے ذمہ دین ہو جاتا ہے۔ لما فى رد المحتار[3]:

(تحت قوله كما لو كان الكل خبيثاً) وفى القنية لو كان الخبيث نصابا

---

(۱) رد المحتار ۵/۲ (۲) الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۵۹۰ (۳) رد المحتار ۲/۲۹۹

لا یلزمه الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیه اھ وفی الدر المختار[1]
وفی القهستانی ولا زکوٰۃ فی المغصوب والمملوك شراءً فاسدًا الخ
والمراد مالم یخلطه بغیرہ لعدم الملك اھ وفی فتح القدیر[2] ولهذا
قالوا لوان سلطانا غصب مالا وخلطه صار ملكا له حتی وجبت علیه
الزکوٰۃ وورث عنه الخ وفی منحة الخالق علی البحر الرائق[3]
ومن ملك اموالا غیر طیبة او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط
ویصیر ضامنا وان لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰۃ علیه فی تلك
الاموال وان بلغت نصابا لانه مدیون ومال المدیون لا ینعقد سببا
لوجوب الزکوٰۃ عندنا وفی رد المحتار[4] وفی الفصل العاشر من
التتارخانیة عن فتاوی الحجة من ملك اموالا غیر طیبة اوغصب
اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنا وان لم یکن له سواها
نصاب فلا زکوٰۃ علیه فیها وان بلغت نصابا لانه مدیون ومال
المدیون لا ینعقد سببا لوجوب الزکوٰۃ عندنا اھ۔

(۵) دین کی زکوٰۃ فی الحال ادا کرنا دائن یا مدیون دونوں میں سے کسی پر واجب نہیں ہوتی۔ دائن پر اس لیے واجب نہیں ہوتی کہ اس کی ملک ہونے کے باوجود قبض نہیں ہے لہٰذا قبض کے قبل دائن کی ملک تام نہیں ہے اور مدیون پر اس لیے واجب نہیں ہوتی کہ مال اس کے قبض اور تصرف میں ہونے کے باوجود بھی اس پر اس کی ملک نہیں ہے۔ اگر مدیون کی ادائے گی کی قدرت کے باوجود ٹال مٹول کرے اور اس کو تجارت میں لگا کر استفادہ کرتے رہے تو بھی مدیون پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ اس پر مدیون کی ملک نہیں ہے اور زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام یعنی ملک اور قبض دونوں شرط ہے۔
وصولیابی کے اعتبار سے امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں۔

---

(۱) الدر المختار ۲/۹ (۲) فتح القدیر ۱/۲۰۲ (۳) بحر الرائق ۲/۲۲۱

(۴) رد المحتار ۲/۲۶

(۱) قوی (۲) متوسط (۳) ضعیف

(۱) دین قوی وہ دین ہے جو قرض یا مال تجارت کے بدلے بذمہ مدیون عائد ہوا ہو۔

(۲) دین متوسط وہ دین ہے جو نقد یا مال تجارت کے علاوہ دوسری کسی قسم کے مال کے بدلے بذمہ مدیون عائد ہوا ہو، جیسے لباس بذلہ خدمت کے غلہ رہنے کے گھر وغیرہ کی قیمت۔

(۳) دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی قسم کے مال کے بدلے میں بذمہ مدیون عائد نہیں ہوا ہو، جیسے دین مہر، وصیت وغیرہ۔

دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر اصل وقت سے ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے لیکن وجوب ادا اسی وقت ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کے مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس کے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا، لیکن وصول کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینا واجب ہوگا، دین ضعیف پر قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا۔ دین ضعیف پر قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا۔ دین متوسط کے بارے میں امام ابوحنیفہؒ کے دو قول ہیں، ایک قول کے مطابق دین متوسط کا حکم دین قوی کی طرح ہے مگر وجوب ادا چالیس درہم کی وصول یابی پر نہیں بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم کے وصول ہونے پر ہوگا اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دوسرے قول کے مطابق دین متوسط دین ضعیف کے حکم میں ہے یعنی وصول یابی کے بعد جب سال بھر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دینا واجب نہ ہوگا، دونوں قول کی جانب تصحیح بھی موجود ہے۔ البتہ صاحب بدائع الصنائع نے دین متوسط کو دین ضعیف کے حکم میں اعتبار کرتے ہوئے اسی کو اصح قرار دیا ہے؛

" نقول قسم ابوحنيفة الدين ثلاثة اقسام قوى وهو بدل القرض ومال التجارة - ومتوسط وهو بدل ماليس للتجارة كثمن البذلة وعبد الخدمة ودار السكنى وضعيف وهو بدل ماليس بمال كالمهر والوصية وغيره ففى القوى تجب الزكوٰة اذا حال الحول ويتراخى الاداء إلى ان يقبض اربعين درهما ففيها درهم وكذا فيما زاد فبحسابه وفى المتوسط لاتجب مالم يقبض نصابا وتعتبر "

الماضي من الحول في صحيح الرواية وفي الضعيف لاتجب مالم يقبض نصابا ويحول الحول بعد القبض عليه (١)

وفي الفقه على المذاهب الاربعة (٢) ويعتبر حولان الحول في الدين القوي من وقت ملك النصاب لا من وقت القبض فيجب اداء الزكوة بمجرد القبض بلا خلاف اما الدين المتوسط فانه لاتجب الزكوة الا اذا قبض منه نصابا فان كان الدين خمسمائة درهم مثلا و قبض مائتين وجب عليه ان يخرج خمسة دراهم ولا يجب عليه فيما دون ذلك كما تقدم والدين المتوسط مثل الدين القوي في حولان الحول عليه فيعتبر حوله بحسب الاصل لا من وقت القبض في الاصح واما الدين الضعيف فانه يجب اداء الزكوة فيه بقبض نصاب منه بشرط ان يحول عليه الحول من وقت القبض

وفي بدائع الصنائع (٣) واما الدين الوسط فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه الى قوله فروى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة رحمهم الله تعالى انه لا زكوة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه.

وفي المبسوط (٤) وروى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة رحمهم الله تعالى ان الدين نوعان وجعل الوسط كالضعيف وهو اختيار الكرخي على ما ذكر في المختصر

---

(١) فتح القدير ١/٢٢٢ (٢) الفقه على المذاهب الاربعة ١/٦٠٣

(٣) بدائع الصنائع ٢/١٠ (٤) المبسوط ٢/١٩٥

(۶) پراویڈنٹ فنڈ میں ملازم کی جو رقوم جمع کی جاتی ہیں خواہ وہ ملازم کی تنخواہ سے وضع کی ہوئی رقم ہو یا سرکار یا کمپنی کی طرف سے اضافہ کی ہوئی رقم ہو یا رقم انٹرسٹ ہو وہ بذمہ سرکار یا کمپنی قرض ہے، لہٰذا اس رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں، اس کے بارے میں حکم لگانے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دین کے اقسام ثلٰثہ میں سے کس قسم کا دین ہے۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ وہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے، اب دیکھنا چاہیے کہ خدمت کا معاوضہ یعنی اجرت مال ہے یا نہیں، پھر اگر مال ہو تو وہ مال تجارت کی منزل میں ہے یا مال غیر تجارت کی منزل میں امام ابو حنیفہؒ سے اجرت کے بارے میں تین روایات مذکور ہیں، ایک روایت میں اجرت کو مہر کے مانند قرار دیا گیا کیوں کہ وہ حقیقۃً مال کا بدل نہیں ہے بلکہ وہ منفعت کا بدل ہے اور منفعت حقیقۃً مال نہیں ہے۔ اس روایت کی بنا پر وہ دین ضعیف ہوگا۔ دوسری روایت میں منافع کو من وجہ مال اعتبار کرتے ہوئے اجرت کو ثمن ثیاب بذلہ کے مانند قرار دیا، اس روایت کی بنا پر وہ دین متوسط ہوگا، تیسری روایت میں بدل منفعت کو بدل عین کی منزل میں اعتبار کرتے ہوئے اجرت ہو عبد تجارت کو ثمن متاع تجارت کی منزل میں اعتبار کیا گیا اس روایت کی بنا پر اجرت عبد تجارت دین قوی کے قبیل سے ہوگا۔

پراویڈنٹ فنڈ کی رقم اجرت عبد تجارت نہیں ہے بلکہ وہ اجرت حر ہے لہٰذا یہ دین دین قوی نہیں ہو سکتا بلکہ وہ دین ضعیف ہوگا یا دین وسط ہوگا۔ دین متوسط ہونے کی تقدیر پر منافع کو مال کے قبیل سے شمار کرنا پڑتا ہے لہٰذا اس پر اشکال وارد ہوتا ہے کہ کتاب البیوع میں ائمہ احناف کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ منافع مال کے قبیل شمار کیا جائے تو ائمہ احناف کے قول میں باہم تعارض پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس کو دین ضعیف قرار دینا ہی راجح معلوم ہوتا ہے، علاوہ بریں اصح روایت کی بنا پر دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے جس کے متعلق ماقبل میں تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ دین قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوتی ہے، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بناءً علیہ پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ قبض ہونے کے بعد جب سال بھر گزر جائے اس وقت زکوٰۃ لازم ہوگی۔ لما فی المبسوط (۱۹۶)

وفی الاجرۃ ثلاث روایات من ابی حنیفۃ فی روایۃ جعلہا کالمہر لانہا لیست ببدل عن المال حقیقۃ لانہا بدل من المنفعۃ وفی روایۃ

تناسل اور تجارت کے ذریعہ جو زیادت حاصل ہوتی ہے اسے نما حقیقی کہتے ہیں، اور نما تقدیری مال کا مالک یا اس کے نائب کے ہاتھ میں ہونے کو کہتے ہیں جس سے تجارت وغیرہ کی قدرت حاصل ہوتی ہے۔

لما فی رد المحتار[1]: النماء فی اللغۃ الزیادۃ الزکوٰۃ الخ وفی الشرع هو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارۃ والتقدیری تمکنه من الزیادۃ بکون المال فی یدہ او ید نائبه (بحر)

تیسری شرط حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ ایسی حاجت اور ضرورت کو کہتے ہیں جس سے انسان اپنی ہلاکت کو دفع کرتا ہے، تحقیقاً ہو، جیسے کپڑا وغیرہ یا تقدیراً ہو، جیسے قرض وغیرہ اور حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے کیا جائے گا۔ لما فی الفقه علی المذاهب الاربعة[2]:

"ویعتبر فی الراحلة ما یلیق بالشخص عادۃ وعرفا ویختلف ذلك باختلاف احوال الناس" الخ

چوتھی شرط دَین سے محفوظ ہونا

کون سا دَین مانع زکوٰۃ ہے؟ ـــــ دین کی قسمیں اور ان کے احکام:

مانع وجوب زکوٰۃ ہونے اور نہ ہونے کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ دَین جو خالص بندہ کے لیے ہے اور بندوں کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا موجود ہے، جیسے قرض، ثمن، مبیع وغیرہ۔

(۲) وہ دَین جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے لیکن بندہ کی طرف سے اس کا طلب کرنے والا ہے، جیسے زکوٰۃ، خراج وغیرہ۔ اس کے لیے بندہ کی طرف سے طلب کرنے والا امام یا نائب امام ہے

---

(۱) رد المحتار ۲/۲ (۲) الفقه علی المذاهب الاربعة ۶۱۳/۱

جميعه ميون ثياب البذلة لان المنافع مال من وجه لكنه ليس بمحل لوجوب الزكوٰة فيه والاصح ان اجرة دار التجارة او عبد التجارة بمنزلة ثمن متاع التجارة كلما قبض منها اربعين تلزمه الزكوٰة اعتبارا لبدل المنفعة ببدل العين.[1]

وفي البحر الرائق[2] ولو اجر عبده او داره بنصاب ان لم يكونا للتجارة لا تجب ما لم يحل الحول بعد القبض في قوله وان كان للتجارة كان حكمه كالقوي لان اجرة مال التجارة كثمن مال التجارة في صحيح الرواية اھ۔

وفي منحة الخالق[3] وفي اجرة مال التجارة او عبد التجارة روايتان في رواية لا زكوٰة فيها حتى يقبض ويحول عليها الحول لان المنفعة ليست بمال حقيقة فصار كالمهر وفي ظاهر الرواية تجب الزكوٰة فيها ويجب الاداء اذا قبض منها مائتي درهم لانها بدل عن مال ليس بمحل لوجوب الزكوٰة فيه لان المنافع مال حقيقة لكنها ليس بمحل لوجوب الزكوٰة لانها لا تصح لانها لا تبقى سنة اھ قلت وهذا صريح في انه على الرواية الاولى من الدين الضعيف وعلى ظاهر الرواية من المتوسط لا من القوي لان المنافع ليست مال زكوٰة وان كانت مالا حقيقة فتأمل ثم رأيت في الولوالجية التصريح بان فيه ثلاث روايات۔

دوسری شرط نما

نما کے لغوی معنیٰ زیادت ہے، اس کی دو صورتیں ہیں، نما تحقیقی اور نما تقدیری، توالد و

---

(۱) التبیین ۱/۲۵۷ (۲) البحر الرائق ۲/۲۲۳ (۳) منحۃ الخالق ۲/۲۲۳

اور وہ اس طرح ہے کہ شروعِ اسلام سے حضرت عثمان غنی کے وقت تک زکوٰۃ امام المسلمین وصول کرتے تھے ان کے بعد کے دور سے ارباب اموال، اموالِ باطنہ کی طرف سے وکلاء کے طور پر ہیں۔

(۳) وہ دین جو خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور اس کا طلب کرنے والا بندوں کی طرف سے کوئی نہیں ہے اگرچہ قیامت میں ان کا مطالبہ ہوگا جیسے نذور، کفارات، حج وغیرہ۔ پہلے دو قسم کے دین مانع وجوب زکوٰۃ ہیں اور تیسری قسم دین مانع وجوب زکوٰۃ نہیں۔

اکثر ائمہ احناف کے نزدیک دین خالص للعباد معجّل ہو یا مؤجل دونوں صورتوں میں مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ بعض کے نزدیک دین خالص للعباد اگر مؤجل ہو جائے تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے بتایا کہ عورت کا مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے کیونکہ عادۃً اس کے لیے زوج کی طرف سے مطالبہ نہیں ہے اور بعض نے یہ بھی بتایا کہ زوج کے ہاتھ میں جو نقد موجود ہے اسے اگر دین مہر ادا کرنا مقصود ہو تو وہ مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا ورنہ نہیں۔ صاحب ردالمحتار نے صاحب معراج سے بیان کیا کہ امام ابوحنیفہؒ کے قول کے مطابق دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ اور قہستانی نے جواہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دین مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ نکلا کہ دین خالص للعباد کے بارے میں تین قول ہیں۔

(۱) معجّل اور مؤجل دونوں مانع زکوٰۃ ہے۔

(۲) معجّل مانع ہے مؤجل مانع نہیں ہے۔

(۳) اگر عزمِ ادا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

اور قہستانی نے جواہر سے ثانی قول کی ترجیح و تصحیح نقل کیا ہے نیز وجوب زکوٰۃ میں جو صورت انفع للفقراء ہے اس کی رعایت کرنے کے لیے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے اس لیے قول ثانی کو ترجیح دینا ہی ارجح ہے۔

سرکار اپنے شہریوں کو موجودہ دور میں طویل الاجل جو دین بصورت زراعتی قرض، صنعتی قرض، تعمیر مکان کے لیے قرض وغیرہ قرض دیتی ہے اور قسط وار ان کو ادا کرنا پڑتا ہے، وہ بھی دین خالص للعباد ہے۔ اور اس میں بھی مطالبہ صرف سالانہ واجب الادا قسط کا ہے اور مدیون کے ہاتھ میں جو نقد ہے اس سے صرف واجب الادا قسط کے علاوہ باقی رقم ادا کرنے کا عزم بھی نہیں ہوتا۔ بنا بریں ایسے طویل الاجل قرضوں میں

اموال زکوٰۃ سے سالانہ واجب الادا قسط وضع کرکے باقی اموال مقدار نصاب ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لما فی الفقہ علی المذاهب الاربعۃ[1]

الحنفیۃ قالوا ینقسم الدین بالنسبۃ لذلک الی ثلثۃ اقسام الاول ان یکون دینا خالصا للعباد۔ الثانی ان یکون دینا لله تعالیٰ ولکن لہ مطالب من جہۃ العباد کدین الزکوٰۃ والطالب ھو الامام فی الاموال الظاھرۃ وھی السوائم وما یخرج من الارض اونائب الامام فی الاموال الباطنۃ وھی الاموال التجارۃ کالذھب والفضۃ ونائب الامام ھم الملاک لان الامام کان یاخذھا الی زمان عثمان رضی الله عنہ ففوضھا عثمانؓ الی اربابھا فی الاموال الباطنۃ الثالث ان یکون دینا خالصا لله تعالیٰ لیس لہ مطالب من جہۃ العباد کدیون الله تعالیٰ الخالصۃ من نذور وکفارات وصدقۃ فطر ونفقۃ حج فالدین الذی یمنع وجوب الزکوٰۃ ھو دین القسمین الاولین الخ واما الثالث فانہ لا یمنع وجوب الزکوٰۃ۔

وفی بدائع الصنائع:[2] وعلی ھذا یخرج مہر المرأۃ فانہ یمنع وجوب الزکوٰۃ عندنا معجلا کان او مؤجلا لانہا اذا طالبتہ یؤخذ بہ وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا یمنع لانہ غیر مطالب بہ عادۃ فیمنع وقال بعضہم ان کان الزوج علی عزم من قضائہ یمنع وان لم یکن علی عزم القضاء لا یمنع لانہ لا یعدہ دینا وانما یؤخذ المرء بما عندہ من الاحکام۔

وفی الدر المختار:[3] فارغ عن دین لہ مطالب من جہۃ العباد سواء کان لله کزکوٰۃ وخراج اوللعبد ولو کفالۃ اومؤجلا ولو صداق زوجتہ

---

(١) الفقہ علی المذاهب الاربعۃ ١/٤٩٣ (٢) بدائع الصنائع ٢/٦ (٣) درمختار ٢/٥

المؤجل للفراق۔

وفی الدر المختار[1]: فعجلت قرضه أو مؤجلا مهره فی المعراج إلى شرح الطحاوی وقال وعن أبی حنیفة لا یمنع وقال الصدر الشهید لا روایة فیه ولكل من المنع وعدمه وجه زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع۔

وفی فتح القدیر[2] وهل یمنع الدین المؤجل كما یمنع المعجل فی طریقة الشهید لا روایة فیه ان قلنا لا فله وجه وان قلنا نعم فله وجه ولو كان علیه مهر لامرأته وهو لا یرید اداءه لا یجعل مانعا من الزكوة ذكره فی التحفة عن بعضهم ان كان مؤجلا لا یمنع لانه غیر مطالب به عادة انتهی وهذا یفید ان المراد المؤجل عرفا لا شرطا مصرحا به والا لم یصح قوله لانها متی طلبت اخذته ولا بانه غیر مطالب به عادة لان هذا فی المعجل لا المؤجل شرطا فلا معنی لتقییده عدم المطالبة فیه بالعادة۔

کمپنی پر زکوٰۃ

کوئی بھی کمپنی متعدد شرکاء سے سرمایہ حاصل کرتے ہوئے جو کاروبار کرتی ہے اس کاروبار کو چلانے کے لیے کمپنی عام طور پر سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت چلانے کے لیے ضروری اسباب مثلاً تعمیر مکان، آلات حرفت، بیع اراضی وغیرہ مختلف ایسی چیزوں کو خریدنے میں لگاتی ہے جن کی عین کو باقی رکھتے ہوئے نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے اور سرمایہ کے ایک حصہ کو تجارت میں لگا کر نفع حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ شرکاء اپنے اپنے حصے کے مطابق تجارت کے اموال، آمدنی، آلات حرفت وغیرہ کے مالک ہوتے ہیں

---

(۱) الدر المختار ٢/٦ (۲) فتح القدیر ٢/١٦١

وايضا فی رد المحتار[1]: (وان تعدد النصاب) اى بحيث يبلغ قبل الضم مال كل واحد بانفراده نصابا فانه يجب حينئذ على كل منهما زكوٰة نصابه۔

وفی العالمگيرية[2]: فان كان نصاب كل واحد منهما يبلغ نصابا وجبت الزكوٰة والا فلا سواء كانت شركتهما عنانا اومفاوضة اوشركة ملك بالارث وغيره من اسباب الملك۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی نیت سے کسی کی ملکیت میں ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، لہذا کوئی اگر اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کی غرض سے ہیرے اور جواہرات خرید کرکے بدون نیت تجارت کے محفوظ رکھے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، لما فی مراقی الفلاح[3]:

ولا زكوٰة فی الجواهر واللآلی الا ان يتملكها بنية التجارة كسائر العروض۔

وفی الطحاوی[4]: قال فی الدر الاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكی بنية التجارة عند العقد فلو نوى التجارة بعد العقد او اشترى شيئا للقنية ناويا انه ان وجد ربحا باعه لازكوٰة عليه۔

وفی الجوهرة[5]: واما اليواقيت واللآلی والجواهر فلا زكوٰة فيها وان كانت حليا الا ان تكون للتجارة۔

وفی الدر المختار[6]: لا زكوٰة فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفا اتفاقا

---

(۱) رد المحتار ۲/۲۱ (۲) العالمگيرية ۱/۱۸ (۳) مراقی الفلاح ۳۹۱

(۴) الطحاوی ۳۹۱ (۵) الجوهرة ۱۴۶ (۶) درمختار ۱۸/۲

الا ان تكون للتجارة والاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكى بنية التجارة إلى ان قال ولو نوى التجارة بعد العقد او اشترى شيئًا للقنية ناويا انه ان وجد ربحا باعه لا زكوٰة عليه۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے تاجر اگر اس مال کی زکوٰۃ نقد روپیہ سے ادا کرنا چاہے تو اس کی قیمت متعین کرنے کے وقت اگر جزی لاگت کے حساب سے یا تھوک کے بھاؤ سے متعین کیا جاوے تو اس میں فقراء کی رعایت نہ ہوگی، حالانکہ عند الشرع وہ مطلوب ہے لہٰذا اس کی وہ قیمت معتبر ہوگی جو وجوب کے دن عام طور رائج و معروف ہو اور اس میں پھٹکر فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا نیز اموال اگر سائمہ میں سے ہو تو یوم الاداء کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ لما فی الجوهرة النيرة[1]:

"ثم المعتبر فی القيمة عند ابی حنيفة يوم الوجوب ولا يلتفت بعد ذالك إلى زيادة القيمة ونقصانها وعندهما يوم الاداء إلى الفقراء۔

وفی جامع الرموز[2]: لكن للمالك ولاية نقل قيمته يوم الاداء عندهما ويوم الوجوب عنده على ما قال بعضهم وقال آخرون فی السائمة العين ويجوز قيمته يوم الاداء وفی غيرها العين او قيمته يوم الوجوب۔

وفی الدر المختار[3]: وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفی السوائم يوم الاداء اجماعًا وهو الاصح ويقوم فی البلد الذی المال فيه۔

وفی رد المحتار[4]: وهو تصحيح للقول الثانی الموافق لقولهما و

---

(۱) الجوهرة النيرة ۱/۱۴۳ (۲) جامع الرموز ۱/۱۳۹ (۳) در مختار ۲/۳۰ (۴) رد المحتار ۲/۳۰

تامة بدون زيادة لا يجب الضم بل ينبغي ان يؤدي عن كل واحد زكوته ولو ضم حتى يؤدي كله من الذهب او الفضة فلا بأس به عندنا ولكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء والا يؤدي من كل منهما ربع عشره.[1]

وفي بدائع الصنائع:[2] واذا كان تقدير النصاب من اموال التجارة بقيمتها من الذهب والفضة وان تبلغ قيمتها مقدار النصاب من الذهب والفضة فلابد من التقويم حتى يعرف مقدار النصاب ثم بماذا تقوم ذكر القدوري في شرحه مختصر الكرخي انه يقوم باوفر القيمتين من الدراهم والدنانير حتى انها اذا بلغت بالتقويم بالدراهم نصابا ولم تبلغ بالدنانير قومت بما تبلغ به النصاب وكذا روي عن ابي حنيفة في الامالي انه يقومها بانفع التقديرين للفقراء.

وفي بدائع الصنائع:[3] فاما اذا كان الصنفان جميعا كاملين بان كان له عشرون مثقالا ومأتا درهم فانه يضم احدهما الى الآخر حتى تكميل النصاب عندنا.

وفي بدائع الصنائع:[4] وهذا الذي ذكرنا كله من وجوب الضم اذا لم يكن كل واحد منهما نصابا بان كان اقل من النصاب فاما اذا كان كل واحد منهما نصابا تاما ولم يكن زائدا عليه لا يجب الضم بل ينبغي ان يؤدي من كل واحد منهما زكوته ولو ضم احدهما الى الآخر حتى يؤدي كله من الفضة او من الذهب فلا بأس به عندنا ولكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء رواجا الخ.

---

(١) ردالمحتار ٢/٢٩ (٢) بدائع الصنائع ٢/٢١ (٣) ايضاً [illegible] (٤) بدائع الصنائع [illegible]

(۴) مصارف زکوٰۃ

(۱) مدرسہ اگر طالب علم کے طعام، قیام، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا انتظام کرے اور یہ نظام مقرر کرے کہ کسی طالب علم پر ان سہولتوں کی فراہمی میں جو خرچ عائد ہوتا ہے طالب علم کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے پاس سے اس رقم کو ادا کرے، مدرسہ کسی طالب علم پر خرچ کا جو حصہ آتا ہے اگر حساب کرتے ہوئے اس کو بطور ماہواری فیس مقرر کرے تو ایسی صورت میں جو طالب علم مصرف زکوٰۃ ہے اس کی طرف سے مقررہ فیس ادا کرنے کے لیے مدرسہ اگر مذکوٰۃ سے اس رقم کا چیک اس طالب علم کے نام دے دے اور طالب علم وہ چیک وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کردے تو یہ صورت جائز ہوگی۔ طالب علم نہ دے کہ مدرسہ اگر یہ مقررہ فیس مدزکوٰۃ سے ادا کرے تو یہ جائز نہ ہوگا کیوں کہ مہتمم مدرسہ کے پاس زکوٰۃ کی جو رقم ہے وہ عین ہے اور دین عین نہیں ہے اور عین کی زکوٰۃ غیر عین سے ادا نہیں ہوتی نیز عین کی تملیک ہر کسی کو کی جاسکتی ہے لیکن دین کی تملیک من علیہ الدین کے علاوہ دوسرے کسی کو نہیں کی جاسکتی۔

مہتمم مدرسہ یا ان کے نائبین کے پاس جو لوگ زکوٰۃ دیتے ہیں وہ معلوم اور معین ہیں اور وہ لوگ اس نیت سے ان کے ہاتھ میں زکوٰۃ دیتے ہیں کہ وہ زکوٰۃ کو مستحقین کے پاس پہونچادیں گے لہٰذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے اور اس میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ مستحقین زکوٰۃ اگر کسی شخص کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے ان کی طرف سے وکیل مقرر کریں تو وہ ان کا وکیل ہوسکتا ہے لیکن مستحقین کے عدم تقرر کی حالت میں کوئی شخص ان کا وکیل نہیں ہوسکتا، مدرسہ کے مستحقین طلبہ عادۃً مہتمم مدرسہ کو اپنی طرف سے وکیل نہیں بناتے نیز طلباء بھی ایک آتے ہیں تو دوسرے جاتے ہیں ایسی صورت میں مہتمم مدرسہ مستحقین طلبہ کی طرف سے وکیل نہیں ہوسکتا۔

فی بدائع الصنائع[۱]: وان کان مال الزکوٰۃ دینا فجملۃ الکلام فیہ ان اداء العین عن العین جائز بان کان لہ مائتا درھم عین فحال علیہا الحول فادی خمسۃ منہا لانہ اداء الکامل عن الکامل فقد ادی

---

[۱] بدائع الصنائع ۲/۴۳

ما وجب علیه فیخرج عن الواجب وکذا اذا ادی العین عن الدین بان کان له مائتا درهم دین فحال علیها الحول ووجبت منها الزکوٰۃ فادی خمسۃ عینا عن الدین لانہ اداء الکامل عن الناقص لان العین مال بنفسہ ومالیتہ لاعتبار تعینہ فی العاقبۃ وکذا العین قابل للتملیک من جمیع الناس والدین لایقبل التملیک لغیر من علیہ الدین واداء الدین عن العین لایجوز بان کان لہ علی فقیر خمسۃ دراھم ولہ مائتا درھم عین حال علیہا الحول فتصدق بالخمسۃ علی الفقیر ناویا عن زکوٰۃ المائتین لانہ اداء الناقص عن الکامل فلایخرج عما علیہ والحیلۃ فی الجواز ان یتصدق علیہ بخمسۃ دراھم عین ینوی عن زکوٰۃ المائتین ثم یأخذھا منہ قضاء عن دینہ فیجوز ویحل لہ ذلک ۔

وفی الطحطاوی[1]: والعلم ان اداء الدین عن المال الذی منہ لایصح والحیلۃ ان یعطی المدیون زکوٰتہ ثم یأخذھا عن دینہ ۔

وفی العالمگیریۃ[2]: ولو قضی دین الفقیر بزکوٰۃ مالہ ان کان بامرہ یجوز وسقط الدین ۔

وفی قاضی خان[3]: ولو دفع قوم زکوٰۃ اموالہم الی من یاخذ الزکوٰۃ لفقیر فاجتمع عند الاخذ اکثر من مائتی درھم قالوا کل من اعطی زکوٰتہ قبل ان یبلغ ما فی ید الاخذ مائتی درھم جازت زکوٰتہ ومن اعطی بعد ما اجتمع عند الاخذ مائتی درھم لایجوز الا ان یکون الفقیر مدیونا ھذا کان الاخذ اخذ الاموال بامر الفقیر فان اخذ بغیر امرہ جازت الکل لان الأخذ اذا لم یکن بامر

---

(١) الطحطاوی: ص ٣٢ (٢) العالمگیریۃ ١/ ٩٩ (٣) قاضی خان ١/ ١٢٥

الفقير كان الآخذ وكيلا عن الدافعين فما اجتمع عنده للآخذ يكون مال الدافعين فجاوزت زكوٰة الكل الخ ۔

وايضاً في قاضي خان[1]: الوكيل كيد الموكل ودفعه كدفع الموكل فاذا مرّ الزكوٰة كان عما نوى۔

وفي فتح القدير[2]: من فروعها قوم دفعوا الزكوٰة الى من يجمعها لفقير فاجتمع عند الآخذ اكثر من مائتين فان جمعه له بامره قالوا كل من دفع قبل ان يبلغ ما في يد الجابي مائتين جازت زكوته ومن دفع بعده لا يجوز الا ان يكون الفقير مديونا فيعتبر هذا التفصيل في مائتين تفضل بعد دينه وان كان بغير امره جاز الكل مطلقا لان في الاول هو وكيل عن الفقير فما اجتمع عنده يملكه وفي الثاني وكيل الدافعين فما اجتمع عنده ملكهم۔

وفي العناية[3]: وانما قيد بقوله بغير امره لانه لو قضى دين حي بامره وقع عن الزكوٰة كانه تصدق على الغريم فيكون القابض كالوكيل له في قبض الصدقة ۔

وفي فتح القدير[4]: ومحمد هذا انما يكون بغير اذن الحي اما اذا كان باذنه وهو فقير فيجوز عن الزكوٰة على انه تمليك منه والدائن يقبضه بحكم النيابة عنه ثم يصير قابضا لنفسه

وفي بدائع الصنائع[5]: ولا يجوز قبض الاجنبي للفقير البالغ العاقل الا بتوكيله لانه لا ولاية له عليه فلا بد من امره كما في قبض الهبة ۔

---

(1) قاضي خان ۱۲۶/۱   (2) فتح القدير ۲۶/۲   (3) العناية ۲/۲
(4) فتح القدير ۲/۲   (5) بدائع الصنائع ۲/۳۹

(۲) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے مصارف زکوٰۃ کے تحت والعاملین علیہا کو بھی ذکر کیا ہے حسب تصریح فقہاء ومفسرین والعاملین علیہا میں وہی لوگ مراد ہیں جن کو امام المسلمین زکوٰۃ وعشر وصول کرنے کے لیے مقرر کرتے ہیں، ائمہ احناف نے یہ بھی تصریح کی ہے کہ عاملین کو ان کے عمل سے قدر کفایت نفقہ دیا جائے گا، لیکن ان کے عمل کے نصف سے زائد دینا جائز نہیں ہے اور یہ اجرت کے طور پر نہیں ہے بلکہ بطور عمالہ ہے۔ مدرسہ کے لیے زکوٰۃ کی وصولی پر جو لوگ مقرر ہوتے ہیں ان کا تقرر چونکہ امام کی طرف سے نہیں بلکہ مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے اس لیے وہ والعاملین علیہا کے تحت داخل نہیں ہوں گے لہٰذا ان کو ان کے عمل کے عوض میں جو کچھ دیا جاتا ہے وہ بطریق اجرت ہے اور عامل کے عمل کی اجرت معلوم ہونا ضروری ہے کیونکہ اجرت اگر مجہول ہو تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے اسی وجہ سے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے کہ عامل کی اجرت اگر اس کے عمل کے ایک جز کو مقرر کیا جائے تو اجارہ فاسد ہو جاتا ہے۔ بناء علیہ مدارس کی طرف سے محصلین زکوٰۃ وغیرہ کو اگر متعین شرح فی صد کمیشن دینے کی شرط پر مقرر کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا۔ زکوٰۃ ادا ہونے کے لیے یہ شرط ہے کہ ایسے شخص کو مالک بنا دیا جائے جو مصرف زکوٰۃ ہو اور مالک بنانا بھی بلا کسی معاوضہ کے ہو، بناء علیہ زکوٰۃ کے آمدنی اور خرچ کا حساب رکھنے کے لیے مدرسہ کی طرف سے جو عملہ مقرر ہوتا ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہ ہوگا۔

لما فی بدائع الصنائع[1] واما العاملون علیہا فہم الذین نصبہم الامام لجبایۃ الصدقات واختلف فیما یعطونہ قال اصحابنا یعطیہم الامام کفایتہم منہا وقال الشافعیؒ یعطیہم الثمن ولنا انما یستحقہ العامل انما یستحقہ بطریق العمالۃ لا بطریق الزکوٰۃ بدلیل انہ یعطی وان کان غنیا بالاجماع ولو کان ذلک صدقۃ لما حلت للغنی الیٰ ان قال لا علی سبیل الاجرۃ لان الاجرۃ مجہولۃ وفیہ ایضا وجہالۃ احد البدلین یمنع جواز الاجارۃ۔

---

(۱) بدائع الصنائع ۴۴/۲

وفی تفسیر روح المعانی[1]: تحت قولہ تعالیٰ والعاملین علیہا وھم الذین یبعثہم الامام لجبایتہا وفی الفقہ علی المذاہب الاربعۃ[2] والعامل ھو الذی نصبہ الامام لاخذ الصدقات والعشور۔

وفی احکام القرآن للجصاص[3]: تحت قولہ تعالیٰ والعاملین علیہا ویدل ایضا علی ان اخذ الصدقات الی الامام۔

وفی البحر الرائق[4]: ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ہاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن المملک من کل وجہ للہ تعالیٰ۔

وفی فتاوی عالمگیری[5]: ومنہا العامل وھو من نصبہ الامام لاستیفاء الصدقات والعشر کذا فی الکافی۔

وفی الدر المختار[6]: ولو استأجر رجلا لیحمل طعامہ ببعضہ او ثورا لیطحن برہ ببعض دقیقہ فسدت فی الکل لانہ استأجرہ بجزء من عملہ والاصل فی ذلک نہیہ صلی اللہ علیہ وسلم عن قفیز الطحان۔

وفی الدر المختار[7]: دفع الزکوٰۃ الی صبیان اقاربہ برسم عید او الی مبشر او مہدی الباکورۃ جاز الا اذا نص علی التعویض۔

وفی العنایۃ علی الہدایۃ[8]: تحت قولہ وھو الرکن، لان الاصل فی دفع الزکوٰۃ تملیک فقیر مسلم غیر ہاشمی ولا مولاہ جزءً من المال مع قطع منفعۃ المدفوع عن نفسہ مقرونا بالنیۃ۔

---

(۱) روح المعانی ۱۲۲/۱۰ (۲) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۶۲۱/۱ (۳) احکام القرآن للجصاص جلد
(۴) بحر الرائق ۲۱۶/۲ (۵) فتاوی عالمگیری ۱۸۸/۱ (۶) درمختار ۴۳/۵
(۷) درمختار ۹۴/۲ (۸) العنایہ علی الہدایہ ۲/۲

مصرف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصارف زکوٰۃ کے بارے میں سورۂ توبہ کی جو آیت ہے اس میں کلمہ انما مذکور ہے جو حصر پر دلالت کرتا ہے اور یہاں پر حصر، حصر حقیقی ہے جو مختار ہے جمہور مفسرین اور فقہاء کا۔

(۲) آیت مصارف زکوٰۃ میں مذکور فی سبیل اللہ سے غازی مراد ہے کیوں کہ کتاب وسنت میں جب فی سبیل اللہ کا استعمال مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد مراد ہوتا ہے، جیسا کہ جمہور مفسرین اور فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے۔

(۳) صحابہ کرام، تابعین مفسرین اور فقہاء کرام نے جب فی سبیل اللہ میں دو ہی قول ذکر کیا ہے تو اس میں تیسرا معنیٰ مراد لینا درست نہ ہوگا۔

(۴) فقہاء احناف کا قول راجح یہی ہے کہ عاملین کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر شرط ہے البتہ ایک اشکال یہاں رہتا ہے کہ ایسی صورت میں دوسرے مصارف کو ذکر کرنے کی بظاہر ضرورت ہی نہیں رہتی بلفقراء والمساکین کے تحت میں وہ داخل ہوجاتے ہیں۔

الف): فی سبیل اللہ کے مصداق غزاۃ ہیں۔

ب): فی سبیل اللہ کے مصداق جو لوگ ہیں ان کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر شرط ہے۔

۵) زکوٰۃ کے مصارف کی تعلیل کر کے اشتراک علت کی بنا پر مذکورہ مصارف کے علاوہ دوسرے کو مصارف زکوٰۃ کے ساتھ ملحق کرنا درست نہ ہوگا۔

(۶) دور حاضر میں دینی اور دعوتی کاموں کے لیے جس طرح بے پناہ سرمایہ کی ضرورت ہے ایسا ہی امت مسلمہ میں فقر ومحتاجگی دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے فقراء کی حمایت کے لیے بھی بے پناہ سرمایہ کی شدت سے ضرورت ہے اور نص قرآنی سے اموال زکوٰۃ میں ان کا حق ثابت ہو رہا ہے اس لیے فی سبیل اللہ کے دائرہ کو وسیع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(۷) احقر کے نزدیک زکوٰۃ کا مصرف فی سبیل اللہ میں فقہاء احناف کا قول راجح ہی مختار ہے۔

ھذا ما سنح لی واللہ تبارک وتعالیٰ اعلم وعلمہ اتم

زکوٰۃ کے مسائل

از ——— حضرت مولانا زبیر احمد قاسمی صدر المدرسین اشرف العلوم کنہواں

الحمد للّٰہ وبہ نستعین والصلوٰۃ والسلام علی حبیبہ سید المرسلین وآلہ

وصحبہ اجمعین، اما بعد!

"اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا" نے اپنے پانچویں سیمینار منعقدہ اعظم گڈھ میں زیر بحث لانے کے لیے جن مسائل کو موضوع قرار دیا ہے، ان میں ایک مسئلہ زکوٰۃ بھی ہے۔

بلاشبہ ان سے متعلق جتنے بھی سوالات ترتیب دیئے گئے ہیں وہ اپنی جگہ اہم اور افادیت کے حامل ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ ان میں بعض ایسے بھی مسائل ہیں جو اپنی جگہ معروف ومعلوم اور کتب فقہ میں مصرح موجود ہیں، جس میں نہ اختلاف رائے کی کوئی گنجائش محسوس ہوتی ہے اور نہ دور حاضر میں وہ کسی نئے اجتہاد اور غور وفکر کے محتاج نظر آتے ہیں، اس طرح انہیں زیر بحث لانے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی، اس کے علاوہ ان میں ایسے بھی سوالات نظر آئے جن کے متعلق اختلاف رائے بہرحال لازمی ہے، کیونکہ اس کے سلسلے میں خود حضرات ائمہ کے مختلف اقوال صراحتاً ہماری کتب متداولہ میں منقول ملتے ہیں، مثلاً مبیع قبل القبض کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں۔

اس لیے ایسے مسائل میں تو اختلاف اہل ارباب کے پیش نظر اسے مبتلی بہ کی ذاتی شرعی ذمہ داری پر چھوڑ دینا چاہیے کہ وہ وقت ضرورت متدین علماء اور معروف صاحب فتوی، فقہاء کی طرف رجوع ہو کر ان کے فتوی پر عمل کرتا رہے۔ اپنے اس خیال واحساس اور مذکورہ بالا رائے کے اظہار کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ سے متعلق بعض خاص سوالات کے سلسلے میں اپنے محدود مطالعہ وتحقیق کے بعد میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں اسے بطور اختصار جواب سوالات پیش کر رہا ہوں، وباللہ التوفیق۔

۱ ——— ایک تاجر بغرض تجارت بیع وشراء کرتا ہے، اور مشتری قیمت سپرد کر دیتا ہے لیکن مبیع اس کے قبضہ میں نہیں آتی ہے تو بائع پر اس مقبوضہ ثمن کی زکوٰۃ بشرط نصاب وحول بہرحال لازم ہوگی؛

"لکونہ مالکہ بملک تام ای یدا ورقبۃ"۔

لیکن مشتری پر اس مبیع غیر مقبوضہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس میں فقہاء کی عبارتیں خود مختلف ہیں۔

اپنا خیال یہ ہے کہ اس میں قبضہ کے قبل تو زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی، مگر بعد القبض سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی بشرط نصاب وحول واجب الاداء ہوگی، کیونکہ یہ بہر حال مال تجارت کے بدلہ کے طور پر مشتری کا ایک دین بذمہ بائع رہتا ہے جو دین قوی کے حکم میں ہے اور دین قوی میں حسب تفصیل فقہ بعد القبض سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

۲ کرایہ دار جو رقم بطور اجرت معجلہ مالک مکان کے حوالہ کرتا ہے، اس کی زکوٰۃ تو مالک پر بشرط نصاب وحول لازم ہو جائے گی۔

"لانہ ملک الاجرۃ بالتعجیل کما"[1]

"ولا تعجل الاجرۃ لا یملک الاستردادَ"[2]

جیسی فقہی عبارتوں کا یہی مقتضا ہے۔

البتہ وہ رقم جو بطور ڈپوزٹ اور زرِ ضمانت، کرایہ دار جمع کرتا ہے اس کی زکوٰۃ بشرط نصاب وحول خود کرایہ دار پر واجب ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی ہوگی، کیونکہ یہ رقم یا تو امانت ہے یا بعد الاذن تصرف کے سبب قرض ورنہ کالمغصوب، بہر حال جب اس کی واپسی کا ظن غالب ہوگا تو دین قوی کا حکم رہے گا ورنہ مال ضمار کا حکم۔

اس رقم کو کالمرہون کہنا صحیح نہیں ہے کیوں کہ ایک حق ثابت اور دین موجود کو ممکن الاستفاء اور سہل الحصول بنانے کے لیے جس چیز کو صاحب حق اپنے پاس محبوس کرتا ہے وہ شئے مرہونہ ہوتی ہے، یہاں مالک مکان کا کوئی حق یا دین فی الحال کرایہ دار پر ثابت وموجود نہیں، وصولی کرایہ کا حق تو حسب شرائط مہینہ اور سال کے اختتام پر ثابت ہوگا، ڈپوزٹ کی رقم صرف اس احتمال وامکان کی بنیاد پر جمع کی اور کرائی جاتی ہے کہ حسب معاہدہ وقت معہودہ پر اگر کرایہ مکان وصول نہ ہو سکے گا، تو اس رقم سے محسوب ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ ایک حق موہوم اور دین مظنون کے بدلے شئے محبوسہ کو رہن نہیں کہا جا سکتا، اس لیے اسے یا تو امانت کے لیے یا قرض یا کالمغصوب اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر لازم ہونی چاہیے۔

---

[1] بحر الرائق ۲/۲۱۹۔

[2] شامی ۵/۱۰۔

یہاں اس کی وضاحت ہو جانی مناسب ہے کہ بلاشبہ وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تام ضروری ہے اور ملک کی تمامیت رقبۃً ویداً ہر دونوں طرح کی ملکیت پر موقوف ہے مگر ملک ید کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ میرے پاس اور میرے ہاتھ میں بالفعل موجود ہو، بلکہ میں چیز میں مجھے شرعاً تصرف کا حق ہو ہم تصرف میں کسی کے اِذن کے محتاج نہ ہوں، اور اس کا کبھی نہ کبھی مقبوضہ ہو جانا مظنون بظن غالب ہو وہ حکماً مقبوضہ اور یداً مملوکہ ہی کہلائے گی، ورنہ دین قوی وغیرہ میں سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کو واجب الاداء کہنے کا کوئی جواز نہ ہونا چاہیے۔

اس کے ساتھ یہاں اس امر کا استحضار بھی ضروری ہے کہ شئ مرہونہ بقدر دین ہی مضمون ہوتی ہے اور اسی کے بقدر وہ مشغول بالدین مشغول بالحاجۃ ہونے کے سبب کالمعدوم قرار پاتی ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ راہن پر بعد الاسترداد بھی واجب نہیں ہو پاتی ——— لیکن کیا اس کا بھی فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔ کہ بشرط نصاب قدر دین سے زائد مالیت کی زکوٰۃ بھی بعد الاسترداد والانفکاک سنین ماضیہ کی واجب الادا نہیں ہوگی، اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو اسی سے ملک ید کی حقیقت سمجھی جا سکتی ہے۔

۳ ——— کسی مال کا ایسا ہونا کہ اس کا کوئی مالک معین نہ ہو نہ معلوم الذات ہو نہ معلوم النوع والجنس اس کی نظیر شریعت میں نہیں "لا سائبۃ فی الاسلام" حدیث ہے، ہاں بیع بشرط خیار اس کی نظیر ہو سکتی تھی، مگر وہ بھی مختلف فیہ ہے، اس لیے سوال یوں کیا جائے کہ جس مال کا کوئی معلوم الذات معین مالک نہ ہو بلکہ معلوم النوع والجنس اور مجہول الذات مالک ہو جیسے کہ مال موقوف اور مدارس اسلامیہ جیسے اداروں میں جمع شدہ مال، تو اس کی زکوٰۃ کا کیا حکم ہوگا۔

چوں کہ مدارس اسلامیہ میں زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم پر مستحق زکوٰۃ طلبہ کی ملکیت ہوتی ہے حضرات اور نظمائے مدرسہ کا قبضہ دراصل طلبہ مستحق کا قبضہ ہوتا ہے، ہمارے اکابر دیوبند اس کے قائل ہیں اور یہ معلوم النوع مگر مجہول الذات طلبہ اشخاص حقیقی نہیں، اشخاص حکمی ہیں، اس لیے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی۔

"لعدم تصور التمليك من الاشخاص الحكمية".

۴ ——— مال حرام یا تو واجب التصدق ہوتا ہے یا اصل مالک پر واجب الرد، مال حلال کے ساتھ اس کا خلط گو بوجہ استہلاک موجب ملک ہے، مگر اس مقدار کا وہ مستہلک ضامن ہونے کے سبب مدیون بھی بن جاتا ہے، اس لیے بقدر حرام مشغول بالدین والحاجۃ ہونے کے سبب کالمعدوم ہی ہوگا، اس لیے اس قدر حرام کے استثناء کے بعد صرف مابقی پر بشرط نصاب و حول زکوٰۃ واجب ہوگی،

"وهو ظاهر جداً مستفاد من عبارة الفقهاء، مثلاً ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكوٰة فيه ويورث عنه (الی قوله) وهذا اذا كان له مال غيره استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفى دينه والا فلا زكوٰة كما لو كان الكل خبيثاً"[1]

اوراس صورت میں ثبوت ملکیت کا ثمرہ صرف وراثت وتوریث میں ظاہر ہوگا، اور بس۔

۵ــــــ دین کی زکوٰۃ دائن پر ہوگی، اس تفصیل وشرائط کے ساتھ جو فقہ کی تمام ہی کتب متداولہ میں صراحتاً موجود ہیں، دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف کی ماہیت وحقیقت کا بیان پھر ان کے درمیان سنین ماضیہ اور سنین آتیہ کے اعتبار سے وجوب ادا میں فرق کا مسئلہ، اسی طرح کس دین کے کس مقدار پر قبضہ کے بعد کب سے وجوب ادا کا حکم ہوگا، اور اس سلسلے میں خود امام اعظم اور صاحبین کے درمیان میں اختلاف اور تعدد اقوال کی ساری بحثیں اور تفصیلات فقہی کتابوں موجود ہیں، اس کے نقل واعادہ کی کیا ضرورت۔

مدیون پر اس قدر دین کے زکوٰۃ واجب ہونے کی بات "لکونه مشغولاً بالحاجة الاصلية" ہونے کے باوجود خلاف عقل ونقل ہے، البتہ اس دین سے اگر مدیون نے بذریعہ تجارت نفع حاصل کیا ہوگا تو بشرط نصاب وحول مال مستفاد کی طرح اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

۶ــــــ سرکاری غیر سرکاری ملازمین کو ریٹائر ہونے کے بعد جو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم ملا کرتی ہے۔ وہ بہرحال ایک دین ضعیف کے حکم میں ہے اس کا حکم شرعی معلوم ومعروف ہے کہ بعد القبض بشرط نصاب وحول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

۷ــــــ دین اور قرض کے درمیان جو جوہری فرق ہے اسے مستحضر رکھا جائے تو کبھی یہ سوال پیدا نہیں ہوسکتا کہ حکومت یا کمپنی سے بغرض تجارت حاصل کردہ طویل المیعاد قرض وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں، اور نہ اس کے جواب میں دین مؤجل کے مانع ہونے نہ ہونے کے درمیان اختلاف ائمہ اور تعدد اقوال کی طرف ذہن بھٹکے گا، کیوں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ قرض ایک تبرع ہے، جس میں لزوم نہیں، اس لیے اس کی تاجیل بھی صحیح ولازم نہیں ہے۔ "التاجيل في القرض باطل" جیسے اصول اور "كل دين حال اذا اجّله صاحبه صار مؤجلاً الا القرض فان

---

[1] درمختار ۲/۳۳

تا بیلغ الربع[1] جیسی عبارتوں کا یہی اقتضاء ہے۔

اس لیے حکومت یا کسی سے بھی حاصل کردہ قرض کی رقم خواہ بظاہر وہ موجل ہی ہو تکمیل نصاب میں یقیناً واقع ہوگا۔ چنانچہ کمل قرض کے بقدر وضع کرکے ہی اس کے مالک نصاب ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوگا

۸ ـــــ ہیرے جوہرات کی خریداری بغرض زینت و آرائش ہو یا مقصد اظہار تمول ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر بغرض تجارت نہ ہو اور عملاً اس کی تجارت بھی کر رہا ہے تو اس میں بشرط نصاب و حول زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، کما ھو الظاھر، لیکن سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جواہرات کی خریداری کرے یا کسی قانون کی گرفت سے بچنے کے لیے اپنے سرمایہ کو ہیرے اور جواہرات وغیرہ مطلق طور پر غیر نامی اشیاء کی شکل میں تبدیل کرے اور فی الحال عملاً اس میں تجارت بھی نہیں کر رہا ہے، مگر اس کی نیت یہی ہو کہ مناسب موقع پر حسب احوال و مواقع سراً یا علناً فروخت کریں گے تو ایسے جوہریوں کا کیا حکم ہوگا ۔؟

میرا خیال یہ ہے کہ جو اس ارادہ سے خریدے اسے حکماً بغرض تجارت خریدار قرار دے کر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگنا چاہیے، اور ہمارے سمجھ کے مطابق سد ذرائع جیسے فقہی اصول کا یہی مقتضیٰ ہے ورنہ پھر اس حرص و ہوس کے افراط، بددینی اور خوف خداوندی سے عاری ماحول میں اسقاط زکوٰۃ کا ایسا حیلہ سرمایہ داروں کے ہاتھ آجائے گا، کہ بس الامان والحفیظ اور فقراء، مساکین تو نک یک دیدم دم نہ کشیدم کا منظر پیش کریں گے اس لیے نہ صرف دیانتاً بلکہ قضاءً بھی وجوب زکوٰۃ کا فتویٰ اور حکم ہونا چاہیے، سد ذرائع کے علاوہ دوسرے اصل کی مثلاً "الامر اذا ضاق اتسع واذا اتسع ضاق" ✓ کی بھی اشارہ ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم۔

۹ ـــــ تجارتی اموال کے قدر مالیت کے تحقیق میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا؟ اس میں حضرت امام اعظم علیہ الرحمۃ سے تو دو ولان قول یعنی وجوب ادا کے دن کی قیمت و نرخ کا معتبر ہونا منقول ہے مگر صاحبین فرماتے ہیں کہ اگر اسی دن ادا نہیں کیا تو پھر ادائے گی کے دن کی قیمت و نرخ کا اعتبار ہوگا، اور ہمارے خیال میں صاحبین ہی کا قول ایسر و ارفق ہونے کے سبب لائق ترجیح ہے۔ اب وہ تاجر جس معیار کا ہے

---

[1] ھدایہ ثالث /۹۷ ۔

یعنی مشکوک فروش ہے یا خردہ فروش وہ اپنے معیار و مقابل کے اعتبار سے ہی نرخ و قیمت کا حساب لگائے گا۔

۱۰۔۔۔۔ جو لوگ "اراضیات" کی تجارت کرتے ہیں، اگر وہ زمین عشری یا خراجی نہیں تب تو اس کی مالیت پر بشرط نصاب و حول وغیرہ زکوٰۃ واجب ہونے میں کوئی اختلاف ہے نہ کوئی خفا ہے۔

البتہ اگر وہ زمین عشری یا خراجی ہوگی تو اس میں بظاہر اشکال ہوگا کہ عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم لگانے سے تضاعف حق اللہ لازم آئے گا، اور فقہی عبارت مثلاً "حقوق اللہ تعالیٰ المتعلقة بالاموال لایجب فیہا حقان"[1] وغیرہ کے خلاف ہوگا، مگر اس سلسلہ میں ہمارا خیال یہ ہے کہ حضرت امام محمد علیہ الرحمۃ کی تحقیق و توجیہ کو راجح قرار دیتے ہوئے ان تجارتی اراضیات میں عشر و خراج کے ساتھ وجوب زکوٰۃ کا حکم بھی لگنا چاہیے، یہ فرماتے ہیں کہ عشر و خراج کا محل دراصل پیداوار تحقیقی یا حکمی ہوگا اور وجوب زکوٰۃ کا محل نفس زمین اور اس کی قیمت ہوگی، فلا یلزم کون حق اللہ مضاعفا فی محل واحد۔

محور ثالث

محور ثانی میں صرف یہی ایک سوال تھا کہ اموال تجارت کے نصاب متعین کرنے میں سونے چاندی میں سے کس کے نصاب کو اصل تسلیم کیا جائے؟ اور چوں کہ اس کا جواب "انفع للفقراء" کی روشنی میں واضح تر تھا اس لیے اس سے تعرض کیے بغیر محور ثالث کے سوالات پر غور کیا۔

۱۔۔۔۔ اس میں پہلا مسئلہ یہ غور طلب نظر آیا کہ مدارس اسلامیہ کے مہتمم اور ان کے ماتحت سفراء و محصلین مد زکوٰۃ کی رقوم پر کس حیثیت سے قابض ہوتے ہیں؟ چوں کہ جواہر الفقہ جلد چہارم صفحہ ۲۱۶ میں موجود مباحث و نقول سے یہ بات منقح ہو جاتی ہے کہ رجوع و اعتراف اور افادہ و استفادہ کے بعد حضرات اکابر مثلاً حضرت گنگوہی، حضرت تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری بلکہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہم اللہ سب ہی لوگ بالاتفاق تسلیم کر چکے ہیں کہ مہتمم مدرسہ معطی و مستحق زکوٰۃ دونوں کے وکیل ہوتے ہیں اس لیے جیسے خود فقراء و مستحقین زکوٰۃ کے قابض ہونے کی شکل میں صرف قبضہ فقراء سے زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے،

---

[1] بدائع ۲/۵۷۔

ملک معطی سے وہ رقم نکل جاتی ہے اور معطی بری الذمہ ہو جاتا ہے، اسی طرح مہتمم اور اس کے مامور و ماتحت سفراء کے قبضہ میں آتے ہی معطی کی زکوٰۃ ادا شدہ بن جائے گی، کیوں کہ "ید الوکیل کید الموکل" مسلمہ قاعدہ شرعیہ ہے۔

یہاں اس تفریع علم کے ساتھ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ چوں کہ یہ مہتمم و سفراء معطی زکوٰۃ کے وکیل کی حیثیت بھی رکھتے ہیں اس لیے جس طرح خود معطی کو اپنی زکوٰۃ بلا تملیک فقراء کسی دوسرے مصارف خیر مثلاً تعمیر مساجد بناء مدارس اور تکفین میت وغیرہ میں خرچ کرنے کی اجازت نہیں، اسی طرح مہتمم حضرات بھی بلا تملیک اگر مصارف خیر میں خرچ کرنے کے مجاز نہیں ہوں گے ـــــــ اس طرح یہ مسئلہ ہمارے خیال میں مفروغ عنھا بن چکا ہے، ان حضرات اکابر کی اجتماعی رائے سے اب اختلاف کرنے کے بجائے اتفاق کر لینا ہی انشاء اللہ خیر قرار پائے گا۔

۲ ـــــــ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ سفراء و محصلین کو منصوص مصرف زکوٰۃ "العاملین علیہا" میں داخل مان کر زکوٰۃ سے انہیں تنخواہ دی جا سکتی ہے یا نہیں؟

اپنا خیال اور رجحان اس طرف ہے کہ اس سلسلہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے فتویٰ جواز کو تسلیم کر لینا چاہیے[1]۔

یہ صحیح ہے کہ عاملین کا تقرر و انتخاب امیر و سلطان کی طرف سے ہوتا ہے جو مدارس کے سفراء کے حق میں بظاہر مفقود ہے مگر ملک ہندوستان میں جب خود امیر و قاضی کا تقرر و انتخاب ارباب حل و عقد کی طرف سے کیا جا سکتا ہے اور اس پر دور حاضر کے سارے معروف علماء کا تقریباً اجماع ہو چکا ہے تو مدارس کے مہتمم حضرات جو اپنے اپنے دائرہ میں ارباب حل و عقد کے ہی منتخب و مقرر کردہ ہوتے ہیں ان کی حیثیت امیر کی کیوں نہیں ہو سکتی۔

حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری علیہ الرحمہ کی وہ تحریر جو حضرت تھانوی علیہ الرحمہ کے رفع اشکال کے طور پر ہمارے سامنے ہے وہ اس کی واضح دلیل کہی جا سکتی ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ لکھتے ہیں: "بندہ کے خیال میں سلطان میں دو وصف ہیں ایک حکومت (سیاست اور انتظام ملکی) جس کا ثمرہ تنفیذ حدود و قصاص ہے دوسرا نظم حقوق عامہ، امر اول میں کوئی اس کے قائم مقام نہیں ہو سکتا، لیکن امر ثانی میں اہل حل و عقد بوقت ضرورت قائم مقام ہو سکتے ہیں، وجہ یہ ہے کہ اہل حل و عقد

---

[1] کفایت المفتی ۴/۲۹۹۔

کی رائے ومشورہ کے ساتھ نصب سلطان وابستہ ہے جو باب انتظام سے ہے، لہذا مالی انتظام مدارس جو برضا ملاک وطلب ابقاء دین کے لیے کیا گیا ہے بالاولیٰ معتبر ہوگا۔[1] بلکہ فتاویٰ خلیلیہ[2] میں ان کے الفاظ میں یہ صراحت ہے کہ اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں، اسی طرح مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کے الفاظ یہ ہیں، "چندہ وصول کرنے والے عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہو کر فقراء کے وکیل ہیں، معطیین چندہ کی وکالت صرف اس درجہ میں ہے کہ انہوں نے ان حضرات کو وکیل فقراء تسلیم کرکے اپنا چندہ ان کے حوالہ کر دیا۔"[3]

بہرحال ان اکابر کی ان تحریروں سے بھی مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمۃ کے فتویٰ کی تائید ہی ہوتی ہے، اور جب ان حضرات کی تحریر سے سفراء کا مثل عمال ہونا اور عاملین صدقہ کے حکم میں داخل ہونا واضح ہو رہا ہے تو "اذا ثبت الشیٔ ثبت بلوازمہ" کے تحت ان کو مد زکوٰۃ سے عوض عمل بھی دینا جائز ہونا چاہیے، لیکن زمانہ حرص وہوس کا ہے، صبر وقناعت اور جذبۂ ایثار سے عام قلوب خالی ہو چکے ہیں اس لیے قدر کفاف کی تعیین وغیرہ میں باہمی نزاع واختلاف کا قوی اندیشہ ہے، اس لیے برضا طرفین بطور تنخواہ اس کی پہلے ہی تعیین کی جا سکتی ہے، یہ محض تغیر اسم ہے تغیر مسمیٰ نہیں، در حقیقت یہ کفاف اور عمالہ ہی رہے گا۔

باقی رہا کمیشن کی اجازت دینا کہ کسی طرح صحیح طریقہ کار نہیں کہا جا سکتا، اس سلسلے میں عام طور پر اس کے عدم جواز کی جو دلیلیں بیان کی جاتی ہیں، گو مجھیں ان دلائل اور طرز استدلال سے کوئی انس اور مکمل اتفاق نہیں، مگر اس طریقہ کار کا کبھی مفضی الی الضرار ہو جانا لازم بلکہ معلوم ومشاہد ہے، اس کمیشن کی اجازت پر میں کبھی شرح صدر نہیں ہوا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

۲ــــــ اب رہا تیسرا مسئلہ "فی سبیل اللہ" کے مفہوم ومصداق کی تعیین کا، تو اس سلسلے میں حدیثاً وقدیماً بہت ساری بحثیں ہو چکی ہیں، اور ہر طرح کے رطب ویابس دلائل کا ایک انبار باخبر حضرات کے سامنے آ چکا ہے، لیکن حق یہی ہے کہ نظریہ تعمیم کے حاملین کی جتنی بھی پیش کردہ دلیلیں ہیں، بر رنگ اجتہاد واستنباط ہیں اس پر نقد وتبصرہ، اور توجیہ وتاویل سے قطع نظر کسی دلیل میں وہ قوت اور وزن نہیں جو نظریہ تخصیص کے دلائل میں ہیں۔

اور اگر صحیح فیصلہ کی بنیاد قوت دلائل پر ہوا کرتی ہے، اور یقیناً ہوا کرتی ہے تو یہ بات طے شدہ

---

[1] امداد الفتاویٰ ۲۶۰/۲ [2] فتاویٰ خلیلیہ/ ۳۴۹ [3] جواہر الفقہ ۳۸۹/۲۔

سمجھنی چاہیے کہ قرآن پاک میں مصارف زکوٰۃ میں آئے ہوئے لفظ فی سبیل اللہ کا مصداق صرف اور صرف جہاد عسکری ہے اور بس۔

یہ صحیح ہے کہ قرآنی آیتوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی روایتوں میں فی سبیل اللہ کا استعمال لغوی معنیٰ میں بھی ہوا ہے اور یہ لفظ لغوی طور پر سارے ہی قربات وطاعات کو عام اور شامل ہے لیکن یہ بھی ایک زبردست سچائی اور حقیقت ہے کہ مصارف زکوٰۃ میں جو فی سبیل اللہ آیا ہے وہ بطور منقول شرعی بلکہ منقول عرفی کی حیثیت سے جہاد عسکری کے ساتھ مختص ہے اور ظاہر ہے کہ سارے استدلال پر بھاری ہے شہادت اس کی۔

میں کہہ سکتا ہوں کہ عہد رسالت اور عہد صحابہ میں اس لفظ کے مطلق استعمال کی صورت میں تبادر ذہنی صرف جہاد عسکری کی طرف ہوتا تھا اور یہ مفہوم و مصداق عوام و خواص میں اتنا معروف تھا کہ از قبیل عوام ایک صحابیہ اور ایک صحابی جن کا کوئی علمی مقام معروف نہیں اور جن کی کوئی فقیہانہ امتیازی شان نہیں وہ بھی فی سبیل اللہ کا یہی مفہوم سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔

آخر ابوداؤد کی روایت میں حضرت ام معقل کا جو واقعہ منقول ہے کہ انھوں نے اپنے شوہر حضرت ابو معقل سے سفر حج کے لیے اونٹ مانگا تو انھوں نے یہی عذر پیش کیا کہ وہ اونٹ تو میں نے فی سبیل اللہ وقف کر دیا ہے اور صحابیہ اس عذر کو معقول سمجھتی ہوئی کوئی بحث واعتراض نہیں کرتیں اور نتیجۃً وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج کی سعادت سے محروم ہو جاتی ہیں، اس سے کیا یہ حجت قائم نہیں ہو جاتی کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان فی سبیل اللہ کا مفہوم و مصداق جہاد عسکری ہی تھا اور غالباً اسی عرف و تبادر اور منقول شرعی و عرفی ہونے کی بنیاد پر تابعین، تبع تابعین اور سارے ائمہ مجتہدین کا اس مفہوم پر اجماع ہو چکا ہے۔ اقوال شاذہ اور تفردات قابل اعتنا کب اور کس مسئلے میں ہوتے ہیں کہ یہاں ان کی طرف ادنیٰ التفات کا جواز نکالا جائے، سلف وخلف کے اس اجماع کی صورت میں موجود ایک قطعی اور بدیہی دلیل کے مقابلہ میں دور حاضر یا ماضی قریب و بعید کے اصاغر و اکابر کی محض اجتہادی و استنباطی اور صرف ظنی و نظری دلیلوں کا کیا وزن ہو سکتا ہے۔ فیا عجب این تذھبون۔

یہ صحیح ہے کہ ام معقل رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ " فہلا خرجت علیہ فان الحج فی سبیل اللہ "، جس سے فی سبیل اللہ کے مصداق میں

یک گونہ عموم کا ثبوت ہوتا ہے، یہاں اس حدیث پر سنداً متنا بحث سے صرف نظر کرتے ہوئے میں یہ کہنا سمجھتا ہوں کہ یہ دراصل ایک لفظ کے معنی لغوی اور سطح ظاہر سے استفادہ کی صورت ہے اور بس۔

آپ جیسے باخبر حضرات سے کون زیادہ واقف ہوگا کہ یہ بھی ایک معروف طرز استدلال ہے کہ بسا اوقات مختلف مصالح کی بنیاد پر آیت و روایت کی ظاہری سطح پر نظر رکھتے ہوئے اسے مواقع استدلال میں پیش کردیا جاتا ہے، مگر درحقیقت آیت و روایت کا حقیقی انطباق مقصود نہیں ہوتا، اور اس کے نظائر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام اور فقہائے عظام سبھوں کے استدلال میں ملتے ہیں، مثلاً جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رئیس المنافقین کے لیے دعاء استغفار کرتے ہیں اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآنی آیت "استغفر لہم او لا تستغفر لہم ان تستغفر لہم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لہم" پیش کرتے ہوئے آڑے آتے ہیں تو آپ جواب میں جو یہ فرماتے ہیں کہ مجھکو استغفار سے منع تو نہیں کیا گیا ہے" بلکہ بخاری کے الفاظ میں آپ جو فرماتے ہیں کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہوسکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زائد استغفار کرتا" یہ کون استدلال ہے؟ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ کی شکل ہے حقیقی انطباق نہیں۔

اور مثلاً حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک مسلمان آتا ہے جو قتل مسلم کا ارادہ رکھتے ہوئے قتل مسلم کے متعلق دریافت کرتا ہے تو آپؓ "من یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤہ جہنم خالدا فیہا" کی آیت تلاوت کرتے ہیں، یہاں بھی مصلحتاً اور سداً لباب الفتنہ وہی الفاظ کے سطح ظاہر سے استفادہ ہے، اسی طرح جب حضرت احنف بن قیس جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے شریک ہونے کے لیے گھر سے نکلتے ہیں تو ان کی ملاقات حضرت ابوبکرہ سے ہوتی ہے اور احنف بن قیس کے ارادہ پر مطلع ہو کر انہیں اس ارادہ سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے جو حضرت ابوبکرہ یہ حدیث پیش کرتے ہیں:

"اذا التقی المسلمان بسیفیہما فالقاتل والمقتول فی النار الخ"

یہ بھی اسی قبیل سے ہے ورنہ حضرت علی اور حضرت عائشہ وغیرہما اگر حضرات صحابہ پر جو ارباب حق کا محض اجتہادی خطا کے سبب قتال تھا، روایت کا انطباق ممکن نہیں، یہاں حضرت ابوبکرہ تقلیل فتنہ کی وقتی مصلحت کے سبب الفاظ کی ظاہری سطح سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ روایت پیش کرتے ہیں اور بس۔

اور مثلاً فقہاء کرام جو لکھتے ہیں کہ اگر بحالت صوم غیبت کرنے کے ارادے سے کوئی مسئلہ

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

از: مفتی عزیز الرحمٰن صدیقی، دارالافتاء ایجنسی، (کراچی)

حمداً ومصلیاً، امابعد!

اسلام میں زکوٰۃ کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی نماز کی، قرآن پاک میں ان دونوں فریضوں کو ایک ہی ساتھ بیان فرمایا ہے۔ نماز اگرچہ ابتدائے اسلام یعنی لیلۃ المعراج سنہ ۱ نبوی میں فرض ہوئی تھی لیکن اس سے قبل بھی نماز پڑھی جاتی تھی، چنانچہ سورہ مزمل سنہ ۴ نبوی میں نماز اور زکوٰۃ کا تذکرہ ایک ہی ساتھ ملتا ہے۔

"اقیموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ واقرضوا اللہ قرضاً حسناً۔"

نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ کو قرض حسن دو۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے تحریر فرمایا ہے:

"ایسے ہی زمانہ جاہلیت میں زکوٰۃ بھی تھی، اسی زکوٰۃ میں مہمان نوازی، مسافر نوازی، عیال پروری، مساکین پر صدقات و خیرات، صلہ رحمی، حوادث میں امداد سب زکوٰۃ میں داخل تھے۔" (۱)

مفسر عماد الدین ابن کثیر نے تحریر فرمایا ہے:

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ، باب ۱۱

"فرضیت زکوٰۃ مکہ میں ہو چکی تھی لیکن نصاب زکوٰۃ اور مقدار مخرج، مدینہ منورہ میں ہوا۔" (۱)

اس تمہید سے غرض صرف اس قدر ہے کہ اسلام میں زکوٰۃ کی وہی اہمیت ہے جو نماز کی ہے۔ دونوں فرض ہیں، رکن ہیں اور اسلام کی بنیادیں ہیں۔ نماز کی طرح زکوٰۃ کے اصول و قوانین بھی ہیں۔ یہ بات دیگر ہے کہ نماز میں ان قوانین کو سنن، واجبات، فرائض کے ناموں سے یاد کیا ہے جب کہ زکوٰۃ میں نصاب زکوٰۃ، مقدار مخرج، مصرف اور اہلیت کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اس مقالہ میں بعض ان مسائل کا ذکر ہے جو موجودہ حالات اور ضروریات کے تحت اہم ہیں۔

نصاب زکوٰۃ

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے مالداری (صاحب نصاب ہونا) کی حد مقرر کی ہے مقررہ حد سے کم فقیر مستحق اخذ زکوٰۃ زکوٰۃ وصدقات ہے اور مقررہ حد یا اس سے اوپر کو مالداری یا غنی جس کو صاحب نصاب کہا جاتا ہے اس کے لیے اخذ زکوٰۃ وصدقات حرام ہے۔ اسلام نے یہ حد بندی چاندی اور سونے کے ذریعہ کی ہے جو آج تک برقرار ہے۔ جواہرات اور موتی، ہیرے وغیرہ قیمتی سے قیمتی دھاتوں کی قیمت کا تعین ان ہی دو چیزوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے اس وجہ سے ان تمام قیمتی اشیاء کو عروض تجارت میں شمار کیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اسی غرض سے فراہم کیے گئے ہیں لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو ان پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

"لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفا اتفاقاً الا ان یکون للتجارۃ" (۲)

وفی رد المحتار وفی نسخۃ اولؤلؤا (۳)

یہ جواہرات کسی شخصیت کے تمول اور قدآوری کو ظاہر کرنے کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے ٹی. وی، فرج وغیرہ، اس لیے زکوٰۃ میں مالداری کی حد بندی ان اشیاء سے نہیں بلکہ چاندی سونے سے ہوتی ہے سونے میں بیس مثقال اور چاندی میں دو سو درہم ہے لیکن موجودہ زمانہ میں نوٹوں کی ایجاد نے نوٹوں کو معیار قرار نہیں دیا بلکہ معیار وہی ہے یعنی چاندی سونا۔ اس وقت یہ فرق غیر متوازن ہو گیا ہے۔ جس زمانہ میں احکام زکوٰۃ اور نصاب زکوٰۃ مقرر ہوا تھا اس وقت تو بیس مثقال برابر دو سو درہم تھے، لیکن اب نہیں ہیں

---

(۱) تفسیر ابن کثیر ۱/۳۴۹ (۲) درمختار (۳) ردالمحتار ۲/۴

اس لیے اب کسی کے پاس اگر دس مثقال سونا ہے اس کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ دو سو درہم چاندی کا مالک نہیں ہے، بے شک وہ مالک ہے بلکہ کچھ زائد کا مالک ہے اور صاحب نصاب ہے۔

(الف) اس وجہ سے کہ جس کے پاس دس مثقال یا ایک تولہ سونا ہے وہ کچھ نہ سہی دو چار کے نوٹ تو ضرور اپنے پاس رکھتا ہوگا۔

(ب) بالفرض اگر دو چار روپیہ بھی پاس نہ ہوں تب بھی وہ صاحب نصاب ہے کیوں کہ سونا نہ سہی چاندی کا نصاب تو قیمتاً پورا ہو ہی جاتا ہے۔

"من ذهب و ورق مقوما باحدهما (۱) - وفي رد المحتار: قوله تعيين تقويم به اي لو كان يبلغ به نصابا كما في النهر ويقوم في البلد الذي المال فيه الى قوله يتعين ما يبلغ نصابا دون ما لا يبلغ نصابا فان بلغ بكل منهما او احدهما اروج تعيين التقويم بالاروج (۲)"

ملکیت اور قبضہ

زکوٰۃ کے بیان میں دوسرا اہم مسئلہ ملکیت کا ہے اسی پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ ملکیت سے مراد کیا ہے؟ اس پر حضرات فقہاء کی بہت جامع و مانع تعریفات ہیں:

(الف) "الزكوة في الشرع عبارة عن اخراج الحر المسلم البالغ العاقل اذا ملك نصابا ملكا تاما طائفة من المال الى المصرف" (۳)

لیکن ملک تام سے مراد کیا ہے؟

(ب) الملك قيل هو القدرة على التصرف (۴)

اس سے معلوم ہوا کہ ملک تام وہ ہے کہ مالک بھی ہو اور تصرف کی قدرت بھی رکھتا ہو اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ قبضہ بھی ہو، اور قبضہ ہی وہ حقیقت ہے جو تصرف کا حق دیتا ہے، چنانچہ مہر قبل قبضہ کے بارے میں بیان فرمایا ہے۔

---

(۱) درمختار (۲) رد المحتار ۲/۳۱ (۳) البنایہ ۱/۱۵ مطبعہ نولکشور

(۴) البنایہ ایضاً

" اما الصداق قبل القبض فان بالعقد اصل الملك يتعلم بما هو المقصود ولا يحصل الا بالقبض " (۱)

یعنی مہر کی ملکیت اگرچہ عورت کے لیے نکاح ہوتے ہی متعین ہو گئی لیکن چونکہ قبضہ نہیں ہوا اس لیے اس کے تصرف کی قدرت بھی محدود ہے بریں وجہ عورت پر زکوٰۃ واجب نہیں اور مرد پر زکوٰۃ واجب ہونے کو عورت کی ملکیت مانع نہیں۔

" وعن ابی حنیفة رح لا یمنع الی قوله والصحیح انه غیر مانع " (۲)

ایک اور مثال ملک کامل کی ملاحظہ ہو۔

" ویخرج ایضا المشتری للتجارة اذا لم یقبض حتی حال علیه الحول لا زکوٰة فیه انه لم یستفد ملك التصرف کمال الملك بکونه مطلقا للتصرف " (۳)

" الملك التام الذی یکمل بجمیع آثار الملك " (۴)

" المشتری للتجارة قبل القبض " (۵)

موجودہ زمانہ میں وہ اشیاء (خواہ بڑی ہوں یا چھوٹی) جن کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہے اگرچہ خریدار مالک ہو چکا ہے لیکن ملک ناقص ہونے کی وجہ سے ان کی زکوٰۃ میں ادا واجب زکوٰۃ واجب نہ ہوگی ——— یہیں سے ایک دوسرا مسئلہ بھی مستفاد ہوتا ہے (یعنی پراویڈنٹ فنڈ (جس کی تفصیل سوال ۸ میں مذکور ہے) پر زکوٰۃ کا معاملہ) اس مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اس فنڈ کی رقم اگر پیشگی طور پر کل رقم کا جزو لیا جاتا ہے وہ قرضہ ہوتا ہے جس کو صاحب فنڈ یعنی مالک ادا کرتا ہے۔ اس فنڈ کی رقم کا وہ حصہ جو تنخواہ میں سے وضع کر لیا ہے کہ وہ سرکار یا کمپنی کے ذمہ قرض ہوتا ہے اور جو اضافہ ہوتا ہے وہ ملازم ہے جس کا مالک ملازم ملنے پر ہی ہوگا یعنی بقدر تنخواہ حصہ پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور بقدر اضافہ جو ایک قسم کا قانونی وعدہ ہے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ وہ ملک تام نہیں ہے۔

---

(۱) البنایہ ۱/۱۵۱ - الاشباہ ص۔ (۲) رد المحتار ۲/۵ (۳) فتح القدیر ۱/۱۲۹

(۴) البنایہ (۵) رد المحتار ۲/۵

مالِ مخلوط پر زکوٰۃ

یہیں سے ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ بینکوں، ڈاک خانوں اور ایسے ہی پراویڈنٹ فنڈ پر جو سود لگایا جاتا ہے اور یہ سب مال مل جاتا اور مخلوط ہو جاتا ہے اس کے بارے میں بھی یہ حکم ہے کہ جب اصل رقم کا اضافہ کر دیا گیا تو کھاتہ دار کل رقم کا مالک ہو جاتا ہے لہٰذا کل رقم پر اس کو زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔

"ودخل بما ملك بسبب خبيث كمغصوب خلطه الخ" (۱)

وفي رد المحتار: وامّا المملوك شراءً فاسداً فهو مشكل لانه قبل قبضه غير مملوك وبعده مملوك ملكاً خبيثاً (۲)

اس لیے کھاتہ میں سودی رقم کا جو اضافہ ہوا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ ملک تام ہے اگرچہ اس کا سبب محرم ہے۔

مدارس اور اوقاف کے مال

ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے مدارس اور اوقاف کے اموال پر ایسے ہی بیت المال کے اموال پر اور ایسے ہی مسلم دشمنوں کے اموال پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی۔

"فلا زكوة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك ولا فيما احرزه العدو بدارهم لانهم ملكوه بالاحراز عندنا خلافاً للشافعي" (۳)

مصارف زکوٰۃ

منجملہ مصارف زکوٰۃ میں عاملین زکوٰۃ بھی زکوٰۃ کا مصرف قرار دیے گئے ہیں اور ان کو قرآن پاک نے مصرف قرار دیا ہے زمانہ رسالت میں اور اس کے بعد بھی زکوٰۃ کی وصول یابی کا انتظام اور ایسے ہی اس کے خرچ کا انتظام اسلامی گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا ہے گورنمنٹ اپنے ہی افسران کے ذریعہ اس کو وصول

---

(۱) درمختار ۲/۲ (۲) ردالمحتار ۲/۴ (۳) ایضاً ۲/۴

کراتی اور اپنے ہی افسران کے ذریعہ اس کو تقسیم کراتی تھی، اسی وجہ سے حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ارشاد فرمایا تھا،
"ولو منعونی عقالاً" اگر مجھے ایک رسی دینے سے بھی انکار کیا تو ان سے جہاد کیا جائے گا۔

یہ بھی مسلمانوں کی بد قسمتی ہے کہ زکوٰۃ اجتماعی نظم انفرادیت پر آ گیا، جس کی وجہ سے وہ اپنی اقتصادیات کے مسائل حل نہ کر سکے۔ اسی کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنے پر مجبور ہوں کہ فقہی اصطلاح میں تراضی مسلمین کے تحت ہر قریہ اور ہر بستی میں امیر یا قاضی کا تقرر جائز ہے اور طلاق و نکاح، رویت ہلال وغیرہ کے بارے میں اس کے فیصلے نافذ ہیں تو کیوں نہیں فریضہ زکوٰۃ کے اجتماعی نظم کے قیام کی طرف توجہ دی جاتی؟ غالباً اس میں یہ اشکال ہو سکتا ہے کہ یہ مدارس اور مکاتب کس طرح چلیں گے؟ میرا خیال یہ ہے کہ اس اشکال میں قومی اور اسلامی مفاد کے بجائے انفرادی منفعت زیادہ حائل ہے۔

عاملین زکوٰۃ یا محصلین زکوٰۃ کو اسلامی گورنمنٹ بقدر کفایت تنخواہ دیتی ہے اور یہ بقدر کفایت بقدر نصف سے زیادہ نہ ہوگا۔ عامل مالدار ہوں یا فقیر بہر صورت ان کو زکوٰۃ میں سے دیا جائے گا اور یہ جائز ہے بشرطیکہ وہ خاندان رسالت میں سے نہ ہوں۔ صاحب مظہری نے لکھا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے عاملین زکوٰۃ کو بھی اصناف فقراء میں شمار کیا ہے خواہ وہ مال دار ہوں یا فقیر کیوں کہ وہ اموال زکوٰۃ وصول کرنے میں فقراء کے وکیل ہیں اور ان کے معاملات میں مشغول ہیں، اس لیے حکماً وہ بھی فقیر ہیں"۔ (۱)

"لان الفقر شرط فی جمیع الاصناف الا العامل والمکاتب وابن السبیل"۔ (۲)

مصرف زکوٰۃ کی تمام قسموں میں فقیر ہونا شرط ہے مگر عامل، مکاتب اور مسافر کے لیے شرط نہیں ہے۔

علامہ شامیؒ نے ایک صفحہ کے بعد یہاں تک تحریر کر دیا ہے:

"لایجوز دفع الزکوٰۃ الی من یملک نصاباً الا الی طالب علم والغازی ومنقطع الحج لقولہ علیہ السلام یجوز دفع الزکوٰۃ لطالب علم وان کان لہ نفقۃ اربعین سنۃ"۔ (۳)

---

(۱) مظہری ۴/۲۳۳ (۲) ردالمحتار ۲/۵۸ (۳) ردالمحتار ۲/۵۹

فی سبیل اللہ کے مفہوم کو متاخرین علماء نے اس قدر وسعت دی کہ بقول امام رازی وہ کفن موتی تعمیر مساجد وغیرہ جمیع اصناف خیر کو فی سبیل اللہ سمجھنے لگے، لیکن حضرات حنفیہ کے نزدیک چوں کہ ادائے گی زکوٰۃ میں تملیک ضروری ہے اور یہ اشیاء اس مفہوم سے خالی ہیں اس لیے زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں۔

(الف): صاحب مظہری نے عاملین زکوٰۃ میں ایک علت یہ بھی بیان کی ہے کہ وہ چوں کہ فقراء کے وکیل ہیں اور ان کے معاملات میں مشغول رہتے ہیں اس لیے بقدر نصف تک ان کو زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے۔

(ب): یہیں سے یہ بھی ایک مسئلہ مستفاد ہوتا ہے کہ معلمین علماء، اور اہل افتاء، صاحب الدرس اور مہتمم مدارس صاحبان بھی طلبائے علم کے لیے مشغول ہوتے ہیں، اس لیے ان کو بھی زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے اور وہ بھی زکوٰۃ کا مصرف ہیں، جیسا کہ رد المحتار کی مندرجہ بالا عبارت سے مترشح ہوتا ہے، اس لیے میری رائے میں نواب صدیق حسن خاں صاحبؒ کا استدلال وقیع معلوم ہوتا ہے کہ:

آیت مصارف زکوٰۃ میں مذکورہ لفظ فی سبیل اللہ کے معنی اللہ کا راستہ ہے اور جہاد اگرچہ اللہ کے راستوں میں اہم ترین راستہ ہے لیکن باب زکوٰۃ میں فی سبیل اللہ کے حصہ کو مجاہدین کے ساتھ خاص کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں بلکہ اس کا مصرف کرنا ہر اس عمل پر جو اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہوں جائز ہوگا۔

اس کے بعد نواب صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"متجملة فی سبیل اللہ الصرف فی العلماء الذین یقومون بمصالح المسلمین الدینیة فان لهم فی مال اللہ تعالی نصیباً سواء کانوا اغنیاء او فقراء بل الصرف فی هذه الجهة من اهم الامور لان العلماء ورثة الانبیاء وحملة الدین وبهم تحفظ بیضة الاسلام وشریعة سید الانام" (۱)

حضرات علماء کرام کی اس عطا کردہ سہولت کو اگر عمومیت دی جائے تو تمام لیڈران عظام اور ہر ایک شخص ملت اسلامیہ کا خادم نظر آئے گا اور وہی مصرف زکوٰۃ قرار پا جائے گا۔ میرے نزدیک اتنی ڈھیل اور وسعت کسی طرح جائز نہیں ہے کیوں کہ نصوص کو خدا اور رسول کی عطا کردہ حدود سے زیادہ پر قیاس کرنا جائز

---

(۱) الروضة الندية ۱/۲۰۶

نہیں ہے، لہٰذا زیادہ سے زیادہ :

طلباء علم دین، محصلین زکوٰۃ، خدام اور اساتذہ طلبائے دین زکوٰۃ کا مصرف قرار پا سکتے ہیں، لیکن وہ بھی بعض شرائط کے ساتھ، وہ شرائط ہیں امام کی جانب سے ان کا تقرر۔ موجودہ زمانہ میں اگرچہ یہ معنی حاصل نہیں ہیں، لیکن تراضی مسلمین کی قید نے جو مقتدر علماء اور مستند اور باعتبار مسلم اداروں کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے۔

سوال نمبر کے اعتبار سے ایک اشکال اور باقی رہ جاتا ہے وہ یہ کہ محصلین زکوٰۃ کو اگر تنخواہ دیں تو اتنا عمل نہیں تو کیا سکہ رائج الوقت کی طرح کمیشن پر مقرر کیا جا سکتا ہے اس میں محصل کا بھی فائدہ ہے اور ادارہ کا بھی فائدہ ہے۔

اس باب میں دو طرح پر جواب ہے ایک وجہ یہ کہ محصل کو بقدر نصف عمل کے زکوٰۃ کا مال دیا جاسکتا ہے اور کسی چیز کا نصف یا ثلث اسی وقت مقرر ہوگا جب وہ عمل وجود میں آئے گا، اس کے باوجود نصف زکوٰۃ تک محصل کو دینا جائز ہے اس میں دلیل ہے کہ کمیشن جائز ہے لیکن اگر اس کو اجارہ فاسدہ قرار دیا جائے تو میں عرض کروں گا کہ عموم بلویٰ کی وجہ سے علماء بخاریٰ و بلخ نے اس قسم کے اجارہ کو جائز قرار دیا ہے۔

"قال فی التبیین ومشائخ بلخ والنسفی یجیزون حمل الطعام ببعض المحمول ونسج الثوب ببعض المنسوج لتعامل اهل بلدهم بذلك" (۱)

بتوفیق اللہ تعالیٰ میں عرض کرتا ہوں ہمارے دیار میں گیہوں کی فصل کی کٹائی پر یہ تعامل رہا ہے کہ بیس گڈیوں پر ایک گڈی مزدور کو دی جاتی ہے اس کے مقابلہ میں مزدور نقد لینا پسند نہیں کرتا اور یہ تعامل سکہ رائج الوقت کی طرح رہا ہے اور اب بھی ہے اور اہل مدارس نے محصلین کی بدعنوانیوں کی وجہ سے کافی عرصے کمیشن مقرر کرنا شروع کر دیا ہے اور اب وہ تعامل عام بن گیا ہے، اس لیے مشائخ بلخ کی رائے کی تصویب زیادہ مناسب اور مفید ہے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

---

(۱) رد المحتار ۵/۳۴

سوالات کے جوابات

از: ــــــــــــــ مفتی عبد الرحمٰن صاحب دہلی

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

چار قسم کے اموال پر زکوٰۃ فرض ہے۔

(۱) سونے چاندی پر (۲) تجارتی مال پر، خواہ وہ کسی قسم کا ہو (۳) سائمہ جانوروں پر۔

(۴) کھیتی اور درختوں کی پیداوار پر جس کو عشر کہا جاتا ہے۔

س (۲) «ملک تام» سے یہی مراد ہے کہ مال مالک کی ملک میں ہو، یداً بھی اور رقبۃً بھی۔

(۱) لہٰذا وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہے مگر مال ابھی تک قبضہ میں نہیں آیا، اس کی زکوٰۃ کی ادائے گی وصول ہونے سے پہلے واجب نہ ہوگی۔

"فلا تجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض" (۱)

جو قیمت ادا کی جا چکی ہے اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی۔ لانہ ملکھا یداً ورقبۃً۔

(۲) کرایہ کی مد میں جو رقم پیشگی دی گئی ہے وہ اجارہ پر دینے والے کی ملک ہو گئی یداً بھی اور رقبۃً بھی، اس لیے وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے گا، بشرطیکہ اجارہ کی مدت پوری ہو جائے اس سے قبل اجارہ فسخ نہ ہو۔

---

(۱) بحر ۲۲۳/۲

"وفي المحيط معزيا الى الجامع رجل له الف درهم لامال له غيره استاجر بها دارا عشر سنين لكل سنة مأة فدفع الالف ولم يسكنها حتى مضت السنون والدار في يد الآجر زكا الآجر في السنة الاولى عن تسع مأة وفي الثانية عن ثمان مأة الا زكاة السنة الاولى ثم يسقط لكل سنة زكاة مأة اخرى وما وجب عليه للسنين الماضية لانه ملك الالف بالتعجيل كلها"(۱)

ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس لیے واجب نہیں کہ اس پر اس کا قبضہ نہیں اور اس لیے بھی واجب نہیں کہ مکان حوائج اصلیہ میں سے ہے اور یہ رقم حوائج اصلیہ میں محبوس تھی کہ اس کے بغیر مکان کا میسر آنا ممکن اور آجر پر اس لیے اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کہ وہ اس رقم کا مالک نہیں۔

س، (۳) وہ مال جو کسی شخص کی ملک نہیں ہے جیسے مدارس اور اداروں کے اموال۔ ان اموال میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملک"(۲)

(۴) مال حرام جو اپنے پاس ہے اگر وہ اپنے مال کے ساتھ مخلوط نہیں ہے تو اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگر اس کے مالک معلوم ہیں تو واجب الرد نہیں تو واجب التصدق ہے۔

اور اگر مال حرام اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہوگیا ہے کہ امتیاز مشکل ہے تو یہ استہلاک ہے جو امام صاحب کے نزدیک موجب ملک ہے، لیکن اس مال حرام کا ضمان اس صورت میں واجب ہوگا جو اس کے ذمہ دین ہوگا اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی بشرطیکہ اس کے علاوہ اتنا مال موجود ہو کہ اس مال حرام کا ضمان ادا کیا جاسکے اور اگر اس کے علاوہ مال نہیں ہے تو پھر زکوٰۃ اس کی واجب نہ ہوگی بلکہ مال حرام کو منہا کرنے کے بعد جو بچے اگر وہ نصاب کو پہنچتا ہے تو اس پر زکوٰۃ ہوگی ورنہ نہیں۔

"ولو خلط السلطان المال الغصب بماله ملکه فتجب الزکاة

---

(۱) بحر ۲/۲۰۳ (۲) رد المحتار ۲/۹

فیہ ویورث عنہ لان الخلط استہلاک اذا لم یمکن تمییزہ عند ابی حنیفۃ وقولہ ارفق اذ قل ما یخلو مال عن غصب وھذا اذا کان لہ مال غیر ما استہلکہ بالخلط منفصل عنہ یوفی دینہ والا فلا زکاۃ کما لو کان الکل خبیثا کما فی النہر"(۱)

(۵) ایسا دین کہ اس کا ثبوت دائن کے پاس موجود ہے یا مدیون اس دین کا منکر نہیں ہے اور اس کے وصول ہونے کی امید ہے اور دین قوی ہے یا متوسط ہے تو ایسی حالت میں دین کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ لازم ہے مگر بعد قبضہ کے۔ دین قوی میں تو چالیس درہم پر قبضہ کے بعد اور دین متوسط میں دو سو درہم پر قبضہ کے بعد، اور اگر دین ضعیف ہے تو اس کی زکوٰۃ دینا لازم نہیں، جب وہ قبضہ میں آجائیگا اور اس پر سال گزر جائے گا تو مثل اور مالوں کے اس کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔

لیکن اگر مدیون ٹال مٹول کر رہا ہے اس سے قرض کے وصول ہونے کی امید نہیں ہے وہ اقرار کے باوجود دیتا نہیں ہے اور دائن اس سے لینے پر قادر نہیں ہے تو ایسی صورت میں اس دین کی ماضی کی زکوٰۃ دائن پر وصولیابی کے بعد بھی واجب نہ ہوگی۔

"وقدمنا اول الزکاۃ اختلاف التصحیح فیہ ومال الرحمتی الی ھذا وقال بل فی زماننا یقر المدیون بالدین وبملاءتہ ولا یقدر الدائن علی تخلیصہ منہ فہو بمنزلۃ العدم" (۲)

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم (یعنی وہ رقم جو ملازم کی تنخواہ سے قبضہ میں آنے سے پہلے ہی وضع کر لی جاتی ہے اور اس پر بطور انعام حکومت اپنی طرف سے مع سود کے بڑھا کر دیتی ہے اس) رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، جب یہ رقم وصول ہوگی اور اس پر سال گزر جائے گا (یا پہلے سے صاحب نصاب ہے تو جب اس کے نصاب کا سال ہوگا) تب زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ تنخواہ سے وضع شدہ رقم جو قبضہ میں نہیں آئی ہے وہ خدمت حُر (آزاد) کا بدل ہے اور خدمت حر مال نہیں ہے اس لیے اس کا بدل دین ضعیف ہے اور دین ضعف کا حکم یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ

---

(۱) درمختار علی رد المحتار ۲/۲۳ و ۲۴ (۲) شامی ۲/۸۵

واجب نہیں ہوتی۔

شرط ثانی نما ہے

نما لغت میں زیادتی کو کہتے ہیں جس کی شرعاً دو قسمیں۔ تحقیقی و تقدیری۔ تحقیقی نما وہ زیادتی ہے جو توالد و تناسل کے ذریعہ یا تجارت کے ذریعہ ہو۔ اور تقدیری نما یہ ہے کہ مال کے اپنے یا اپنے نائب کے قبضہ میں ہونے کی وجہ سے زیادتی پر قدرت ہو۔ کذا فی رد المحتار۔

تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ وہ ضرورت ہے جو جان یا آبرو سے متعلق ہو یعنی اس کے پورا نہ ہونے سے جان کے یا آبرو کے جانے کا خوف ہو، تو جو چیزیں انسان سے ہلاکت کو دفع کریں حقیقتاً جیسے نفقہ اور رہنے کا مکان اور آلات حرب اور سردی و گرمی کے کپڑے یا تقدیراً جیسے دین کہ مدیون اس کی ادائے گی کی طرف محتاج ہے اپنے نفس سے حبس (قید) کو دفع کرنے کے لیے جو بمنزلہ ہلاکت کے ہے اور جیسے پیشہ کے آلات اور گھر کا سامان اور سواری اور کتابیں اہل علم کے لیے۔ لان الجہل عندھم کالہلاک۔ تو جو مال اپنی اصلی ضرورت سے زائد ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور جو مال ان اصلی ضرورتوں کے لیے ہو وہ مثل معدوم کے ہے اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

"وفارغ عن حاجتہ الاصلیۃ لان المشغول بہا کالمعدوم" (۱)

رہی نفس حوائج تو ان میں بدرجۂ اولیٰ زکوٰۃ واجب نہیں، اس لیے کہ وہ حوائج اصلیہ میں سے ہیں اور نمو بھی نہیں ہے۔

"لکن کلام الھدایۃ مشعر بان المراد بہ نفس الحوائج فانہ قال ولیس فی دور السکنی وثیاب البدن واثاث المنازل ودواب الرکوب وعبید الخدمۃ وسلاح الاستعمال زکاۃ لانہا مشغولۃ

---

(۱) درمختار ج ۲

بحاجة الاصلية وليست بنامية ايضاً۔ (رد المحتار ۲/۶)

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

مال زکوٰۃ کا ایسے قرض سے محفوظ ہونا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ اللہ جل شانہ کا قرض ہو جیسے زکوٰۃ، عشر، خراج وغیرہ کہ حق اللہ تو ہیں مگران کا مطالبہ امام وقت کی طرف سے ہوتا ہے یا وہ قرض بندوں کا ہو جو مال اس قسم کے قرض میں مستغرق ہو یا اس قدر قرض ہو کہ اس کے ادا کرنے کے بعد نصاب پورا نہ رہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

دیون کی اقسام

امام صاحب کے نزدیک دیون کی تین قسمیں۔ قوی۔ متوسط۔ ضعیف۔

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض کسی کے ذمہ عائد ہوا ہو۔ اور متوسط وہ دین ہے جو مال ہی کے بدلے میں عائد ہوا ہو، مگر وہ مال تجارت یا نقد سونا چاندی نہ ہو بلکہ گھر کا سامان وغیرہ ہو اور دین ضعیف وہ دین ہے جو کسی مال کے بدلے میں بذمہ مدیون عائد نہ ہوا ہو، جیسے دین مہر وغیرہ۔

دین قوی پر قبضہ ہونے سے پہلے بھی زکوٰۃ ہر سال واجب ہوتی رہتی ہے مگر ادا کرنا اس وقت ضروری ہوتا ہے جب چالیس درہم یا اس کی مقدار روپیہ وصول ہو جائے اس سے پہلے ادا کرنا واجب نہیں ہوتا۔ لیکن جب ادا کی جائے گی تو تمام سنین ماضیہ کا حساب کر کے ادا کی جائے گی اور دین ضعیف پر قبضہ ہونے کے بعد بھی جب تک سال بھر نہ گزر جائے اس وقت تک زکوٰۃ واجب ہی نہیں ہوتی اور دین متوسط میں امام اعظم ابو حنیفہ رح سے دو روایتیں ہیں، ایک یہ کہ اس پر دین قوی کی طرح زکوٰۃ تو ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی مگر ادا کرنا محض چالیس درہم کی وصولیابی پر لازم نہیں ہوگا، بلکہ پورا نصاب یعنی دو سو درہم یا اس کی مقدار مال جب وصول ہو اس وقت ادا کرنا لازم ہوگا، مگر ایام ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ اور دوسری روایت یہ ہے کہ دین متوسط بھی دین ضعیف کے حکم میں ہے اس پر بھی زکوٰۃ ایام ماضیہ واجب نہیں ہوگی، بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال بھر اس پر گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور صاحب بدائع نے اسی آخری روایت کو اصح قرار دیا ہے۔

اس تفصیل کے بعد جوابات درج ذیل ہیں۔

(۱) ایسا کثیر دین جو طویل الاجل ہے اور اس کی ادائے گی کی مدت قسط وار بیان کردی گئی ہے مؤجل یعنی دین مؤجل کو اگرچہ بعض نے مانع زکوٰۃ قرار دیا ہے مگر صحیح یہی ہے کہ وہ مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔ علامہ ابن عابدین نے ردالمحتار میں قہستانی کے حوالے سے جواہر سے اسی قول کی تصحیح نقل کی ہے کہ دین مؤجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

"زاد القہستانی عن الجواھر والصحیح انہ غیر مانع"(۱)

اس روایت پر جس قسط کی ادائے گی ہو رہی ہے وہ مانع بنے گی، باقی قرض کا چوں کہ مطالبہ نہیں اس لیے مانع نہیں بنے گا۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

ایسی کمپنی جس میں متعدد شرکاء ہوتے ہیں اور اپنے اپنے حصہ کے مطابق اثاثے اور آمدنی کے مالک ہوتے ہیں ان پر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جس فرد کا انفرادی حصہ نصاب کو پہنچے گا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، خواہ وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں اور خواہ ان کے زیورات ہی کیوں نہ ہوں۔ ہاں اگر ہیرے اور جواہرات تجارت کے لیے ہیں تو اس صورت میں وہ مال تجارت ہوں گے اور ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"لا زکاۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الوفا الا ان تکون للتجارۃ"(۲)

واما الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکوٰۃ فیھا وان کانت حلیا الا ان تکون للتجارۃ کذا فی الجوھرۃ النیرۃ"(۳)

---

(۱) ردالمحتار ۲/۶ (۲) درمختار علی ھامش ردالمحتار ۲/۶ (۳) عالمگیری ۱/۱۹۱

اموال تجارت پر زکوٰۃ

جو مال تاجر کے قبضہ میں ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اور اس میں یوم وجوب کی قیمت کا اعتبار ہوگا، یوم خریدکی قیمت کا اعتبار نہ ہوگا۔ زمین وجائداد جو تجارت کے لیے ہے ان کا بھی یہی حکم ہے۔ یہ امام صاحب رح کا قول ہے اور صاحبین رح کے نزدیک یوم ادا کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ تاجر عام طور پر تھوک سے ہی خرید کرتا ہے تو اسی کے اعتبار سے اسٹاک کی قیمت لگے گا، اور جو اشیا پھٹکر سے خرید کی ہیں ان میں پھٹکر کی قیمت لگے گا اور زکوٰۃ ادا کرے گا۔

" وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفي السوائم يوم الاداء اجماعا " (در المختار ۲/۲۰)

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیرز ہولڈر نے جو روپیہ کمپنی کو دیا ہے وہ پوری رقم تجارت میں لگی ہوئی ہے اس میں سے اس کے حصہ کی وہ رقم جو مشنری کی خرید میں صرف ہوگئی ہے یا دیگر آلات حرفہ (پیشہ) میں صرف ہوئی ہے اس تمام رقم کو منہا کر کے بقیہ رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بشرط نصاب وحولان حول)، اگر مشنری میں صرف شدہ رقم کا علم نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتا تو احتیاط اس میں ہے کہ پوری رقم کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے۔ جو رقم نفع کی آتی ہے اور وہ صرف ہونے سے بچ رہتی ہے اس پر (اگر وہ بقدر نصاب ہے اور سال گزر گیا ہے) زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈس جو بڑا قرضہ حکومت کو دیا گیا ہے اس کا حکم یہی ہے کہ وصولیابی کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور یہ دین بھی دین قوی ہے۔ چالیس درہم یا ان کے بقدر روپیہ وصول ہونے پر زکوٰۃ کی ادائے گی لازم ہوگی۔ فقط واللہ اعلم۔

———— ❊ ————

سوالات کے جوابات

از: ——— حضرت مولانا عبد الجلیل قاسمی، مدرس مدرسہ جامعۃ اسلامیہ قرآنیہ سمرا، بہار

الحمد لاهله والصلوٰة والسلام على حبيبه وعلى آله وصحبه اجمعين

امابعد:

زکوٰۃ، سونا، چاندی، سامان تجارت اور سائمہ جانوروں میں واجب ہوتی ہے، ملک تام سے مراد یہ ہے کہ ملکیت بھی ہو اور اس سے استفادہ بھی ممکن ہو، علامہ کاسانی نے اس کو ملک مطلق سے تعبیر کیا ہے

"وهو ان يكون مملوكا له رقبة ويدا"[1]

سوال[1] ——— مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے اس میں زکوٰۃ تو واجب ہوگی لیکن قبضہ میں آنے سے پہلے ادائیگی واجب نہیں ہوگی، قبضہ میں آنے کے بعد گذشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، علامہ شامی نے ملک تام کی بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ومنه ما ايضا كان المبيع للمشتري للتجارة قبل القبض"[2]

پھر آگے درمختار کی عبارت:

"ولا نحو ما اشتراه لتجارة قبل قبضه" پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اما بعده فيزكيه عما مضى"[3]

---

[1] بدائع ۲/۹، شامی ۲/۵، ۲۶۳، والمستفاد من حاشیہ مجمع الانہر ۲/۱۹۳ [2] شامی ۲/۲۶۰

[3] درمختار ۲/۲۶۲۔

سوال[1] ـــــــ کرایہ دار نے جو پیشگی رقم مالک مکان کو دیا ہے بعض قسم کی ہو سکتی ہے اول یہ کہ وہ پیشگی کرایہ ہو دوسرے یہ کہ وہ زر ضمانت ہو جو عقد اجارہ کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کیا جائے گا۔ پہلی صورت میں اس کا مالک، مالک مکان ہوگا، اور اسی کو ملک تام حاصل ہے، اس لیے اس قسم کی زکوٰۃ اسی پر واجب ہوگی، گو کہ صاحب بدائع نے ایک قول کرایہ دار پر بھی وجوب کا نقل کیا ہے مگر اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔

"ذكر الشيخ الامام ابو بكر محمد بن الفضل البخاري في الاجارة الطويلة التي تعارفها اهل بخارى ان الزكاة في الاجرة المعجلة على الآجر لانه ملكه قبل الفسخ وان كان يلحقه دين بعد الحول بالفسخ وقال بعضهم انه يجب على المستاجر ايضا لانه يعد مالا موضوعا عند الآجر"[1]

دوسری صورت میں چوں کہ اس کا مالک کرایہ دار ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی، قبضہ پانے کے بعد گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا، جس طرح دوسرے تمام دیون میں ہوگا۔ علامہ کاسانی نے بیع الوفاء کے ثمن پر بحث کرتے ہوئے بائع اور مشتری دونوں پر وجوب زکوٰۃ کو نقل کیا ہے، علامہ شامی نے اس پر بحث کرتے ہوئے اپنا رجحان صرف مشتری پر وجوب کی طرف ظاہر کیا ہے

"قلت ينبغي ان يزكيها على المشتري فقط على القول الذي عليه العمل الآن من ان بيع الوفاء منزل منزلة الرهن فيكون الثمن دينا على البائع"[2]

پہلی صورت کی تائید اس بحث سے بھی ہوتی ہے جو علامہ شامی نے کیا ہے کہ اگر کسی عورت کا نکاح ایک ہزار درہم پر ہوا اور عورت نے اس پر قبضہ پا لیا، اور اس پر سال گزر گیا تو اس صورت میں عورت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اب اگر شوہر نے قبل الدخول طلاق دیدیا تو عورت نصف مہر شوہر کو واپس کرے گی، لیکن اس نصف کی زکوٰۃ اس سے ساقط نہیں ہوگی۔[3]

سوال[4] ـــــ جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے۔

"وهذا لان في الزكاة تمليكا والتمليك في غير المالك لا يتصور"[4]

---

[1] بدائع الصنائع ۲/۹ [2] شامی ۲/۲۰ [3] شامی ۲/۱۰۲ [4] بدائع ۲/۱ ۔

سوال [۴] ——— جو مال کہ کسی کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے، وہ کل واجب التصدق ہے، تمام کا صدقہ کرنا واجب ہوگا نہ کہ ایک جزء (زکوٰۃ) کا، یعنی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛

"فی القنیة لوکان الخبیث نصابا لایلزمه الزکاۃ لان الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه"[1]

اگر حرام مال اس کے حلال مال میں اس طرح مخلوط ہو گئے کہ تمیز ممکن نہیں ہے تو حرام مال کے بقدر وضع کرنے کے بعد اگر باقی ماندہ مال نصاب کے برابر ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں؛

"من ملك اموالا غیر طیبة او غصب اموالا وخلطها ملکها بالخلط ویصیر ضامنا وان لم یکن له سواها نصاب فلا زکوٰۃ علیه فیها وان بلغت نصابا لانه مدیون ومال المدیون لاینعقد سببا لوجوب الزکوٰۃ عندنا فافاد بقوله وان لم یکن له سواها نصاب الخ ان وجوب الزکوٰۃ مقید بما اذا کان له نصاب سواها"[2]

سوال [۵] ——— دین کی زکوٰۃ بہر حال دائن پر ہوگی نہ کہ مدیون پر، مدیون کے مال مشغول کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں کی جا سکتی، نہ دائن وجوب سے بری قرار دیا جا سکتا ہے، فقہاء نے دین کی جو تقسیم کی ہے، اس میں سے دین قوی اور متوسط کا اگر وصول پانا آج کل کے حالات کے اعتبار سے ممکن ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جب وصول پائے گا گزشتہ ایام کی زکوٰۃ بھی ادا کرے گا۔ اور اگر دین ضعیف ہو تو اس میں قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ پائے گا اس وقت اگر اس کے پاس نصاب ہوگا تو اس میں ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرے گا اور اگر اس کے علاوہ نصاب نہیں ہوگا، تو جب نصاب کے برابر وصول پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا، تو زکوٰۃ ادا کرے گا، اگر آج کل کے حالات کے اعتبار سے دین کا وصول پا لینا ممکن نہ ہو، تو قبضہ سے پہلے کسی قسم کے دین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی؛[3]

سوال [۶] ——— پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کا مالک ملازم ہوتا تو ہے، لیکن وہ رقم اس کے لیے ممکن الانتفاع نہیں ہے اور اگر وہ چاہے تو اس رقم کو استعمال میں نہیں لا سکتا، البتہ اس رقم کی بنیاد پر اس کو قرض تو

---

[1] شامی ۲/۲۹۱ [2] شامی ۲/۲۹۱ [3] شامی ۲/۳۰۰، ۳۰۶، ۳۴۴۔

مل سکتا ہے جو پھر اس کی تنخواہ سے وضع ہو جائے گا، اگر وہی رقم اس کو ملتی جس طرح تنخواہ کا باقی حصہ ملتا ہے، تو پھر اس کے وضع کا سوال ہی نہیں ہوتا، اس لیے اس پر قبضہ پانے سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جس وقت قبضہ پائے گا اگر اس کے پاس اس کے علاوہ نصاب ہوگا، تو اس میں ضم ہو جائے، ورنہ جب نصاب کے برابر پائے گا، اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اس رقم کے سلسلہ میں حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بدائع کی لمبی عبارت نقل کرنے کے بعد پوری تفصیلی بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ وہ دین ضعیف میں داخل ہے، قبضہ پانے کے بعد ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس تحقیق سے اتفاق کیا ہے۔ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی عدم وجوب زکوٰۃ کے قائل ہیں۔

دوسری شرط نمو

"نمو" کا معنی زیادتی اور بڑھوتری ہے، یہ جانوروں میں توالد و تناسل کے ذریعہ ہوتا ہے اور دوسری اموال میں تجارت کے ذریعہ، اسامہ و دودھ، گھی اور نسل کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے اور تجارت نفع کا سبب ہے تو سبب کو مسبب کی جگہ دی گئی ہے، جیسا کہ سفر، نکاح اور نوم کو مشقت، وطی اور حدث کے قائم مقام کرکے ان پر احکامات جاری کیے گئے ہیں، البتہ سونا، چاندی میں مطلقاً زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں تجارت کی نیت شرط نہیں ہے اگر زیور کی شکل میں ہو تو بھی زکوٰۃ واجب ہوگی:

"وهو أن يكون معدًّا للاستنماء وذلك بالإعداد للإسامة في المواشي والتجارة في غير مال التجارة إلا أن الإعداد للتجارة في الأثمان المطلقة من الذهب والفضة ثابت بأصل الخلقة لأنها لا تصلح للانتفاع بأعيانها في دفع الحوائج الأصلية فلا حاجة إلى الإعداد من العبد للتجارة بالنية إذ النية للتعيين وهي متعينة للتجارة بأصل الخلقة فلا حاجة إلى التعيين بالنية فتجب الزكاة فيها نوى التجارة أو لم ينو أو نوى النفقة"

له امداد الفتاوی ۲/ ۴۳، ۴۴ ته فتاوی دارالعلوم ۶/ ۲۲۱، ۲۲۰ ته بدائع ۲/ ۱۱

نصاب کے لیے نما حقیقی جو اسامہ یا تجارت کے ذریعہ ہو ضروری نہیں ہے، بلکہ نما تقدیری بھی نصاب کی تکمیل کے لیے کافی ہے، علامہ شامی نے زکاۃ کی بحث میں لکھا ہے:

"وهو نوعان حقيقي وتقديري فالحقيقي الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات والتقديري تمكنه من الزيادة بكون المال في يده او يد نائبه"[1]

"انما ولو تقديرا لان النماء نوعان حقيقي يكون بالتوالد والتناسل والتجارات وتقديري يكون بالتمكن من الاستنماء بان يكون في يده او يد نائبه"[2]

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ

انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے جتنی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ سب حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، مثلاً رہنے کا مکان، پہننے کے کپڑے، سواری کے جانور وغیرہا، آج کل سواری کے لیے جیپ کار اور موٹر سائیکل بھی حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں، ملک العلماء کی پوری بحث کا حاصل یہ ہے کہ نقدین کے علاوہ جو سامان بغرض تجارت کے لیے نہ ہوں وہ حوائجِ اصلیہ میں داخل ہیں اور ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، میرے خیال میں ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے حوائجِ اصلیہ کا اعتبار کیا جائے گا۔

چوتھی شرط

دین سے محفوظ ہونا، ہر وہ دین جس کا مطالبہ آدمی کرسکتا ہو، وہ مانعِ وجوبِ زکوٰۃ ہے چاہے یہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا، چاہے یہ دین حال ہو یا مؤجل ہو۔

"ومنها ان لا يكون عليه دين مطالب به من جهة العباد عندنا فان كان فانه يمنع الزكاة بقدره حالا كان او مؤجلا"[4]

۱ے شامی ۲/۲۶۲ ۲ے مجمع الانہر ۱/۱۹۳۔

۳ے شامی ۲/۲۶۲، بدائع ۲/۱۱ ۴ے بدائع ۲/۶۔

بیوی کا مہر وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوگا یا نہیں اس سلسلہ میں صاحب بدائع ۲/۶ اور صاحب مجمع الانہر ۱/۱۹۳ نے فقہاء احناف کے مختلف اقوال نقل کیا ہے، لیکن آج کے دور میں علامہ شامی کی نقل پر عمل ہونا چاہیے کہ بیوی کا مہر کسی حال میں بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع نہیں ہوگا:

"وعن ابی حنیفة لا یمنع .... زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ غیر مانع"[۱]

آج کے دور کے طویل المیعاد قرضے بھی وجوب زکوٰۃ سے مانع ہوں گے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، بلکہ ہر شخص کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا، اس لیے کہ زکوٰۃ کے وجوب کے لیے نصاب کا مالک ہونا ضروری ہے جو نصاب کا مالک ہوگا، اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جو مالک نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی:

"ولو کانت الفضة مشترکة بین اثنین فان کان یبلغ نصیب کل واحد منہما مقدار النصاب تجب الزکوٰۃ والا فلا ویعتبر فی حال الشرکة ما یعتبر فی حال الانفراد"[۲]

لہذا الذی ذکرنا اذا کانت السوائم لواحد فاما اذا کانت مشترکة بین اثنین فقد اختلف فیہ قال اصحابنا انہ یعتبر فی حال الشرکة ما یعتبر فی حال الانفراد وہو کمال النصاب فی حق کل واحد منہما فان کان نصیب کل واحد منہما یبلغ نصابا تجب الزکوٰۃ والا فلا"[۳]

پھر امام شافعی کا اختلاف اور دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"کل جواب عرفتہ فی السوائم المشترکة فہو الجواب فی الذہب والفضة واموال التجارة"[۴]

---

۱ شامی ۲/۲۶۰ ۲ بدائع ۲/۱۹ ۳ بدائع ۲/۲۹ ۴ بدائع ۲/۳۰، شامی ۲/۳۰۳۔

ہیرے جواہرات

ہیرے اور جواہرات کو اگر سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے خریدا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا ارادہ ہے کہ جب ضرورت ہوگی تو بیچ کر ضرورت پوری کی جائے گی یعنی خریداری وفروختگی کی نیت کے ساتھ ہے تو یہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر استعمال کے لیے خریدا ہے تو سونے چاندی کے علاوہ زیورات حوائج اصلیہ میں داخل ہیں یا نہیں مختلف فیہ ہے۔ مجھ کو محسوس ہوتا ہے کہ ان کو حوائج اصلیہ میں داخل ہونا چاہیے؛

"سئل الحسن بن علي عمن لها جواهر ولآلي تلبسها في الاعياد وتتزين بها للزوج وليست للتجارة هل عليها صدقة الفطر قال نعم اذا بلغت نصابا وسئل عنها عمر الحافظ فقال لا يجب عليها شيء وحاصله ثبوت الخلاف في ان الحلي غير النقدين من الحوائج الاصلية، والله تعالى اعلم"[1]

صاحب درمختار نے وضاحت کی ہے کہ ہیرے اور جواہرات میں اگر تجارت کے لیے نہ ہوں، تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی،

"لا زكوٰة في اللآلي والجواهر وان ساوت الفا اتفاقا الا ان تكون للتجارة"[2]

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت جو تاجر کے قبضہ میں ہے ادائیگی زکوٰۃ کے دن ان کی مالیت کا تعین اس دن کی قیمت سے کیا جائے گا، میرے خیال میں متوسط بھاؤ کا اعتبار کیا جائے گا۔

جو لوگ اراضی کی خرید وفروخت ایک تجارتی کاروبار کے طور پر کرتے ہیں اگر وہ زمین شہر میں ہے، عشری یا خراجی نہیں ہے تو وہ مال تجارت ہے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور قیمت کا تعین زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن کی قیمت سے کیا جائے گا، اگر وہ زمین کاشت کی ہے، عشری یا خراجی

---

[1] شامی ۲/۲۶ [2] شامی ۲/۲۶۳

ہے تو علامہ کاسانی نے اس میں مذہب اکا اختلاف نقل کیا ہے، مشہور روایت کے مطابق اس زمین میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ عشر یا خراج واجب ہوگا، تاکہ حق اللہ مضاعف نہ ہوجائے، مثال میں سائمہ مع التجارۃ کو پیش کیا ہے، یعنی اگر کسی کے پاس تجارت کے لیے جانور ہوں اور وہ سائمہ بھی ہوں، تو ان میں سائمہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ تجارت کا مال ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی،

"لو اسیمت للبیع والتجارۃ ففیہا زکوٰۃ مال التجارۃ لا زکوٰۃ السائمۃ"[1]

اسی طرح اگر کسی کے پاس عشری یا خراجی زمین ہو تو اس میں عشر یا خراج واجب ہوگا، زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، ورنہ حق اللہ مضاعف ہوجائے گا، امام محمد علیہ الرحمۃ سے مروی ہے کہ ایسی زمین میں زکوٰۃ اور عشر یا زکوٰۃ اور خراج واجب ہوگا، وجہ یہ ہے کہ عشر پیداوار میں ہوگا اور زکوٰۃ قیمت میں ہوگی، اس لیے ایک مال میں دو حق جمع نہیں ہوں گے، میرے نزدیک امام محمد رحمۃ اللہ کا قول راجح ہے، جانوروں میں سائمہ اور مال تجارت کی زکوٰۃ واجب کرنے میں دو حقوں کے جمع ہونے کا امکان ہے، مثلاً کسی کے پاس اکتالیس بکریاں سائمہ تجارت کے لیے ہوں، اگر وہ سائمہ کی زکوٰۃ دے گا اور مال تجارت کی زکوٰۃ دے گا، تو بھی ایک بکری دے گا اس طرح حق مضاعف ہوجائے گا، کیوں کہ سائمہ کی زکوٰۃ بھی پوری پونجی ہوتی ہے اور مال تجارت کی زکوٰۃ بھی پوری پونجی میں ہوتی ہے لیکن زمین میں زکوٰۃ کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے، عشر صرف منافع یعنی پیداوار میں ہے اور زکوٰۃ صرف قیمت یعنی اصل پونجی میں ہے، مثلاً اگر کسی کے پاس ایک زمین ہے جس کی قیمت ایک لاکھ روپے ہیں اور اس کی پیداوار دس کوئنٹل گندم ہے تو عشر صرف گندم میں ہوگا، اس کی قیمت میں نہیں، اور زکوٰۃ صرف اس کی قیمت میں ہوگی، گندم میں نہیں، تو یہاں دو حق ایک مال میں جمع نہیں ہوں گے، اس لیے اگر تجارت کے لیے عشری یا خراجی زمین ہے تو اس کی قیمت میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائیگی کے وقت کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا:

"قال اصحابنا فیمن اشتری ارض عشر للتجارۃ او اشتری ارض خراج للتجارۃ فیہا العشر او الخراج ولا تجب زکوٰۃ التجارۃ مع احدہما ہو الروایۃ المشہورۃ عنہم وروی عن محمد انہ یجب العشر والزکوٰۃ او ال..."

---

[1] بدائع ۲/۲۰ ۔

هذه الرواية ان زكوة التجارة تجب في الارض والعشر يجب في الزرع وانهما مالان مختلفان فلم يجتمع الحقان في مال واحد. وجه ظاهر الرواية ان سبب الوجوب في الحقين واحد وهو الارض الا ترى انه يضاف الحقان اليهما يقال عشر الارض وخراج الارض وزكوة الارض وكل واحد من ذلك حق الله تعالى وحقوق الله تعالى المتعلقة بالاموال النامية لا يجب فيها حقان بسبب مال واحد كزكوة السائمة مع التجارة[1]"

علامہ شامی نے بھی اسی عبارت کو نقل کیا ہے۔[2]

نصابِ زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں وجوب اور ادائیگی دونوں میں ان کے وزن کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی اگر صرف سونا ساڑھے سات تولہ سے کم ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً اگر صرف سات تولہ ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، چاہے اس کی قیمت ساڑھے باون تولہ چاندی کے برابر کیوں نہ ہو جائے۔ ایسے ہی اگر صرف چاندی ساڑھے باون تولہ ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں:

"فان كان له فضة مصوغة فلا زكوة فيها حتى تبلغ مائتي درهم وزن سبعة[3] وكذا اذا كان له ذهب مصوغ فلا شئ فيه حتى يبلغ عشرين مثقالا والمعتبر وزنهما اداء ووجوبا لا قيمتهما[4]"

اگر تجارت کا مال ہے تو امام ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر چاندی سے خریدا ہے تو چاندی سے دام لگایا جائے گا، اور اگر سونا سے خریدا ہے تو سونا سے دام لگایا جائے گا۔ ورنہ جو سکہ شہر میں زیادہ چلتا ہوگا اس سے دام لگایا جائے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ ہر صورت شہر میں غالب رائج سکہ سے دام لگایا جائے گا۔ لیکن آج کے دور میں جب کہ چاندی اور سونے کا سکہ معدوم ہے

لہ بدائع الصنائع ج ۲ ص [illegible] کہ [illegible] ج ۲ ص [illegible] کہ بدائع ج ۲ ص [illegible]

کہ ہدایہ ج ۱ ص [illegible] ھہ شامی ج ۲ ص [illegible]

صاحبین کا قول قابل عمل نہیں ہے۔ اس لیے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ کے قول پر عمل ہوگا، وہ فرماتے ہیں کہ انفع للفقراء کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر سونا کے ذریعہ دام لگانے سے نصاب ہو جائے تو اسی سے دام لگایا جائے گا، اور اگر چاندی کے ذریعہ دام لگانے سے نصاب ہو جائے تو اسی سے دام لگایا جائے گا۔

"ذکر القدوری فی شرحہ مختصر الکرخی انہ یقوم باوفی القیمتین من الدراھم والدنانیر حتی انہا اذا بلغت بالتقویم بہا الدراھم نصـ ...... وجہ قول ابی حنیفۃ ان الدراھم والدنانیر وان کانا فی الثمـ والتقویم بہما سواء لکنا رجحنا احدھما بمرجح وھو النظر للفقراء والاخذ بالاحتیاط اولی[1] "ولو بلغ باحدھما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ بہ[2] "یقومہا بما ھو انفع للمساکین احتیاطاً[3]"

شیئرز اور باونڈس کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز پر تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر وہ نصاب کے برابر ہو، لیکن شیئر کا جو حصہ عمارات وآلات میں لگا ہوگا، اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اور جو حصہ تجارت میں لگا اس پر اور اس کے نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر وہ شیئر زیادہ میں فروخت ہوتا ہے تو اس حصے کے بقدر جو تجارت میں لگا ہے اور نفع ہوا ہے اس میں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور باقی حصہ عمارات وآلات کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، مثلاً ایک شیئر سو روپے کا تھا، اس میں سے بیس روپے عمارات وآلات میں لگا، اور باقی اسی روپے تجارت میں لگا، اور پندرہ روپے نفع ہوا، تو اب تجارت والی پونجی ۹۵ روپے ہوگئی اور اسی میں زکوٰۃ بھی واجب ہوگی، اب اگر وہ شیئر مثلاً دو سو روپے میں فروخت ہوتا ہے تو ۹۵ روپے تو ۹۵ روپے کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور ایک سو پانچ روپے عمارات وآلات کے مقابلہ میں ہوگا اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور اگر وہ شیئر ایک سو روپے میں فروخت ہوتا ہے تو بھی ۹۵ روپے کے مقابلہ میں ۹۵ روپے ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور پانچ روپے عمارات وآلات

---

[1] بدائع ۲/۲۱ [2] شامی ۲/۲۹۹ [3] ھدایۃ ۱/۱۵۰

کے مقابلہ میں ہوگا، اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی[1]

بونڈس کی رقم دین قوی ہے، اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ قبضہ سے پہلے ادائیگی فوری نہیں ہوگی، کیش کرانے کے بعد گزشتہ برسوں کی زکوٰۃ بھی ادا کی جائے گی۔

مصارفِ زکوٰۃ

۱ــــــ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک شرط ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ رقم طالب علم کے حوالہ کردی جائے پھر وہ کھانے کی قیمت، مکان کا کرایہ اور دوسرے اخراجات ادا کرے گا، جس طرح مستطیع طلبا ادا کرتے ہیں، از خود مکان کے کرایہ اور اساتذہ کی تنخواہوں میں خرچ کردینا صحیح نہیں ہوگا، مدرسہ کا مہتمم زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے نہ کہ طلبا کا۔

۲ــــــ مدرسہ کے معلمین کو زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دی جاسکتی ہے یا نہیں یہ الگ مسئلہ ہے اور مدارس میں کمیشن پر وصول کرانا جائز ہے یا نہیں یہ دوسری بحث ہے۔

جو لوگ اسلامی حکومت کی طرف سے صدقات، زکوٰۃ، عشر وغیرہا، لوگوں سے وصول کرکے بیت المال میں جمع کرنے کی خدمت پر مامور ہوتے ہیں وہی عامل ہیں، اور ان کو زکوٰۃ کی مد سے معاوضہ دیا جاسکتا ہے، اسلامی مدارس اور انجمنوں کے سفرا ان میں داخل نہیں ہیں، اور ان کو زکوٰۃ سے تنخواہ دینا جائز نہیں ہے[2]۔

کمیشن پر وصول کو فقہا نے اجرت کے مجہول ہونے کی وجہ حرام کہا ہے، جواز کے لیے یہ وجہ دکھا کر تنخواہ پر وصول کم ہوتی ہے اور کمیشن پر زیادہ یہ عذر لنگ ہے۔ وصولی میں کمی ذمہ داران مدرسہ کی اپنی میقلس کی وجہ سے ہوتی ہے، یہ خرابی کمیشن کا طریقہ اختیار کیے بغیر بھی دور کی جاسکتی ہے، مثلاً تنخواہ مقرر کیے جانے کے ساتھ وصولی کی ایک حد بھی مقرر کی جائے اور اس میں معمولی کمی زیادتی کو نظر انداز کردیا جائے، غیر معمولی کمی کی صورت میں تنخواہ کم کردی جائے یا ملازمت سے سبکدوش کردیا جائے۔ کمیشن میں بھی

---

[1] مد. خلاصہ از امداد الفتاوی جدید مبوب ۲/۴۱ [2] معارف القرآن، مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ ۴/۳۹۹۔

خرابیاں ہیں، اگر کوئی شخص یکمشت ایک بڑی رقم مثلاً دس ہزار روپے کسی محصل کو حوالہ کردے تو ذمہ داران مدرسہ اس میں کمیشن دینا نہیں چاہتے ہیں، اور آپس میں بدگمانیاں بڑھتی ہیں۔

مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کا مقصد غریبوں کی کفالت ہے، مالداروں سے ان کے مال کا ایک حصہ لیا جائے اور غریبوں پر خرچ کیا جائے:

"فی اموالھم حق معلوم للسائل والمحروم۔"

یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ جہاں کے مالداروں سے لی جائے وہیں کے فقراء پر خرچ بھی ہونی چاہیے، الایہ کہ دوسری جگہ بھیجنے کے وجوہات قوی ہوں، زکوٰۃ کا مقصد مسلمانوں کی عمومی مصالح کی رعایت ہرگز نہیں ہے، آیت میں فقیر و مسکین کے ساتھ بعض دوسرے مصارف کا ذکر ہے تو اس لیے کہ وہ بظاہر فقیر محسوس نہیں ہوتے، مثلاً مسافر جس کے گھر پر دولت کی ریل پیل ہے، لیکن حالت سفر میں وہ کسی وجہ سے محتاج ہوگیا، تو اس کو زکوٰۃ دی جائے گی، حالانکہ وہ حقیقت میں فقیر نہیں ہے اس لیے اگر صرف فقیر و مسکین کا لفظ استعمال کیا جاتا، تو ایسے مسافر کو زکوٰۃ کی رقم دینے میں تامل ہوسکتا تھا، ورنہ اگر فقر کی قید نہ ہو تو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایک آدمی لاکھوں کی دولت کے ساتھ سو کیلو میٹر اپنے وطن سے دور ہے اس کو زکوٰۃ کی رقم اس لیے دی جائے کہ وہ مسافر ہے اور مصرف زکوٰۃ ہے۔

اس لیے اگر احناف نے عاملین کے علاوہ تمام مصارف میں فقر کی بنیادی شرط لگائی ہے تو یہ انتہائی معقول ہونے کے ساتھ ضروری بھی ہے۔

فی سبیل اللہ کی تعیین میں ہمیں دیکھنا ہوگا کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے اس سے کیا سمجھا، ہم لوگ اس سے باہر نہیں جاسکتے۔ اگر قرآن کی تفسیر لغت کی مدد سے ہونے لگے، اور صحابہ وائمہ کرام کی تشریحات کو نظر انداز کردیا جائے تو پھر قرآن کو تحریف سے بچانا مشکل ہوجائے گا، جو لوگ لغت کا سہارا لیکر فی سبیل اللہ میں ہر قسم کے کار خیر کو شامل کرنا چاہتے ہیں، حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب مرحوم نے ان کو غلط کہا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حضرت مفتی صاحب مرحوم کی بحث جو فی سبیل اللہ کے متعلق ہے نقل کردی جائے:

ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے، یہاں پھر حرف فی کا اعادہ کیا گیا ہے، تفسیر کشاف میں ہے کہ اس اعادہ سے اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ مصرف پہلے سب مصارف سے افضل اور بہتر ہے، وجہ یہ ہے کہ اس میں دو فائدے ہیں ایک غریب مفلس کی امداد دوسرے ایک دینی خدمت میں اعانت، کیونکہ فی سبیل اللہ سے مراد وہ غازی اور مجاہد ہے، جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہو چکا ہو مگر اس کے پاس اب مال نہ رہا ہو جس سے وہ حج فرض ادا کرے، یہ دونوں کام خالص دینی خدمت اور عبادت ہیں، اس لیے مال زکوٰۃ کو ان پر خرچ کرنے میں ایک مفلس کی امداد بھی ہے اور ایک عبادت کی ادائیگی میں تعاون بھی اسی طرح حضرات فقہاء نے طالب علموں کو بھی اس میں شامل کیا ہے کہ وہ بھی ایک عبادت کی ادائیگی کے لیے لیتے ہیں، اور صاحب بدائع نے فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہے اور اس کی ادائیگی میں مال کی ضرورت ہے تو وہ بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، بشرطیکہ ان کے پاس اتنا مال نہ ہو جس سے اس کام کو پورا کر سکے، جیسے دین کی تعلیم و تبلیغ اور اس کے لیے نشر و اشاعت کہ اگر کوئی مستحق زکوٰۃ یہ کام کرنا چاہے تو اس کی امداد مال زکوٰۃ سے کر دی جائے مگر مالدار صاحب نصاب کو نہیں دیا جا سکتا"

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان تمام صورتوں میں جو فی سبیل اللہ کی تفسیر میں مذکور ہیں، فقر و حاجتمندی کی شرط ملحوظ ہے، غنی صاحب نصاب کا اس مد میں بھی حصہ نہیں بجز اس کے کہ اس کا موجودہ مال اس ضرورت کو پورا نہ کر سکتا ہو، جو جہاد یا حج کے لیے درپیش ہے، تو اگرچہ بقدر نصاب مال موجود ہونے کی وجہ سے اس کو غنی کہہ سکتے ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں اس کو غنی کہا گیا ہے مگر وہ بھی اس اعتبار سے فقیر و حاجتمند ہی ہو گیا کہ جس قدر مال جہاد یا حج کے لیے درکار ہے وہ اس کے پاس موجود نہیں۔

فتح القدیر میں شیخ ابن ہمام نے فرمایا کہ آیت صدقات میں جتنے مصرف ذکر کیے گئے ہیں ہر ایک کے الفاظ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ وہ فقر و حاجتمندی کی بنیاد پر مستحق ہیں، لفظ فقیر، مسکین میں تو یہ ظاہر بھی ہے، رقاب، غارمین، فی سبیل اللہ، ابن السبیل کے الفاظ بھی اس طرف مشیر ہیں کہ ان کی حاجت روائی کی بناء پر ان کو دیا جاتا ہے، البتہ عاملین کو بطور معاوضہ خدمت دیا جاتا ہے، اس لیے اس میں فقیر و

و فقیر برابر ہیں، جیسے غارمین کے مصرف میں بیان کیا جاچکا ہے کہ جس شخص کے ذمہ دس ہزار روپیہ قرض ہے اور پانچ ہزار روپیہ اس کے پاس موجود ہے تو اس کو بقدر پانچ ہزار کے زکوٰۃ دی جا سکتی ہے، کیوں کہ جو مال اس کے پاس موجود ہے وہ قرض کی وجہ سے نہ ہونے کے حکم میں ہے۔

تنبیہ

فی سبیل اللہ کے لفظی معنیٰ بہت عام ہیں، جو جو کام اللہ کی رضا جوئی کے لیے کیے جائیں وہ سب اس عام مفہوم کے اعتبار سے فی سبیل اللہ میں داخل ہیں، جو لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفسیر و بیان اور ائمہ تفسیر کے ارشادات سے قطع نظر محض لفظی ترجمہ کے ذریعہ قرآن سمجھنا چاہتے ہیں یہاں ان کو یہ مغالطہ لگا ہے کہ لفظ فی سبیل اللہ دیکھ کر زکوٰۃ کے مصارف میں ان تمام کاموں کو داخل کر دیا جو کسی حیثیت نیکی یا عبادت ہیں، مساجد، مدارس، شفا خانوں، مسافر خانوں وغیرہ کی تعمیر کنویں اور پل اور سڑکیں بنانا ان رفاہی اداروں کے ملازمین کی تنخواہیں اور تمام دفتری ضروریات، ان سب کو انہوں نے فی سبیل اللہ میں داخل کر کے مصرف زکوٰۃ قرار دیدیا، جو سراسر غلط ہے اور اجماع امت کے خلاف ہے، صحابہ کرام جنہوں نے قرآن کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے، ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں، ان میں اس لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے اپنے ایک اونٹ کو فی سبیل اللہ وقف کر دیا تھا، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فرمایا اس اونٹ کو حجاج کے سفر میں استعمال کرو[1]۔

امام ابن جریر، ابن کثیر قرآن کی تفسیر روایات حدیث ہی سے کرنے کے پابند ہیں، ان سب نے لفظ فی سبیل اللہ کو ایسے مجاہدین اور حجاج کیلئے مخصوص کیا ہے، جن کے پاس جہاد یا حج کا سامان نہ ہو اور جن حضرات فقہا نے طالب علموں یا دوسرے نیک کام کرنے والوں کو اس میں شامل کیا ہے تو اس شرط کے ساتھ کیا ہے کہ وہ فقیر و حاجتمند ہوں، اور یہ ظاہر ہے کہ فقیر و حاجتمند تو خود ہی مصارف زکوٰۃ میں سب سے پہلا مصرف ہیں، ان کو فی سبیل اللہ کے مفہوم میں شامل نہ کیا جاتا جب بھی وہ مستحق زکوٰۃ تھے، لیکن ائمہ اربعہ

---

[1] مبسوط سرخسی ۳/۱۰ -

اور فقہاء امت میں سے کسی نے نہیں کہا کہ رفاہِ عامہ کے اداروں اور مساجد اور مدارس کی تعمیر اور ان کی جملہ ضروریات مصارفِ زکوٰۃ میں داخل ہیں، بلکہ اس کے خلاف اس کی تصریحات فرمائی ہیں کہ مالِ زکوٰۃ ان چیزوں میں صرف کرنا جائز نہیں، فقہاء احناف میں سے شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط اور شرح سیر اور فقہاء شافعیہ میں سے ابو عبید نے کتاب الاموال میں اور فقہاء مالکیہ میں سے دردیر نے شرح مختصر خلیل میں اور فقہاء حنابلہ میں سے موفق نے مغنی میں اس کو پوری تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔

ائمہ تفسیر اور فقہاء امت کی مذکورہ تصریحات کے علاوہ اگر ایک بات پر غور کر لیا جائے، تو اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہے وہ یہ کہ اگر زکوٰۃ کے مسئلہ میں اتنا عموم ہو کہ تمام طاعات اور عبادات اور ہر قسم کی نیکی پر خرچ کرنا اس میں داخل ہو تو پھر قرآن میں ان آٹھ مصرفوں کا بیان (معاذ اللہ) بالکل فضول ہو جاتا ہے، اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد جو پہلے اسی سلسلہ میں بیان ہو چکا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مصارفِ صدقات متعین کرنے کا کام نبی کو بھی سپرد نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرما دیئے۔

تو اگر فی سبیل اللہ کے مفہوم میں تمام طاعات اور نیکیاں داخل ہیں اور ان میں سے ہر ایک میں زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جا سکتا ہے تو معاذ اللہ یہ ارشادِ نبوی بالکل غلط ٹھہرتا ہے معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے لغوی ترجمہ سے جو ناواقف کو عموم سمجھ میں آتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد نہیں ہے بلکہ وہ ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ و تابعین کی تصریحات سے ثابت ہے۔[۱] (واللہ تعالیٰ اعلم العوفی)

---

[۱] معارف القرآن، مؤلفہ مفتی محمد شفیع صاحب مرحوم، ۴/ ۳۰۸ تا ۳۰۹۔

سوالنامہ کا جواب

از: — مولانا عبد الرحمٰن قاسمی، چھاپی گجرات

حامداً و مصلیاً و مسلماً۔

۱ — مال تجارت کی وہ قیمت جو پیشگی ادا کی جا چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح وہ مال جو خریدار کے ملک میں آ چکا، لیکن قبضہ میں نہیں آیا اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ (۱)

۲ — کرائے کے مد میں پیشگی دی ہوئی رقم کی زکوٰۃ موٴجر مالک مکان پر واجب ہے اور ڈپوزٹ کی رقم مال مرہون ہے اور مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہے اور نہ مرتہن پر ہے لہٰذا ڈپوزٹ رقم کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر ہوگی اور نہ مالک مکان پر، لیکن ڈپوزٹ کی رقم کرایہ دار کو واپس ملنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۳ — مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۴ — رشوت کا مال بینک کا سود وغیرہ حرام مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اور اگر اموال حرام حلال مال میں مخلوط ہو گئے ہوں تو اس مخلوط مال سے حرام کی مقدار نکال کر باقی اگر بقدر نصاب بچتا ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

۵ — دین اگر قوی (جو قرض اور مال تجارت کا بدل) ہو تو اس کی زکوٰۃ دائن پر چالیس درہم کی مالیت

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۲

قبضہ میں کرنے کے وقت واجب ہے، نیز ایام ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ اگر متوسط (جو ایسے مال کے عوض میں واجب ہوا ہو جو تجارت کے واسطے نہ تھا اور نہ نقد قرض دیا تھا) اور ضعیف (جو مال کا بدل نہ ہو) تو اس کی زکوٰۃ دائن پر بعد قبضہ کے حولانِ حول پر واجب ہے۔

اگر مدیون باوجود قدرت کے دین کی ادائے گی میں ٹال مٹول کر رہا ہے اور اس مال کو تجارت میں لگا کر استفادہ کر رہا ہو تو اگر مدیون کے قرض کو منہا کرنے کے بعد اس کے پاس نصاب بچتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

دین کی وصولیابی کی امید قوی یا غالب ہو تو اس میں زکوٰۃ واجب ہے، پھر اگر وہ دین قوی ہو تو اس پر عند القبض فیما مضی کی زکوٰۃ واجب ہے، اور اگر دین متوسط یا ضعیف ہو تو بعد القبض حولانِ حول پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو یا ضعیف امید ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

۲ــــــ پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم پر وصولیابی کے بعد سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہے۔

دوسری شرط نما

وجوبِ زکوٰۃ کی ایک شرط نما (مال نصاب کا بڑھنے والا ہونا) ہے نما کی دو صورتیں ہیں، ایک حقیقۃً بڑھنے والا ہو یعنی توالد و تناسل و تجارت سے بڑھنے والا ہو، دوسری صورت تقدیراً (حکماً) بڑھنے والا ہو یعنی حقیقت میں تو بڑھنے والا نہ ہو لیکن وہ بڑھنے والے کے حکم میں ہو کہ اگر مالک اس کو بڑھانا چاہے تو وہ بڑھانے پر قادر ہو اس طرح پر کہ مال اس کے یا اس کے نائب کے قبضے میں ہو پس جو شخص اس کے بڑھانے پر قادر نہیں مثلاً مالِ ضمار اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ میں مشغول وہ مال شمار ہوتا ہے جو انسان کو حقیقۃً یا تقدیراً ہلاک ہونے سے بچائے (مجمع الانہر) ہے۔

* (حاجته الاصلية) اى عما يدفع عنه الهلاك تحقيقاً او تقديراً (۲۶/۱)

حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ہر ماحول کے لحاظ سے ہوگا۔

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے

دین مانع زکوٰۃ سے وہ دین مراد ہے جس کا طلب کرنے والا کوئی بندوں کی طرف سے ہو، خواہ وہ دین بندوں کا ہو جیسا کہ قرض اور ہول لی ہوئی چیز کی قیمت اور تلف کی ہوئی چیزوں کا ضمان یا زخمی کرنے کا تاوان ہو اور قرض چاہے نقد کی قسم سے ہو یا کیلی وزنی ہو یا کپڑے ہوں یا جانور ہوں یا خلع کے عوض میں واجب ہوا ہو یا عمداً قتل کرنے کے عوض میں صلح ہو کر واجب ہوا ہو اور وہ فی الحال دینا ہو یا کسی قدر مدت کے بعد دینا ہو اور وہ قرض خواہ اصالۃً ہو یا کفالۃً ہو، اور خواہ وہ قرض اللہ کا قرض ہو، جیسا کہ زکوٰۃ اور خراج کا دین۔ بخلاف نذر اور کفارہ اور حج کے دین کے اس لیے کہ ان قرضوں کا طلب کرنے والا کوئی بندہ نہیں اور اسی طرح صدقۃ الفطر اور حج تمتع کرنے والے کی ہدی اور قربانی کا دین مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

دین طویل الاجل جیسے زراعتی قرض، تعمیر مکان کے لیے قرض مانع زکوٰۃ ہے لہٰذا اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا کیا جائے گا۔ (۱)

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے خریدے ہوں یا تزئین و آرائش کے لیے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ (۲)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی مالیت کا تعین ادائے گی زکوٰۃ کے دن قوت خرید کے اعتبار سے کیا جائے گا، پھر جو تاجر تھوک مال کی تجارت کرتا ہے اس کے لیے تھوک بھاؤ کا اعتبار کرنا ہوگا، اور جو تاجر پھٹکر مال فروخت کرتا ہے اس کے لیے پھٹکر فروختگی کا اعتبار کرنا ہوگا۔

---

(۱) ھدایہ ۱/۱۹۶، الجوھرۃ النیرۃ ۱/۱۴۹، عالمگیری ۱/۱۷۲ ۔ (۲) فتاویٰ ھندیہ ۱/۱۸۰

کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

اراضی تجارت اگر خراجی ہیں تو ان میں خراج واجب ہے زکوٰۃ نہیں، اور اگر عشری ہیں تو ان میں عشر واجب ہے زکوٰۃ نہیں، لیکن امام محمد رح کے نزدیک عشر کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ بھی واجب ہے (لہٰذا امام محمد رح کے قول کو اختیار کرنا مناسب ہے کیوں کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے)۔ (۱)

اراضی تجارت اگر نہ عشری ہوں اور نہ خراجی ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور ان پر زکوٰۃ کا وجوب ادائے گی کے دن کی متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

(۱) شیرز کی خرید بغرض تجارت ہو تو تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(۲) شیرز کی مالیت کا تعین بوقت ادائے گی زکوٰۃ مارکیٹ کے نرخ سے کیا جائے گا۔
شیرز کی خرید بغرض ذریعہ آمدنی ہو تو آلات و اثاثہ کے علاوہ جو اصل و منافع ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔

(۳) قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈس پر لگایا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ بونڈ کیش کرانے کے وقت گذرے ہوئے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔ (۲)

نصاب موجب زکوٰۃ

صرف سونا ہو یا بقدر نصاب سونا ہو تو اس میں سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

صرف چاندی ہو یا بقدر نصاب چاندی ہو تو اس میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

---

(۱) تاتارخانیہ ۲/۲۳۳ - بحر ۲/۲۰۹

(۲) درمختار علی هامش ردالمحتار ۲/۲۶۶

سونا، چاندی دونوں نصاب سے کم ہوں تو دیکھا جائے گا، دونوں کی قیمت مل کر کسی ایک نصاب کے بقدر ہو جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہے ورنہ نہیں۔

اموال تجارت کی قیمت اگر دونوں (سونا، چاندی کے) نصاب کو پہونچ جاتی ہے تو اختیار ہے جس نصاب کا چاہے اعتبار کرے اور اگر دونوں نصابوں میں سے صرف ایک نصاب کو پہونچتی ہے تو اسی نصاب کا اعتبار کرنا ضروری ہے۔ (۱)

نصاب حرمتِ زکوٰۃ

مالدار کو جو نصاب کا مالک ہو زکوٰۃ دینا جائز نہیں ہے خواہ وہ نصاب کسی بھی قسم کے مال کا ہو بشرطیکہ اس کی حاجت اصلیہ سے زائد ہو پھر اس بارے میں اختلاف ہے کہ حرمتِ زکوٰۃ کے لیے نصابی اموال (سونا، چاندی، سائمہ) میں ان کے نصاب کی مقدار کا اعتبار ہے یا قیمت کے حساب سے نقدی کے نصاب کا اعتبار ہے۔ بعض نے نصابی اموال میں ان کے نصاب کا اعتبار کیا ہے اور بعض نے قیمت کا اعتبار کیا ہے۔ نصابی اموال کے علاوہ میں بالاتفاق قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اور موجودہ دور میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

مصارف زکوٰۃ

مستحق زکوٰۃ طلبہ کو چیک کی بجائے رقوم زکوٰۃ دی جائے اور وہ وصول کرنے کے بعد مدرسہ میں جمع کردیں، یہ صورت جائز ہے۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے۔

سفراء و محصلین کو کمیشن پر رکھنا صحیح نہیں ہے اور نہ وہ العاملین علیہا میں داخل ہیں، اور عملہ کو ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا جائز نہیں ہے۔

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۹

فی سبیل اللہ

(۱) سورہ توبہ کی آیت "انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللّٰہ وابن السبیل فریضۃ من اللّٰہ واللّٰہ علیم حکیم" میں انما سے جو حصر بیان کیا گیا ہے وہ حصر حقیقی ہے۔

(۲) جی ہاں، ہم جمہور مفسرین اور فقہاء کی اس بات سے پورے طور پر متفق ہیں کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب وسنت میں مطلق طور پر ہو تو اس سے مراد غزوہ وجہاد ہی ہوتا ہے۔ (۱)

(۳) آیات احکام میں سے کسی آیت کی تشریح میں قرون اولیٰ میں صرف دو قول پائے جاتے ہوں تو ہمارے لیے لازم وضروری ہے کہ ان دو اقوال میں سے ایک قول کو اختیار کریں۔ ان دو اقوال کو چھوڑ کر آیت کی تفسیر وتشریح میں کوئی تیسرا یا چوتھا قول اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔

(۴) الف :۔ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی ہے اور فی سبیل اللہ کے دائرہ میں صرف الغزاۃ الفقراء اور المحتاج الفقراء ہیں۔

ب :۔ فی سبیل اللہ کا مصداق غازی کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر کی شرط ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل نہیں ہیں اور فی سبیل اللہ کا مصداق جہاد عسکری پر قیاس کرتے ہوئے جہاد قلمی، جہاد فکری، جہاد ثقافتی پر زکوٰۃ کی رقم صرف کرنا جائز نہیں ہے، نیز اصولاً بھی اس کی گنجائش نہیں ہے کہ مصارف زکوٰۃ پر قیاس کرتے ہوئے کچھ اور قسموں کو مصارف زکوٰۃ میں شامل کر لیا جائے۔

(۶) فی سبیل اللہ کا دائرہ وسیع کرنے کی گنجائش نہیں ہے اور تعمیم وتوسیع کے قول کو اختیار کرنا صحیح نہیں ہے۔ فقط واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب وعلمہ اتم واکمل۔

---

(۱) ھدایہ ۱۴۵/۲

جوابات ضمیمہ سوالات

حامداً و مصلیاً و مسلماً ۔

شیئرز پر زکوٰۃ کے وجوب کی تفصیل یہ ہے:

۱ــــــ شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو اور ابھی تک نیت تجارت میں تبدیلی نہ آئی ہو (چاہے زیادہ مدت پاس رکھا جائے یا کم مدت) تو شیئرز کی موجودہ مارکیٹ قیمت اور اس سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

● ـــــ: شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت ہو پھر نیت تجارت میں تبدیلی آگئی یعنی شیئرز کو ذریعہ آمدنی بنادیا تو شیئرز کی جو رقم آلات واثاثہ میں لگ گئی اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیئرز کی جو رقم آلات واثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور شیئرز سے ہوئی آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے شیئرز چاہے کم مدت پاس رہے یا زیادہ مدت ۔

● ـــــ، شیئرز کی خرید اگر بہ نیت تجارت نہ ہو بلکہ بہ نیت ذریعہ آمدنی ہو تو شیئرز کی اصل میں سے جو رقم آلات واثاثہ میں لگ گئی ہے اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور شیئرز کی اصل میں سے جو رقم آلات واثاثہ کے علاوہ ہے اس رقم اور آمدنی دونوں پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

وجوب زکوٰۃ صافی آمدنی پر یا غیر صافی آمدنی پر ؟

● ـــــ، اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی ہیں تو آمدنی سے منہا کر دیے جائیں گے، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ، اور اگر از قبیل دیون شرعی نہیں ہیں، جیسے سیل ٹیکس، انکم ٹیکس وغیرہ تو ان کو آمدنی سے

منہا نہیں کیا جائے گا۔

- ---: اخراجات اگر یوم وجوب ادا سے پہلے ادا کر دیے گئے ہیں تو بقیہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- ---: اخراجات اگر یوم وجوب ادا سے پہلے ادا نہیں کیے گئے ہیں تو اس کی دو صورتیں ہوں گی۔

(۱) اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی ہیں، جیسے ملازمین کی تنخواہیں وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا کر دیے جائیں گے۔

(۲) اخراجات اگر از قبیل دیون شرعی نہیں، جیسے انکم ٹیکس وغیرہ تو آمدنی سے اخراجات منہا نہیں کیے جائیں گے۔

- ---: شیئرز کو مسلسل خرید ا اور بیچا جاتا ہو، نفع بھی ہوتا ہو اور نقصان بھی تو یوم وجوب ادا شیئرز کی جو پوزیشن ہو اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے۔

۲ ---: کاروباری ادارہ میں کاروبار سے ہونے نفع اور موجودہ اسٹاک میں جن اشیاء کی خرید بغرض تجارت ہوئی ہو ان تمام پر شرعاً واجب ہے۔

- ---: جانوروں کی خرید اگر بنیت تجارت (خرید و فروخت) ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ (منافع) دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔
- ---: جانوروں کی خرید اگر بنیت تجارت نہ ہو تو ان جانوروں اور ان سے حاصل شدہ دودھ، انڈوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، البتہ دودھ، انڈے فروخت کر دیے جائیں تو ان کے اثمان پر زکوٰۃ واجب ہے۔

۳ ---: تمسکات سے کیا سرکاری تمسکات مراد ہیں؟ یا اس کے علاوہ مراد ہے؟ پہلے اس کی وضاحت کی جائے، نیز اخراجات کی مکمل وضاحت کی جائے۔ اس کے بعد جواب لکھا جا سکتا ہے۔

انٹرسٹ سے متعلق

مذکورہ حالات میں حکومت کی سیکورٹیز، بانڈز میں اور کمپنیوں کی فکسٹ ڈپازٹس میں سرمایہ کاری جائز قرار نہیں دی جاسکتی۔ فقط واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔

سوالنامہ کا جواب

از ــــــــــــ ـ ـ مولانا اشرف علی

جواب (۱)

اقسام اموال اور وجوب زکوٰۃ :

زکوٰۃ ان اموال میں واجب ہوتی ہے جو کچھ دنوں تک باقی رہنے والے ہیں اور ان میں خلقتاً یا عملاً نشوونما ہے۔ اس طرح اموال چار ہیں۔

(۱) سونا چاندی اور نقد (۲) حیوانات، سوائم (۳) زمین کی پیداوار

(۴) تجارت کا سامان جو بنیت تجارت خریدا جائے۔

وجوب زکوٰۃ کی شرطیں

وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے پہلی شرط ملک تام ہے۔ ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال پر صاحب مال کا قبضہ ہو اور وہ اس میں تصرف کرنے پر قادر ہو جسے ملک ید اور ملک تصرف سے تعبیر کیا جاتا ہے

اس ذیل میں قائم کردہ سوالات کے جوابات بالترتیب ملاحظہ ہوں۔

(۱) تجارت کی غرض سے خریدے ہوئے مال پر قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اس مال کی پیشگی ادا کردہ قیمت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ (بحوالہ شامی جلد ۲ ص ۲۷۶ طبع مصر)

"فلا یجب علی المشتری فیما اشتراہ للتجارۃ قبل القبض؛

اور شامی[1] میں بھی ایسا ہی مذکور ہے۔ اور شامی[2] ہی میں ہے؛

قلت ینبغی لزومہا علی المشتری فقط علی القول الذی

علیہ العمل الآن من ان بیع الوفاء منزل منزلۃ الرھن؛

جواب۲: کرائے کے مد میں پیشگی دی گئی رقم یا ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہوجانے کے بعد واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ مالک پر ہوگی۔

" اما زکوٰۃ اجرۃ المعجلۃ عن سنین فی الاجارۃ الطویلۃ........

فتجب علی الآجر لانہ ملکہا بالقبض؛ (۳)

لیکن بہتر یہ ہے کہ دونوں زکوٰۃ ادا کردیں۔

" وفی الخلاصۃ الاحتیاط ان یزکی کل منہما؛ (۴)

جواب(۳): وہ اموال جن کا مالک معین شخص نہیں ہوتا اور وہ رفاہ عام میں صرف ہوتے ہیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ "فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک؛ (۵)

جواب(۴): حرام ذریعے سے حاصل شدہ مال کل واجب التصدق ہے اس میں زکوٰۃ کا وجوب نہیں البتہ اگر کسی کی ملک میں حرام اور حلال مال اس طرح مخلوط ہوں کہ ان میں تمیز مشکل ہو تو زکوٰۃ مجموعہ مال میں واجب ہوگی یعنی نصاب میں حرام مال بھی شامل کیا جائے گا۔ شامی[6] میں ہے:

"لا زکوٰۃ فی المغصوب والمملوک شراءً فاسداً والمراد بالمغصوب

مالم یخلطہ بغیرہ لعدم الملک؛

جواب(۵) دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوگی۔ مدیون دین کی رقم ادا کرنے میں ٹال مٹول کررہا ہو یا تجارت میں لگا کر استفادہ کررہا ہو ان دونوں صورتوں میں دائن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

جس قرض کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو اس پر زکوٰۃ وصول سے پہلے

---

(۱) شامی ۲/۶ (۲) شامی ۲/۹ (۳) فتح القدیر ۲/۱۶۴ (۴) ۲/۱۶۴

(۵) شامی ۲/۳ (۶) شامی ۲/۵

واجب نہیں ہوگی، اور جس قدر وصول ہوگی سالان حول کے بعد صرف اسی مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر قرض ایسے شخص کے ذمے ہے جو انکار کر رہا ہے، ایسی صورت میں اگر گواہ مل گئے تو ان کی گواہی کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہو جائے گی مگر زکوٰۃ کی ادائے گی کا وجوب وصول کے بعد ہوگا، اور صرف مستقبل کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فتح القدیر میں ہے:

"ومن له على آخر دين فجحده سنين ثم قامت له البينة لم يزكه لما مضى" (۱)

جواب (۲): پراویڈنٹ فنڈ کی رقم جو بقدر نصاب ہو اس میں وصول کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نما ہے

نما کی حقیقت یہ ہے کہ مال اضافے کے لیے تیار کیا گیا ہو۔ بدائع الصنائع میں ہے:

"وذلك المال النامي على التفسير الذي ذكرناه او يكون المال معدًا للاستنماء وذلك بالاعداد للاسامة وفي المواشي والتجارة في اموال التجارة" (۲)

نما کی دو صورتیں ہیں۔ (۱) حقیقی (۲) تقدیری

نما حقیقی: توالد و تناسل اور تجارت سے ہوتا ہے۔

نما تقدیری: جس میں مال میں اضافہ کرنے کی صلاحیت پر قدرت حاصل ہو۔

نما حقیقی کی دو قسمیں ہیں:

(۱) خلقی: جیسے سونا اور چاندی۔

(۲) فعلی: سونا اور چاندی کے علاوہ وہ سامان جس میں تجارت یا اسامت کی جہت سے اضافہ ہوتا ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

منها كون النصاب ناميًا حقيقة بالتوالد والتناسل والتجارة

---

(۱) فتح القدير ۱۶۴/۲ (۲) بدائع الصنائع ۱۱/۲

أو تقديرًا أن يتمكن من الاستنماء (۱)

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ۔

ہر وہ مال جس سے انسان کی حفاظت ہو سکتی ہو تحقیقاً یا تقدیراً، وہ حاجت اصلیہ ہے، جیسے نفقہ، رہنے کے لیے مکان، آلات حرب، گرمی و سردی سے بچنے کے لیے کپڑے اور اس کے لوازمات، آلات حرفت، گھر کے سامان، سواری کے حیوانات، اہل علم کے لیے کتابیں، قرض۔ بحر الرائق میں ہے:

"ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً" (۲)

حالات اور ماحول کے بدلنے سے ضروریات انسانیہ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے، اس لیے حاجت اصلیہ کا تعین دور اور ماحول کے حساب سے ہوگا۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

مانع زکوٰۃ دین: ہر وہ دین جس کا مطالبہ من جہۃ العباد ہو زکوٰۃ سے مانع ہے، جیسے قرض، مبیع کی قیمت اور جراحت وہلاکت کا تاوان اور دین زکوٰۃ وغیرہ۔

دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

(۱) دین قوی: جو واجب ہو مال تجارت کے بدلے مثلاً سامان تجارت کی قیمت۔

(۲) دین متوسط: جو واجب ہو بدل ایسے مال کا جو تجارت کے لیے نہیں ہے، جیسے خدمت کے لیے غلام کی قیمت۔

(۳) دین ضعیف: جو واجب ہو کسی شئی کا بدل بن کر جائے اس کی داخلت کے بغیر ہو، جیسے میراث وغیرہ، یا مداخلت سے ہو جیسے وصیت، یا بدل ایسی چیز کا ہو جو مال نہیں، جیسے مہر۔

---

(۱) فتاوی عالمگیری ۱/۹۹ (۲) بحر الرائق ۲/۲۲۲

احکام:

(۱) دین قوی میں حولانِ حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور ادائے گی متاخر ہوتی ہے یہاں تک کہ ایک خمس نصاب پر قبضہ ہو جائے اور اس مقبوض کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کیا جائے اسی حساب سے بقیہ میں بھی ادا کیا جائے گا۔ طویل الاجل دین میں جس میں قرض کی ادائے گی قسط وار ہوتی ہے اس کی ادائے گی میں ہر سال اموال زکوٰۃ سے پورا قرض منہا کیا جائے گا، صرف واجب الادا قسط منہا نہیں کی جائے گی۔

(۲) دین متوسط میں، مال پر قبضے کے بعد جب حولانِ حول ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

(۳) دین ضعیف میں جب پورا مال قبضے میں آجائے اور اس کے بعد حولانِ حول ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ (۱)

کن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے؟

جو اموال کہ نامی ہوں، فارغ عن الدین والحاجۃ الاصلیہ ہوں اور ملک میں یداً و تصرفاً داخل ہوں ان میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی بلکہ کمپنی کے شرکاء میں سے جو لوگ کہ صاحب نصاب ہوں انھیں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کمپنیاں دو طرح کی ہوتی ہیں۔

ایک تو وہ ہے جو اپنے شرکاء سے رقم وصول کرنے کے بعد ایسا سامان مہیا کرتی ہے جو خود فروخت ہوتے ہیں۔ اور دوسری وہ کمپنیاں ہیں جو رقم سے ایسے سامان خریدتی ہیں کہ ان سامانوں کو اجارے پر چلاتی ہیں۔ اول الذکر کمپنی میں لگی ہوئی رقم کو نصاب میں شامل کرنا ہوگا اور مؤخر الذکر کمپنی میں جو آمدنی ہوگی وہ

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۰

نصاب میں جوڑی جائے گی، اصل رقم حاجت اصلیہ میں داخل ہوگی۔

ہیرے اور جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کی غرض سے ذخیرہ کئے جائیں تو ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اسی طرح عورتوں کی تزئین اور آرائش کے سامان۔ عالمگیری میں ہے،

" وکذا طعام اهله وما یتجمل به بین الاوانی اذا لم یکن من الذهب والفضة وکذا الجوهر واللؤلؤ والیاقوت والبلخش والزمرد ونحوها اذا لم یکن للتجارة " (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

سامان تجارت کی زکوٰۃ کی ادائے گی، ادائے گی کے وقت کی قیمت فروخت کے اعتبار سے ہوگی اور تھوک تجارت کرنے والا تھوک قیمتِ فروخت کے اعتبار سے اور پرچون تجارت کرنے والا پرچون کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا۔

جو لوگ زمین کی خرید و فروخت تجارتاً کرتے ہیں ان کو زمین کی مالیت بھی نصاب میں شامل کرنی ہوگی اور مالیت کا اندازہ زکوٰۃ کے وجوب کے وقت کی قیمت سے ہوگا۔

شیرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص میں تجارتی سرمایہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور زکوٰۃ کی ادائے گی کے وقت جو نرخ مارکیٹ کا ہوگا اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

اور بونڈز میں جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ وصول ہو جائے اور گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

---

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۱/۸۸

نصابِ زکوٰۃ

سونا اور چاندی میں ہر ایک کی مستقل مالیت ہونے کی وجہ سے دونوں کا الگ الگ مستقل نصاب ہے۔ موجودہ دور میں فقہاء کی تشریح ما ھو انفع للفقراء کے ضابطے سے دیگر اشیاء میں نصابِ زکوٰۃ کا تعین چاندی کے حساب سے کیا جائے گا۔

مصارفِ زکوٰۃ

(۱) مدارس کے ذمہ داران، طلبہ کو ان کے قیام وطعام اور تعلیم پر ہونے والے اخراجات مثلاً ۲۵۰/- فی طالب علم مقرر کر کے مدِ زکوٰۃ سے دے دیں اور پھر فرج کے مد میں جمع کرالیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ اسی طرح اتنی رقم کا چیک طلبہ کو دے دیں اور طلبہ اس چیک کو مدرسہ میں جمع کر دیں تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دینے والے کا وکیل ہوتا ہے۔

(۲) زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر لوگوں کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن کی صورت میں معاوضہ دینا ناجائز ہے، اس لیے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔

زکوٰۃ کی آمد و خرچ کا حساب کرنے والے عملہ کی تنخواہ کی ادائیگی زکوٰۃ کی رقم سے نہیں کی جا سکتی۔

مصرفِ زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصرفِ زکوٰۃ میں وارد آیت "انما الصدقات للفقراء والمساکین الآیۃ" میں کلمۂ انما کے حصرِ حقیقی ہونے پر جمہور مفسرین اور فقہاء کا فیصلہ درست ہے، آیت کا موقع نزول اسی بات کی تائید کرتا ہے۔

(۲) لفظ فی سبیل اللہ کے اطلاق سے جمہور مفسرین کا فیصلہ کہ اس سے مراد غزوہ اور جہاد ہے، یہی صحیح ہے۔

(۳) فی سبیل اللہ کی تشریح میں دو قول غزوہ اور حج کے علاوہ کارِ خیر میں مصروف ان لوگوں کو بھی کہا جا سکتا ہے جو اپنے عمل پر اپنے کو اجرت کا مستحق نہیں سمجھتے اور دینے والا بھی حق اجرت سمجھ کر نہ دیتا ہو

(۴) الف، مذکورہ بالا ۔ ۔ ۔ ات کو سامنے رکھتے ہوئے زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ میں غازی اور حاج کے علاوہ اس کے عام معانی ہر کار خیر میں مصروف وہ بھی لوگ آسکتے ہیں جو علا استحقاق اجرت عمل سمجھتے ہوئے خدمت دین میں مصروف ہیں داخل ہوں گے، اور چوں کہ زکوٰۃ میں تملیک بلا عوض شرط ہے اس لیے رفاہی امور فی سبیل اللہ میں داخل نہیں ہوں گے۔

(ب) فی سبیل اللہ کے مصداق میں شامل ہونے والے لوگ بشرط فقر مستحق زکوٰۃ ہوں گے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہیں لیکن قیاس کرتے ہوئے مقیس علیہ کی علت تامہ سے مقیس کی تطبیق بالکلیہ ہونی چاہیے۔ اس لیے جہاد قلمی، جہاد فکری اور جہاد ثقافتی پر زکوٰۃ کی رقم صرف نہیں کی جائے گی۔

(۶) دور حاضر میں ترقیات پر جدید وسائل کے پیش نظر دینی کاموں کی ضروریات اور مصارف میں اضافہ اگرچہ بہت ہو چکا ہے اس کے باوجود فی سبیل اللہ کے مفہوم میں اتنی وسعت دی جائے گی کہ زکوٰۃ کی اصل روح باقی رہے اور زکوٰۃ کی رقم غیر مصرف میں خرچ نہ ہونے پائے۔

(۷) جمہور نے فی سبیل اللہ کی تشریح جو غازی اور حاج سے کی ہے اس سے فی سبیل اللہ کا دائرہ اس حد تک متعین ہو جاتا ہے کہ جو لوگ دین کی حفاظت اور اشاعت میں مصروف ہوں اور ان کی یہ مصروفیت للّٰہیت پر مبنی ہو اور اس عمل پر اپنے کو کسی اجرت کا امیدوار نہ سمجھتے ہوں فی سبیل اللہ کے دائرہ میں آسکتے ہیں۔

جوابات ضمیمہ سوالات بابت زکوٰۃ

(۱) شیئرز کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت اس کی بازاری قیمت ۔ ۔ ۔ ۔ حاصل شدہ آمدنی پر زکوٰۃ واجب ہوگی، زکوٰۃ ادا کرنے کی یہی صورت شیئرز کی مسلسل خرید و فروخت کے طریقے میں ہوگی۔

(۲) کاروباری ادارہ اگر سامان ہی خرید و فروخت کرتا ہے تو بقدر نصاب ہونے کی صورت میں حولان حول کے بعد موجودہ مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مثلاً حیوانات کی تجارت کرنے والے حیوانات ہی کو خریدتے بیچتے ہیں تو اگر سال کے شروع میں حیوان کی قیمت بقدر نصاب ہو تو حولان حول کے وقت موجودہ حیوانات کی قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر کمپنی اصل سامان

کو فروخت کرنے کی بجائے اس سے پیدا ہونے والے سامانوں کو فروخت کرتی ہے تو زکوٰۃ آمدنی پر واجب ہوگی، مثلاً گائے بھینس وغیرہ کے دودھ کی تجارت کی جائے تو گائے بھینس کی قیمت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ دودھ کی قیمت جو نصاب کے بقدر ہو جائے اور اس پر حولانِ حول بھی ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۳) شخصی اخراجات کا کوئی معیار مقرر نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) سود کی حرمت میں تخفیف لانے کی غرض سے اس کی تشریح و تعبیر میں جو بھی ردوبدل کیا جائے وہ سود کی حرمت میں تخفیف پیدا نہیں کر سکتے البتہ الفاظ کی اس ہیرا پھیری سے لوگوں کو خود دھوکے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ اس لیے سود کے لیے بہتر سے بہتر جو بھی الفاظ استعمال کیے جائیں ان سے سود کا جواز ثابت نہیں ہوگا۔ ہندوستان میں ہر چہار طرف حکومتی سطح پر ہونے والے کاروبار میں سود کے جزو لازم ہونے کی وجہ سے سود کے کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ مسلمان بہ حیثیت مجموعی مجبور نہیں ہے، بلکہ حکومت سے اس کے لیے الگ قانون بنانے کی مانگ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ اپنے مذہبی تشخص کو باقی رکھنے کے لیے مسلم پرسنل لا منظور کرا کے اپنا وجود قائم کیے ہوئے ہے۔ البتہ وہ لوگ جن کے پاس ذریعہ معاش کی کوئی صورت نہ ہو تو وہ لوگ بہ درجہ مجبوری سوال میں مذکورہ کمپنیوں میں شرکت کر سکتے ہیں۔

اسلام کا نظامِ زکوٰۃ

مفتی نسیم احمد قاسمی ———— رفیق اسلامک فقہ اکیڈمی

موجودہ معاشی مسائل و مشکلات کا حل

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا اہم ترین مالی فریضہ ہے، جس کی فرضیت کتاب و سنت اور اجماع امت سے ثابت ہے، اسلام کا نظام زکوٰۃ اجتماعی عدل اور تضامن و تکافل کا بہترین آئینہ دار ہے۔ اس کے اندر معاشرہ کے تمام معاشی اور اقتصادی مسائل و مشکلات کا حل موجود ہے۔ اسلام کے نظام زکوٰۃ کے نفاذ اور قیام کے ذریعہ ایک ایسے پاکیزہ اور صاف ستھرے معاشرہ کی تشکیل کی جا سکتی ہے جس میں امیر اور غریب، حاکم اور محکوم، صنعت کار اور مزدور ہر طبقہ کے لوگ ایک دوسرے سے سیر و شکر ہو کر اعتماد و باہمی کے ساتھ زندگی گزاریں۔ نہ امیر غریب سے نالاں ہو اور نہ غریب امیر سے شاکی۔ اسلام کے نظام زکوٰۃ کے ذریعہ دولت و ثروت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے اور دولت و ثروت سے ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری کا خاتمہ ہوتا ہے۔ اس میں نہ تو فقراء و مساکین کا استحصال ہوتا ہے اور نہ ہی امراء اور اہل ثروت پر ظلم۔ آج دنیا کا جو معاشی ڈھانچہ اپنا توازن کھو بیٹھا ہے اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس نظام میں ہر طبقہ کے حقوق کی یکساں طور پر رعایت نہیں کی گئی ہے۔ آج کے موجودہ نازک حالات میں اس کی سخت ضرورت ہے کہ اسلام کا "اجتماعی نظامِ زکوٰۃ" قائم کیا جائے۔ زکوٰۃ مالداروں سے اجتماعی طریقے پر وصول کی جائے، اور اس کے صحیح مصارف پر خرچ کی جائے۔ اس کے لئے ایک مضبوط اور منظم نظام قائم کیا جائے تاکہ زکوٰۃ کی رقم کا استعمال صحیح طریقے سے ہو سکے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی جو اسلامک بینکنگ پر قابل قدر کام کر چکی ہے اسے اس طرف بھی پیش قدمی کرنی چاہئے۔ اور اسلام کے اجتماعی نظامِ زکوٰۃ کے قیام کی راہ میں جو دشواریاں اور مشکلات حائل ہیں ان کے حل کے لئے علماء، ماہرین فقہ و فتاویٰ اور قانون

واقوں کی مدد سے کر اس کا ایک عملی خاکہ امت کے سامنے پیش کرے تاکہ امت کو اس کی خوبیوں سے بہرہ ور ہونے کا زریں موقع مل سکے ۔ اسلام کے اجتماعی نظام زکوۃ میں وہ تمام خوبیاں اور محاسن موجود ہیں جنہیں لوگ انشورنس اور اس طرح کے دیگر نظاموں میں تلاش کرتے ہیں ۔

زکوۃ کی لغوی اور اصطلاحی تعریف

زکوۃ "زکا" کا مصدر ہے جو بڑھوتری اور زیادتی کے معنی میں آتا ہے ۔ زکوۃ کا لفظ طہارت اور پاکیزگی کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے قد افلح من زکاھا ۔ کامیاب ہوگیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاکیزہ بنایا ۔ اور شرعاً زکوۃ ایک ایسا حق ہے جو مال مخصوص میں واجب ہوتا ہے ۔ حنفیہ کے نزدیک زکوۃ کی اصطلاحی تعریف یہ ہے :

"مال مخصوص کے ایک حصہ کا شخص مخصوص کو مالک بنا دینا جسے شارع نے اس کا حقدار بنایا ہے اور یہ تملیک محض رضائے الٰہی کی خاطر ہو" [۱]

کنز میں زکوۃ کی یہ تعریف کی گئی ہے :

"ھی تملیک المال من فقیر مسلم غیر ھاشمی ولا مولاہ بشرط قطع المنفعۃ عن الملک من کل وجہ للہ تعالیٰ" [۲]

یعنی زکوۃ ایسے مسلمان فقیر کو مال کا مالک بنا دینے کا نام ہے جو نہ تو ہاشمی ہو اور نہ ہی اس کا غلام ہو ۔ بشرطیکہ اس مال کی منفعت پوری طرح سے مالک سے ختم ہو جائے اور یہ تملیک محض اللہ کی رضا کی خاطر ہو ۔

اموالِ زکوۃ

اموالِ زکوۃ جن میں شریعت نے زکوۃ واجب قرار دیا ہے وہ پانچ ہیں ۔

(۱) نقدین ــــــ یعنی سونا اور چاندی (۲) سائمہ جانور ــــــ اونٹ ، گائے ، بھینس ، بکری وغیرہ

(۳) سامانِ تجارت ــــــ (۴) معدن و رکاز ــــــ (۵) زرعی پیداوار اور پھل وغیرہ

---

[۱] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۳۰   [۲] کنز علی ھامش البحر ج ۲ ص ۲۱۶

[۳] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۵۹۰

زکوٰۃ کے وجوب کی شرطیں

زکوٰۃ کے وجوب کی شرطیں دو طرح کی ہیں، بعض شرطیں وہ ہیں جو معطی یعنی زکوٰۃ دہندہ سے متعلق ہیں، اور بعض وہ ہیں جو نفس مال سے متعلق ہیں۔

زکوٰۃ دہندہ سے متعلق شرطیں

۱ ــــ اسلام ــــ زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے، کافر اور مشرک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے اس لئے کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے اور کافر کی طرف سے عبادت کی ادائیگی درست نہیں ہوتی۔ بدائع میں ہے:

"زکوٰۃ کے وجوب کی ایک شرط مسلمان ہونا ہے۔ کافر پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ زکوٰۃ عبادت ہے اور کفار عبادات کے مخاطب ہی نہیں ہیں" [۱]

فقہ شافعی کی رو سے بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے اسلام ضروری ہے۔ غیر مسلم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے المجموع شرح المہذب للنووی میں ہے:

"ولا تجب الزکاۃ الا علی حر مسلم" [۲]

یعنی زکوٰۃ کا وجوب صرف آزاد مسلمان پر ہوگا۔

الفروع لابن مفلح الحنبلی میں ہے:

"هی فرض علی کل مسلم حر" [۳]

۲ ــــ حریت ــــ زکوٰۃ کے وجوب کی دوسری شرط آزاد ہونا ہے۔ غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے کہ غلام کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ سب اس کے آقا کی ملکیت ہوتی ہے۔ خود غلام کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ مکاتب

---

[۱] بدائع ج ۲ ص ۴، فتح القدیر ج ۲ ص ۱۱۳، البحر الرائق ج ۲ ص ۲۱۸

[۲] المجموع ج ۵ ص ۳۲۶   [۳] الفروع ج ۲ ص ۳۱۶

اور مدبر اگرچہ مالک بننے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ مگر چوں کہ اس کو بھی ملک تام حاصل نہیں ہوتی ہے اس لئے اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

"زکوٰۃ کے وجوب کی شرطوں میں سے ایک شرط حریت (آزاد ہونا) ہے اس لئے کہ ملکیت شرائط وجوب میں سے ہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر گفتگو کریں گے) اور غلام کسی چیز کے مالک بننے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا ہے لہٰذا غلام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اگرچہ وہ ماذون فی التجارہ ہو۔ اس لئے کہ اس صورت میں اگر اس کے ذمہ قرض نہیں ہوگا تو اس کی ساری کمائی مولیٰ کی ملک ہوگی اور اس کی زکوٰۃ مولیٰ پر واجب ہوگی۔ اور اگر اس کے ذمہ اتنا قرض ہو جو اس کی کمائی پر محیط ہو تو اس صورت میں اس کی کمائی کا مالک مولیٰ نہیں ہوگا۔ اور اس کی زکوٰۃ نہ تو غلام پر واجب ہوگی اور نہ اس کے آقا پر۔"[1]

المجموع میں ہے :

"زکوٰۃ صرف آزاد مسلمان پر واجب ہوگی اس لئے کہ غلام اور مکاتب کے مال کا مالک مولیٰ ہوتا ہے وہ دونوں کسی چیز کے خود مالک نہیں بنتے۔"[2]

الفروع میں ہے :

"زکوٰۃ ہر آزاد مسلمان پر فرض ہے۔"[3]

۳ —— بلوغ —— وجوب زکوٰۃ کے لئے بلوغ حنفیہ کے نزدیک شرط ہے۔ اس لئے نابالغ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بدائع میں ہے :

"وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ہمارے نزدیک بلوغ ہے پس نابالغ کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا بھی یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک بلوغ وجوب زکوٰۃ کی شرط نہیں ہے۔ ان کے نزدیک نابالغ پر بھی زکوٰۃ کا وجوب ہوتا ہے جسے اس کا ولی اس کی طرف سے ادا کرے گا۔ صحابہ میں سے حضرت عائشہؓ اور ابن عمرؓ کا یہی قول ہے۔"[4]

---

[1] بدائع ج ۲ ص ۴، البحر الرائق ج ۲ ص ۲۱۸، الفتاوی التاتارخانیۃ ج ۲ ص ۲۱۸

[2] المجموع ج ۵ ص ۳۲۶ [3] کتاب الفروع ج ۲ ص ۳۱۹ [4] البدائع ج ۲ ص ۴

الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

"بلوغ اور عقل حنفیہ کے نزدیک شرائط وجوب میں سے ہے۔ پس ان کے نزدیک نابالغ اور مجنون (پاگل) کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ یہ دونوں ادائیگی عبادت کے مخاطب ہی نہیں ہوتے ہیں۔" [۱]

المجموع میں فقہ شافعی کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے :

"زکوٰۃ نابالغ اور پاگل کے مال میں بھی واجب ہوگی کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا : نابالغوں کے اموال میں زیادتی پیدا کرنے کی کوشش کرو، ایسا نہ ہو کہ اسے زکوٰۃ ختم کر دے اور اس لئے کہ زکوٰۃ کا مقصد حصول ثواب اور فقراء کے ساتھ ہمدردی و مواسات ہے۔ اور نابالغ اور مجنوں اہل ثواب اور اہل مواساۃ میں سے ہے۔" [۲]

الفروع میں ہے :

"زکوٰۃ نابالغ اور پاگل پر بھی فرض ہے" [۳] نابالغ پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے ابو عبید نے لکھا ہے : زکوٰۃ ہمارے نزدیک نابالغ کے مال میں بھی واجب ہے جسے اس کا ولی اس کی طرف سے ادا کرے گا جیسا کہ ولی حالت صغر میں اس کے لئے خرید و فروخت کرتا ہے پس اگر ولی نے اس کے مال میں سے زکوٰۃ نہیں نکالی۔ اور وہ بالغ ہوگیا تو ولی کو چاہئے کہ اسے بتا دے تاکہ وہ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نکال دے اگر اس نے ایسا نہیں کیا تو پھر گناہ ولی پر ہوگا۔ فقیہہ طاؤس سے ایسا ہی منقول ہے۔" [۴]

۴۔۔۔۔۔ عقل ۔۔۔۔۔ حنفیہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط عقل ہے۔ مجنوں پر ان کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جنون کی دو قسمیں ہیں۔ جنون اصلی اور جنون طاری۔ جنون اصلی یہ ہے کہ نابالغ کی حالت میں بھی وہ مجنون تھا اور جنون کی ہی حالت میں وہ بالغ ہوا۔ ایسے جنون کے بارے میں ہمارے ائمہ احناف کا اتفاق ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہوگا۔ اور اگر چند سالوں کے بعد جنون سے افاقہ ہو جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ افاقہ کے بعد سے جب پورا ایک سال ہو جائے گا تو

---

[۱] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۳۲ [۲] المجموع ج ۵ ص ۳۲۹ [۳] الفروع ج ۲ ص ۳۱۶
[۴] کتاب الاموال ص ۵۵۵

اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ بالغ ہونے کی صورت میں بلوغ کے بعد سے سال کا اعتبار ہوتا ہے اور ایک سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ جنون طاری اگر پورے ایک سال تک محیط ہو تو وہ جنون اصلی کے حکم میں ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہوگا اور اگر پورے سال کو محیط نہ ہو بلکہ بعض اوقات افاقہ ہو جاتا ہو تو اس مسئلہ میں امام محمد کا ایک قول یہ ہے کہ اگر سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنون سے افاقہ ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اگر سال کے زیادہ تر حصہ میں جنون سے افاقہ ہو تو زکوٰۃ کا وجوب ہوگا ورنہ نہیں۔[1]

بدائع میں ہے:

"ہمارے نزدیک زکوٰۃ کے وجوب کی شرطوں میں سے ایک شرط عاقل ہونا ہے پس مجنوں کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جنون کی دو قسمیں ہیں، اصلی اور طاری۔ اصلی یہ ہے کہ جنون ہی کی حالت میں بالغ ہوا ہو۔ اس کے بارے میں ہمارے علماء کے درمیان اختلاف نہیں ہے کہ وہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہے لہٰذا افاقہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ افاقہ کے بعد پورے سال کا آغاز ہوگا اور سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ جنون طاری اگر پورے سال کو محیط ہو تو وہ جنون اصلی کے حکم میں ہوگا اور اگر درمیان سال افاقہ ہو جائے تو اس مسئلہ میں نوادر میں امام محمد سے منقول ہے کہ اگر سال میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنون سے افاقہ ہو جائے چاہے وہ افاقہ سال کے کسی بھی حصہ میں ہو، اس پورے سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ابن سماعہ نے امام ابو یوسف سے بھی ایک روایت اس کے مطابق نقل کی ہے۔ ہشام نے امام ابو یوسف سے دوسری روایت یہ نقل کی ہے کہ اگر سال کے اکثر حصہ میں جنون سے افاقہ رہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں اور وہ شخص جس پر کبھی جنون طاری ہوتا ہو، پھر افاقہ ہو جاتا ہو تو ایسا شخص مجنون کے حکم میں نہیں ہوگا۔ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔"[2]

جمہور ائمہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے عاقل ہونا شرط نہیں ہے پاگل کے مال میں بھی ان

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص۲۲۲، فتح القدیر ج ۲ ص۱۱۶ [2] بدائع ج ۲ ص۴

حضرات کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوگی۔ الفقہ الاسلامی وادلتہ میں ہے :

" وکان الجمہور لا یشترطان ذلک وتجب الزکوٰۃ فی مال الصبی والمجنون[1] "

المجموع شرح المہذب میں ہے :

" وتجب فی مال الصبی والمجنون "[2]

۵ــــــ **فراغت عن الدین** : حنفیہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط فراغت عن الدین ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ دہندہ کے ذمہ ایسا دین نہ ہو جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہے تو بقدر دین وہ وجوب زکوٰۃ کے لئے مانع ہوگا۔ چاہے دین معجل ہو یا مؤجل۔ البتہ اگر دین کی مقدار مالیت منہا کرنے کے بعد بھی بقدر نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔ وہ دیون جن کا مطالبہ بندوں کی جانب سے نہ ہوتا ہو وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوں گے جیسے دیونِ کفارات ونذور۔ امام شافعی کے نزدیک دین سرے سے مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

۶ــــــ **العلم بالفریضہ** : علامہ کاسانی نے وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط یہ بھی لگائی ہے کہ نفس فریضۂ زکوٰۃ کا کسی بھی طرح سے علم حاصل ہو جائے۔ لہٰذا وہ شخص جو دار الحرب میں مسلمان ہوا اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی اور اسے دار الحرب میں کسی بھی ذریعہ سے زکوٰۃ کی فرضیت کا علم نہیں ہوسکا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کاسانی نے اسے ائمہ ثلاثہ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد کا مسلک قرار دیا ہے۔ امام زفر کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے فرضیت کا علم ضروری نہیں ہے لہٰذا وہ شخص جو دار الحرب میں مشرف باسلام ہوا اور دار الاسلام کی طرف ہجرت نہیں کی بسالوں دار الحرب میں مقیم رہا، اس کے پاس سائمہ جانور یا دوسری مالیت رہا اور اسے فرائض اسلام کا علم ہی نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور جب وہ دار الحرب سے دار الاسلام ہجرت کر کے آئے گا تو اس سے گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا اور امام زفر کے نزدیک اس پر گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی[3]

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص۷۴۲

[2] المجموع ج ۵ ص۳۲۹   [3] بدائع ج ۲ ص۴

[4] بدائع ج ۲ ص۷

وجوبِ زکوٰۃ کی وہ شرطیں جن کا تعلق محلِ زکوٰۃ یعنی اموال سے ہے

پہلی شرط ——— ملکِ تام

شریعتِ اسلامی نے وجوبِ زکوٰۃ کے لئے "ملکِ تام" کو بنیادی شرط قرار دیا ہے، اور صرف انہیں اموال میں زکوٰۃ واجب کی گئی جن پر انسان کو "ملکِ تام" حاصل ہو، وہ اموال جن پر انسان کو ملکِ تام حاصل نہیں ہوتی ہے ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ ملکِ تام کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس چیز پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور وہ چیز اس کے قبضہ وتصرف میں بھی ہو۔ اگر اس پر ملکیت حاصل نہ ہو صرف قبضہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے مالِ مکاتب، کہ اس پر اگرچہ مکاتب کو قبضہ حاصل ہوتا ہے، مگر وہ درحقیقت اس کے مولیٰ کی ملکیت ہے۔ اس لئے مکاتب پر اس کے مال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اور اگر ملکیت حاصل ہو مگر قبضہ نہ ہو، تو بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی جیسے مہر کی رقم قبضہ سے پہلے، کہ عورت اس کی مالک تو ہوتی ہے مگر اس پر قبضہ نہیں ہوتا، اس لئے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوتی، اسی طرح مالِ ضمار پر بھی ملکیت حاصل ہوتی ہے، مگر قبضہ نہیں ہوتا، اس لئے اس کی زکوٰۃ قبضہ سے پہلے واجب نہیں ہوتی۔

ملکِ تام کا وجوبِ زکوٰۃ کے لئے شرط ہونا قرآنِ کریم کی آیت: "خذ من اموالہم صدقۃ وفی اموالہم حق" اور حدیثِ رسول: ان اللّٰہ فرض علیہم فی اموالہم سے ثابت ہے۔

ملکِ تام کے شرط ہونے کی حکمت

ملکِ تام کے وجوبِ زکوٰۃ کی شرط ہونے کی حکمت ذکر کرتے ہوئے یوسف القرضاوی نے لکھا ہے:

"اس شرط کا اعتبار اس لئے کیا گیا ہے کہ ملکیت اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، کیونکہ یہ نہ صرف حریت بلکہ انسانیت کا ثمرہ ہے۔ حیوان کو کسی چیز پر مالکانہ اختیارات اور حقوق حاصل نہیں ہوتے۔ یہ انسان ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ مالکانہ حقوق رکھتا ہے۔ ملکیت تملک کے فطری جذبہ کی تسکین کا سامان کرنے کے علاوہ انسان میں سیادت وقوت کا احساس بھی

پیدا کرتی ہے۔ اور ملکیت ہی انسان کو یہ اختیار عطا کرتی ہے کہ وہ اپنے مملوکہ مال سے فائدہ
حاصل کرے اور اس کے اضافہ اور نشو و نما کا سامان کرے نیز بوقت ضرورت اپنے مناسب طریقہ سے
اس کو نفع بخش کاموں میں لگا سکے۔ ایسی عظیم نعمت کے حصول پر اللہ تعالیٰ کا شکر واجب ہے
اس لئے اگر اسلام نے اس کے ملک سے زکوٰۃ کی ادائیگی اور مال کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کیا ہے
تو یہ باعث تعجب نہیں ہے۔ [1]

ملک تام سے کیا مراد ہے

ملک تام ایک فقہی اصطلاح ہے۔ فقہائے کرام ملک تام اور ملک مطلق کو ایک ہی معنی میں استعمال
کرتے ہیں۔ ملک تام سے مراد یہ ہے کہ کسی چیز پر انسان کو مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوں اور اس شئی پر اس کا
قبضہ بھی ہو۔ اس کی تعبیر فقہائے کرام "هو المملوك رقبة ويداً" سے کرتے ہیں۔ یعنی وہ شئی رقبہ
(ذات) اور ید (قبضہ) دونوں لحاظ سے مملوک ہو۔ ائمہ ثلاثہ حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد
بن الحسن شیبانی کے نزدیک ملک تام سے ملکیت اور قبضہ مراد ہے۔ اور جب کسی چیز پر انسان کو ملکیت اور قبضہ
دونوں حاصل ہوگا تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام زفر بن الہذیل کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لئے
قبضہ ضروری نہیں ہے۔ حضرت امام شافعی بھی وجوب زکوٰۃ کے لئے قبضہ کو ضروری قرار نہیں دیتے ہیں۔ ان
دونوں حضرات کے نزدیک مال ضمار میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور ائمہ ثلاثہ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی
علامہ کاسانی نے اموال سے متعلق شرائط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "وجوب زکوٰۃ کی ایک شرط ملک مطلق ہے۔ ملک مطلق سے مراد یہ ہے کہ اس شئی پر انسان
> کو ملکیت بھی حاصل ہو اور قبضہ بھی یعنی باعتبار رقبہ و ید مملوک ہو۔ یہ ہمارے ائمہ ثلاثہ امام
> ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد کا قول ہے۔ امام زفر کے نزدیک قبضہ شرط نہیں ہے۔ امام
> شافعی کا بھی یہی قول ہے۔ پس ہمارے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اور
> ان دونوں حضرات کے نزدیک واجب ہوگی۔" [2]

---

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص
[2] بدائع الصنائع ج ۲ ص

البحر الرائق میں ہے :

"ھو المملوك رقبة ويدًا[1] یعنی ملک مطلق سے مراد رقبہ اور ید کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔

شامی میں ہے :

"ھو المملوك یدًا ورقبة"[2] وہ رقبہ اور ید کے لحاظ سے مملوک ہونا ہے۔

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے :

"حنفیہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مال قبضہ کے لحاظ سے مملوک ہو، پس اگر کسی چیز پر ملکیت حاصل ہو مگر اس پر قبضہ نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، جیسے قبضہ سے پہلے عورت کا مہر، ایسی چیز جس پر قبضہ ہو مگر ملکیت حاصل نہ ہو، اس کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوگی مالکیہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اپنی مملوکہ اشیاء میں تصرف کا اختیار حاصل ہو، پس غلام کی تمام اقسام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیونکہ غلام کو کسی بھی صورت میں مال پر ملک تام حاصل نہیں ہوتی ہے۔ شافعیہ کے نزدیک ملک تام کی قید سے غلام اور مکاتب کو نکالنا مقصود ہے کہ غلام کو سرے سے ملکیت ہی حاصل نہیں ہوتی ہے اور مکاتب کو ناقص ملکیت حاصل ہوتی ہے اس لئے ان دونوں پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی"[3]

علامہ کاسانی کی صراحت کے مطابق شافعیہ کے نزدیک ملک تام کی تعریف میں قبضہ شامل نہیں ہے[4] حنابلہ کے نزدیک ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو اس مال پر قبضہ حاصل ہو، اس کے ساتھ کسی دوسرے کا حق متعلق نہ ہو اور اس میں اسے حسب منشاء تصرفات کا اختیار حاصل ہو اور اس کے فوائد اسی کی طرف لوٹتے ہوں، لہٰذا مال مکاتب پر ان کے نزدیک بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا۔[5]

ملک تام کے ذیل میں پیدا ہونے والے سوالات حسب ذیل ہیں :

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۱۸ [2] شامی ج ۲ ص ۱۵۹

[3] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص ۵۹۲ [4] بدائع ج ۲ ص ۹

[5] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ج ۱ ص ۵۹۳

سوالات کے جوابات

۱ــــــ مالِ تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ

وہ مالِ تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو لیکن مال کی حصولیابی نہیں ہوسکی اور وہ مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا، تو سوال یہ ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ مشتری پر جس نے اس کی پیشگی قیمت ادا کردی مگر مال اس کے قبضہ میں نہیں آیا یا اس کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جس نے اس کی قیمت تو وصول کرلی مگر سامان ابھی بھی اسی کے پاس ہے۔

بائع پر اس کی زکوٰۃ اس وجہ سے واجب نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اسے فروخت کرچکا ہے اور اس کی قیمت پر بھی قبضہ کرچکا ہے۔ اس لئے وہ مال اس کی ملکیت سے نکل چکا، پس ملکیت نہیں باقی رہی اور وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ملکیت بنیادی شرط ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ خریدار پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اور اگر چند سالوں کے بعد وہ سامان اس کے قبضہ میں آیا تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہاء کے دو قول ملتے ہیں!

۱ــــــ پہلا قول یہ ہے کہ سامانِ تجارت قبضہ سے پہلے نصاب شرعی نہیں بنے گا اور اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب نہیں ہوگی۔ اکثر مشائخ عراق کا یہی قول ہے۔

۲ــــــ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی وہ نصاب شرعی ہو جائے گا، اور اس کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی، بعض مشائخ کا اسی طرف رجحان ہے، فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

"واما المشتری قبل القبض فقد قال مشائخ العراق انه لا یکون

نصابا قبل القبض عندهم جمیعا قال غیرهم من المشائخ هو

علی الخلاف الذی ذکرنا فی الثمن، وقال غیرهم من المشائخ ....

هو نصاب قبل القبض بلا خلاف" [1]

---

[1] فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۲۰

"یعنی خریدی ہوئی چیز جس پر قبضہ نہ ہوا ہو مشائخ عراق کہتے ہیں کہ قبضہ سے پہلے تمام ہی فقہاء کے نزدیک وہ نصاب شرعی نہیں ہوگی۔ دیگر مشائخ کہتے ہیں کہ اس میں بھی وہی اختلاف ہے جو ثمن میں ہے۔ بعض مشائخ کہتے ہیں کہ مبیع قبضہ سے پہلے بھی بالاتفاق نصاب ہے"

علامہ حصکفی صاحب درمختار نے عدم وجوب کے قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ "ملک" پر بحث کے ذیل میں لکھا ہے:

"ولا فیما اشتراه للتجارة قبل قبضه"[1] اور مبیع قبل القبض میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

شامی نے اس عبارت کے تحت لکھا ہے کہ قبضہ سے پہلے تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی لیکن قبضہ کے بعد گزشتہ تمام سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی:

"فیزکیه لما مضی"[2] "اور قبضہ کے بعد تمام ہی سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔"

قاضی خاں نے سامان تجارت پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ اور قبضہ کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے۔ ان کے نزدیک قبضہ کے بعد جب اس سامان پر حولان حول ہو جائے گا تب اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فتاویٰ قاضی خاں میں ہے:

"ایک شخص کے پاس سائمہ بکری تھی اس سے دوسرے شخص نے بکری خریدی مگر اس پر قبضہ نہیں کیا یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا پھر اس پر قبضہ کیا۔ تو مشتری پر گذشتہ سال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد جب سال پورا ہوگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ بکری اپنے بائع کے پاس ثمن کے عوض مضمون تھی"[3]

علامہ ابن نجیم نے بھی قبضہ سے پہلے مشتری پر زکوٰۃ کے عدم وجوب کے قول کو ترجیح دی ہے چنانچہ "ملک تام" پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"فلا یجب علی المشتری فیما اشتراه للتجارة قبل القبض"[4]

---

[1] درمختار علی ھامش رد المحتار ج ۲ ص ۱۲۰ [2] شامی ج ۲ ص ۲۲۳

[3] قاضی خاں ج ۱ ص ۱۱۹ [4] البحر الرائق

قبضہ کی حقیقت

اس جگہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس پر غور کر لیا جائے کہ شرعاً قبضہ اور تسلیم کی حقیقت کیا ہے اور قبضہ کا اصل مقصد کیا ہے، تاکہ اس بات کا فیصلہ آسان ہو جائے کہ وہ سامانِ تجارت جس کی پیشگی قیمت ادا کی جا چکی اور وہ ابھی مشتری کے پاس نہیں آیا تو اس پر مشتری کا قبضہ سمجھا جائے گا یا نہیں؟

فقیہ طاہر بن عبدالرشید نے خلاصۃ الفتاوی کے کتاب البیوع میں ایک باب ہی اس عنوان سے قائم کیا ہے: "فیما یکون قبضاً وفیما لا یکون" یعنی کسے قبضہ قرار دیا جائے گا اور کسے نہیں۔ اس باب کے ذیل میں انھوں نے قبضہ کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> "تجرید میں مبیع پر قبضہ کے باب میں لکھا ہے کہ مبیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی یہ ہے کہ بائع مبیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دے کہ بغیر کسی رکاوٹ کے مشتری کے لئے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو اور اسی طرح ثمن کی سپردگی بھی ہو جائے گی، اجناس میں ہے کہ سپردگی کے لئے تین چیزیں معتبر ہیں (۱) بائع مشتری سے کہے کہ میں نے مبیع اور تمہارے درمیان تخلیہ کر دیا ہے (۲) مبیع مشتری کے پاس اس طرح ہو کہ اگر اس میں وہ کوئی تصرف کرنا چاہے تو بلا کسی رکاوٹ کے کر سکے (۳) مبیع حقِ غیر کے ساتھ مشغول نہ ہو، امام ابوحنیفہ سے منقول ہے کہ قبضہ یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ میں نے تمہارے اور مبیع کے درمیان تخلیہ کر دیا پس اس پر قبضہ کر لو ...... اگر کسی نے گیہوں خریدا اور وہ گیہوں کسی مکان میں ہے بائع نے اس گھر کی کنجی مشتری کو دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور اس کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے، تو اسے قبضہ سمجھا جائے گا"۔[1]

محقق ابن الہمام نے قبضہ کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "قبضہ اور مبیع کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مشتری اور مبیع کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ مشتری کے لئے بغیر کسی رکاوٹ کے اس پر قبضہ کرنا ممکن ہو، اور یہی مفہوم ثمن کی سپردگی کا ہے"

---

[1] خلاصۃ الفتاوی ج ۳ ص ۰۰

. . . . اور وہیں سے منقول ہے کہ اگر کسی مکان میں خریدے گئے سامان تجارت کے ساتھ بائع کے سامان کے علاوہ کسی دوسرے کا سامان ہو تو وہ قبضہ کے حق میں مانع ہوگا۔ پس اگر اسے سامان پر قبضہ کی اجازت دے دی جائے تو قبضہ صحیح ہو جائے گا۔ اور سامان بائع کے پاس بحکم ودیعت ہوگا . . . . کپڑے میں قبضہ کی صورت یہ ہے کہ مشتری اسے اپنے ہاتھ میں لے لے یا اگر کپڑا زمین پر رکھا ہوا ہو، بائع مشتری سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے اور کپڑے کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے۔ پس اس پر قبضہ کر لو اور مشتری نے اس کے جواب میں کہا کہ میں نے قبضہ کر لیا تو شرعاً اسے قبضہ قرار دیا جائے گا۔ اور اگر کسی مکان میں رکھے ہوئے گندم کو خرید لیا اور بائع نے مشتری کو اس مکان کی تالی دیتے ہوئے کہا کہ میں نے تمہارے اور مبیع کے درمیان تخلیہ کر دیا ہے تو شرعاً یہ قبضہ قرار پائے گا۔[۱]

بحر الرائق میں ہے :

"اگر بائع نے مشتری سے مبیع کے مکمل ہونے کے بعد کہا کہ "لے لو" تو یہ قبضہ نہیں ہوگا اور اگر مبیع کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اسے لے لو" پس اگر مشتری کے لئے مبیع پر قبضہ کرنا ممکن ہو تو یہ تخلیہ اور قبضہ ہوگا۔"

آگے چند سطروں کے بعد لکھا ہے :

"مبیع پر قبضہ اور اس کی سپردگی کا مفہوم یہ ہے کہ مبیع اور مشتری کے درمیان اس طرح سے تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر مشتری اس پر قبضہ کرنا چاہے تو کوئی رکاوٹ اور مانع پیش نہ آئے۔"[۲]

علامہ حصکفی نے قبضہ کی حقیقت یہ بیان کی ہے :

"پھر قبضہ اور مبیع کی سپردگی ایسے تخلیہ سے عمل میں آئے گی جس میں مشتری کے لئے مبیع پر قبضہ کرنا بغیر کسی رکاوٹ کے ممکن ہو۔"[۳]

علامہ شامی نے صراحت کی ہے کہ تخلیہ بھی حکماً قبضہ ہے، بشرطیکہ تخلیہ کے بعد مبیع پر بغیر کسی دشواری کے قبضہ ممکن ہو۔[۴] فتح القدیر میں ہے :

---

[۱] فتح القدیر لابن الہمام ج ۵ ص ۴۹۹ [۲] البحر الرائق ج ۵ ص ۳۰۲

[۳][۴] شامی ج ۴ ص ۵۶۱-۳۰۳

"اور ملک تام کی قید سے مبیع قبل القبض نکل جاتی ہے۔ اگر اس پر بائع ہی کے پاس حولان حول ہو جائے، اور اس دوران مشتری کو اس پر ملک تصرف حاصل نہ ہو تو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ واضح رہے کہ کمال ملک کا مطلب یہ ہے کہ اس میں ہر طرح کے تصرف کا اختیار حاصل ہو"۔[1]

ان عبارات فقہیہ کا حاصل یہ ہے کہ فقہاء نے "تخلیہ" کو بھی حکماً "قبضہ" تسلیم کیا ہے اور سامان تجارت پر قبضہ اور اس کی سپردگی کے لئے یہ بات کافی قرار دی گئی ہے کہ سامان تجارت اور خریدار کے درمیان اس طرح تخلیہ کر دیا جائے کہ اگر خریدار سامان پر قبضہ کرنا چاہے تو اُسے کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔ لہٰذا ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے:

"وہ سامان تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی اور ابھی سامان تجارت بائع ہی کے پاس ہے۔ اس سامان کا مشتری شرعاً اور عرفاً، مالک بن چکا ہے۔ اور اسے سامان پر حکماً قبضہ بھی حاصل ہے۔ قبضہ کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح کے خریدے ہوئے مال میں خریدار کو ہر طرح کے تصرفات کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ اور اسے اس پر مالکانہ حقوق بھی حاصل ہوتے ہیں اس میں وہ جو چاہے تصرف کر سکتا ہے۔ بائع کی طرف سے کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ہوتی ہے۔ کیوں کہ ثمن کی وصولیابی کے وقت ہی بائع سامان اور خریدار کے درمیان تخلیہ کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس مال تجارت کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی۔ اور اگر وہ سامان تجارت چند سالوں کے بعد خریدار کے پاس آئے تو اسے گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی"۔

چنانچہ علامہ ابن نجیم نے لکھا ہے:

"وقد منا ان المبیع قبل القبض لا تجب زکوته علی المشتری و ذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین: ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصاباً لان الملک فیه ناقص بافتقاد الید والصحیح انه یکون نصاباً لانه عوض عن مال کانت ید ه ثابتة علیه وقد امکنه احتواء الید

---

[1] فتح القدیر ۲/۱۱۳

علی العوض فتعتبر بدوام باقیة علی النصاب باعتبار التمکن شرعاً فعلی هذا قولهم لا تجب الزکوٰة عندهما قبل قبضه اما بعد قبضه تجب زکوٰة فیما مضیٰ کالدین القوی۔[۱]

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ

پیشگی ادا کی ہوئی قیمت کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی یا مشتری پر۔ اس سلسلہ میں حکم یہ ہے کہ پیشگی ادا کی ہوئی قیمت چوں کہ مشتری کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔ اور اس پر مشتری کو نہ تو ملکیت حاصل ہے اور نہ قبضہ اس لئے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہوگی۔ البتہ بائع کو اس قیمت پر "ملک تام" حاصل ہے اس کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔ بحرالرائق میں ہے:

"رجل اشتری عبداً للتجارة یساوی مائتی درهم ونقد الثمن ولم یقبض العبد حتی حال الحول فمات العبد عند البائع کان علی بائع العبد زکاة المائتین...... اما علی البائع فلانه ملك الثمن وحال الحول علیه عند البائع.... الی قوله ولا زکوٰة علی المشتری لان الثمن زال عن ملکه الی البائع فلم یملك المائتین حولاً کاملاً...... فلا تجب علیه الزکاة"۔[۲]

"ایک شخص نے بہ نیت تجارت ایک غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم کے مساوی ہے۔ اس نے ثمن کی ادائیگی کر دی اور غلام پر قبضہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس پر ایک سال گزر گیا۔ اور اس دوران غلام مر گیا تو بائع پر دو سو درہم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کیونکہ غلام کی قیمت پر اسے ملکیت حاصل ہو چکی تھی۔ اور اس پر حولان حول بھی ہو گیا۔ مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ثمن اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملک میں داخل ہو گیا پس پورے ایک سال تک ثمن پر مشتری کی ملکیت نہیں رہی۔ اس لئے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی"۔

کرایہ کی پیشگی رقم اور ڈپوزٹ پر زکوٰۃ: کرائے کی مد میں دی جانے والی پیشگی رقم "اجرت معجلہ"

[۱] البحرالرائق ج ۲ ص ۲۲۱ [۲] البحرالرائق ج ۲ ص ۲۲۲

ہے جس کا مالک، مالک مکان ہے۔ اس رقم پر اسے "ملک تام" حاصل ہے اس لئے اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر واجب ہوگی۔ بدائع میں ہے:

"ذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفہا أھل بخاری ان الزکاۃ فی الاجرۃ المعجلۃ تجب علی الآجر لانہ ملکہ قبل الفسخ"۔[1]

امام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری نے اجارہ طویلہ جس کا اہل بخاری کے مابین عام رواج ہے کے بارے میں لکھا ہے کہ اجرت معجلہ میں آجر یعنی مالک پر زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ اجارہ کے فسخ ہونے سے پہلے تک وہ اس کا مالک ہے۔

فتاویٰ قاضی خان میں ہے:

"اجارہ مرسومہ جس کا بخاری میں رواج ہے اگر اس میں پیشگی رقم ادا کردی گئی اور مال چند سالوں تک آجر یعنی مالک مکان کے پاس ہی رہا تو شیخ ابوبکر محمد بن الفضل سے منقول ہے کہ اگر اجرت دراہم و دنانیر کے قبیل سے ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی اس لئے کہ قبضہ کے ذریعہ وہ پیشگی رقم کا مالک ہوچکا ہے۔ اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر عین مقبوض کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے علاوہ دوسرے دراہم و دنانیر کی واپسی کافی ہوگی تو گویا کہ یہ اس دین کے مثل ہوا جو حولان حول کے بعد لازم ہوا ہو"۔[2]

امام نووی شافعی نے لکھا ہے:

"اگر آجر کے پاس ہی کرایہ پر لگایا ہوا مکان ہو اور کرایہ دار نے ابھی اس مکان سے فائدہ نہ اٹھایا ہو اور کرایہ کی رقم پر سال مکمل ہوگیا ہو تو اس کی زکوٰۃ آجر پر واجب ہوگی۔ اس لئے کہ آجر کو اس پر ملکیت تامہ حاصل ہے"۔[3]

محقق ابن الہمام کا بیان ہے:

"طویل اجارہ جس کا معاملہ بعض لوگ کرتے ہیں، اور ہر ماہ کے شروع میں تین دن کے لئے خیار شرط

---

[1] بدائع ج ۲ ص ...   [2] فتاویٰ قاضی خان ج ۱ ص ۲۵۱ ط نول کشور لکھنؤ

[3] شرح المہذب للنووی ج ۶ ص ...

لگاتے ہیں۔ اگر اس میں چند سالوں کو کرایہ پیشگی ادا کر دیا جائے تو اس کی زکوٰۃ آجر (مالک مکان) پر واجب ہوگی کیونکہ قبضہ کے ذریعہ آجر اس کا مالک ہو چکا ہے اور اجارہ کے فسخ ہونے کی صورت میں اس پر بعینہٖ اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کی مقدار کا لوٹانا کافی ہوگا۔ پس سمجھا جائے گا کہ یہ وہ دین ہے جو حولان حول کے بعد اس کے ذمہ آیا ہے۔[1]

صاحب خلاصۃ الفتاوی نے بھی اجرت معجلہ کی زکوٰۃ آجر پر واجب قرار دی ہے۔ مگر لکھا ہے کہ احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں یعنی آجر اور مستاجر اس کی زکوٰۃ ادا کریں۔[2]

مگر یہاں پر محل غور دراصل پیشگی ادا کی جانے والی کرایہ کی رقم نہیں ہے۔ بلکہ وہ رقم ہے جسے کرایہ دار ضمانت اور ڈپوزٹ کے طور پر ادا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہروں اور قصبات میں مکان / دوکان کرایہ پر لیتے وقت کرایہ کی متعینہ رقم کے علاوہ ایک بڑی رقم ڈپوزٹ / ضمانت / پگڑی کے نام پر کرایہ دار کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ یہ رقم کرایہ دار کو درمیان میں لینے کا اختیار حاصل نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ جب وہ مکان / دوکان خالی کریگا یا اجارہ کا معاملہ ختم کیا جائے گا تو اُسے یہ رقم واپس ملے گی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ضمانت یا ڈپوزٹ کے طور پر دی جانے والی رقم کا شرعی حکم کیا ہوگا۔ اور اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہوگی یا مالک مکان پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے۔ یہ بات تو متحقق ہے کہ مالک مکان کو اس رقم پر "ملکیت" حاصل نہیں ہے۔ صرف اس پر اس کا قبضہ ہے۔ اور وجوب زکوٰۃ کے لئے "ملک تام" ہونا ضروری ہے۔ لہذا اس کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اب رہا یہ سوال کہ کرایہ دار جو اس رقم کا اصل مالک ہے اس پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس رقم کی اصل حیثیت پر غور کر لیا جائے کہ شرعًا اس رقم کی حیثیت کیا ہے۔ اس رقم کے بارے میں چند احتمالات ہو سکتے ہیں۔

۱ —— اسے قرض قرار دیا جائے۔ مگر قرض ہونے کے احتمال کو عرف و تعامل رد کرتے ہیں۔ کیونکہ قرض کی صورت میں شرعًا قرض دہندہ کو اس کا اختیار رہتا ہے کہ جب وہ چاہے قرض میں دی ہوئی رقم کا مطالبہ کرے۔ مگر ڈپوزٹ کی رقم کو اجارہ کے ختم ہونے یا فسخ ہونے سے پہلے واپس لینے کا اختیار نہیں ہوتا ہے۔

---

[1] فتح القدیر ۲ : ۱۲۱ — [2] خلاصۃ الفتاوی ۱ : ۲۳۹

اس لئے ہم اسے "قرض" قرار نہیں دے سکتے۔

۲ ـــــ دوسرا احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو "امانت اور ودیعت" قرار دیا جائے، مگر یہ احتمال بھی اس وجہ سے درست نہیں ہے کہ "امانت اور ودیعت" کی صورت میں اگر سامان مودَع کے پاس ہلاک ہو جائے تو اس پر تاوان واجب نہیں ہوتا ہے۔ اور ڈپوزٹ کی رقم بہر حال میں واجب الرد ہوتی ہے، اس لئے اسے امانت بھی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

۳ ـــــ ایک احتمال یہ ہے کہ اسے "عاریت" قرار دیا جائے، مگر یہ احتمال بھی اس بنا پر درست نہیں ہے کہ عاریت کی صورت میں بھی مالک کو اپنی چیز واپس لینے کا ہر وقت اختیار رہتا ہے۔ نیز عاریت حکم میں ودیعت کے ہوتی ہے، اور ڈپوزٹ کی رقم کو نہ تو ہر وقت واپس لینے کا اختیار رہتا ہے اور نہ ہی ہلاک ہونے کی صورت میں مالک مکان بری الذمہ ہوتا ہے، اس لئے یہ احتمال بھی درست نہیں ہے۔

۴ ـــــ ایک احتمال یہ ہے کہ اس رقم کو "رہن" قرار دیا جائے، یہ احتمال درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ رہن رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دائن کی رقم مدیون کے پاس محفوظ رہے، ڈوبنے نہ پائے، اگر خدا نخواستہ مدیون دین کی رقم سے کترا کر فرار ہو جائے یا اس سے نکالی ہو جائے تو دائن رہن سے اپنا دین وصول کر سکے۔ ڈپوزٹ اور ضمانت کی رقم کا بھی یہی مقصد ہوتا ہے کہ اگر کرایہ دار درمیان میں کرایہ ادا کئے بغیر مکان خالی کر کے فرار ہو جائے، یا مکان میں اپنی طرف سے تغیر و تبدیلی کر دے تو مالک ڈپوزٹ کی رقم سے اپنی واجب الادا رقم وصول کر لے اور نقصان کی صورت میں نقصان کی تلافی کر سکے۔ نیز جس طرح رہن میں جب تک دین ادا نہیں کیا جاتا ہے اس وقت تک مال رہن کی واپسی نہیں ہوتی ہے۔ اسی طرح ڈپوزٹ کی صورت میں بھی جب تک مکان کرایہ دار خالی نہ کردیا جائے یا مدت اجارہ ختم نہ ہو جائے، اس رقم کی واپسی نہیں ہوتی۔ اس لئے میرے نزدیک اس رقم کی حیثیت مال رہن کی ہے۔ اور رہن کے بارے میں حکم شرعی یہ ہے کہ اس کی زکوٰۃ نہ تو راہن پر واجب ہوتی اور نہ ہی مرتہن پر۔ راہن پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی علت یہ ہے کہ اگرچہ اسے مال رہن پر ملکیت حاصل ہے مگر اس پر اس کا قبضہ نہیں ہے، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک تام یعنی ملک رقبہ اور ملک ید دونوں ضروری ہے جو یہاں پر مفقود ہے۔ اس لئے راہن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ راہن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی دوسری علت یہ ہے کہ یہ رقم اس کی ضروریات میں مشغول ہے، یا رہائشی مکانات کو رہن رکھا ہے کہ اس کی بنیادی ضرورت ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا ضروریات اصلیہ سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ اور مرتہن پر عدم وجوب کی علت یہ ہے کہ گو مرتہن کو مال رہن پر قبضہ حاصل ہوتا ہے، اگر اس کو اسے قبضہ حاصل ہوتا ہے لیکن اس کے حق میں یہی ملک تام کا تحقق نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر بھی

زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی. علامہ حصکفی نے لکھا ہے :

"ولافی مرھون بعد قبضہ"[1] اور مال رہن پر قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ شامی نے درمختار کے قول "ولافی مرھون بعد قبضہ" کے تحت لکھا ہے :

"مال مرہون کی زکوٰۃ مرتہن پر اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ اسے صرف قبضہ حاصل ہوتا ہے ملک رقبہ حاصل نہیں ہوتا ہے. اور راہن پر اس کی زکوٰۃ اس لئے واجب نہیں ہوگی کہ مال مرہون پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہوتا ہے. اور جب مال مرہون واپس کیا جائے گا تو راہن پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی"۔[2]

اس لئے اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ :

"وہ رقم جو بطور پیشگی (ADVANCE) مالک مکان / دوکان کو دی جاتی۔ اس کی حیثیت مال رہن کی ہے. لہذا اس کی زکوٰۃ نہ تو کرایہ دار پر واجب ہوگی اور نہ مالک مکان پر۔ کیوں کہ ان دونوں میں سے کسی کو بھی اس رقم پر "ملک تام" حاصل نہیں ہوتا ہے"۔

مدارس اور اداروں کی رقوم پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ کے لئے شرعاً مال پر "ملک تام" حاصل ہونا ضروری ہے. لہذا وہ سارے اموال جن کا کوئی متعین فرد مالک نہ ہو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی. مدارس اور اداروں میں جو رقوم جمع ہوتی ہیں ان کا مالک بھی کوئی متعین فرد نہیں ہوتا ہے. اس لئے ان رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی. علامہ شامی نے درمختار کے قول "ملک نصاب" کے تحت لکھا ہے :

"فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک"[3]

پس وقف کے سائمہ جانور اور گھوڑے میں ملکیت کے فقدان کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

علامہ کاسانی نے لکھا ہے :

---

[1] شامی ج ۲ ص ۲۶۶ [2] شامی ج ۲ ص ۲۶۶ [3] حوالہ بالا ج ۲ ص ۲۵۹

(الف) : اس شخص کے پاس سارا مال حرام ہی ہو جو اس نے ناجائز اور حرام ذرائع سے حاصل کر کے جمع کر رکھا ہو۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا حلال وطیب مال نہ ہو۔ اس صورت میں اس شخص کو مالِ حرام پر ملکیت حاصل نہیں ہے، بلکہ سارا ہی مال ناپاک اور خبیث ہونے کی بناء پر واجب التصدق ہے۔ یا اگر جن لوگوں سے ناجائز طور پر مال حاصل کیا گیا تھا وہ معلوم ومتعین ہیں تو ان تک اس مال کی واپسی لازم اور ضروری ہے۔ اس صورت میں چوں کہ سارا ہی مال واجب التصدق یا واجب الرد ہے، اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مالِ خبیث پر ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ملکیت اور قبضہ ضروری ہے۔ شامی میں ہے :

" لو کان الخبیث نصاباً لا یلزمہ الزکاۃ لان الکل واجب التصدق فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ " [1]

اگر کسی شخص کے پاس مالِ خبیث بقدرِ نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ پوری رقم واجب التصدق ہے، پس صرف زکوٰۃ کی مقدار صدقہ کو واجب کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

کتاب البیوع میں شامی نے مالِ حرام کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

" الحاصل انہ ان علم ارباب الاموال وجب ردہ علیہم والا فان علم عین الحرام لا یحل لہ ویتصدق بہ بنیۃ صاحبہ " [2]

حاصل یہ ہے کہ اگر اربابِ اموال معلوم ہوں تو ان تک مال کا لوٹانا واجب ہوگا، ورنہ اگر عین حرام کا علم ہو تو وہ رقم اس کے لئے حلال نہیں ہوگی اور صاحبِ مال کی نیت سے اس کا تصدق ضروری ہوگا۔

بحر الرائق میں ہے :

" ملکہ ملکاً خبیثاً فسبیلہ التصدق بہ " [3]

علامہ یوسف القرضاوی نے مالِ حرام پر زکوٰۃ کے عدمِ وجوب کی علت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

---

[1] شامی ج ۲ ص[illegible] [2] بحوالہ بالا ج ۲ ص[illegible] [3] البحر الرائق ج ۲ ص[illegible]

"وجوب زکوۃ کے لئے ملکیت کی جو شرط لگائی گئی ہے۔ اس سے وہ مال خارج ہو جاتا ہے جسے ناپاک اور حرام ذرائع سے حاصل کیا گیا ہو۔ جیسے غصب، چوری، رشوت، سود اور فریب دہی کے ذریعہ حاصل کئے گئے اموال ..... صحیح بات یہ ہے کہ لوگ اس قسم کے اموال کے مالک نہیں ہوتے ہیں اگرچہ انھوں نے اپنے جائز مال کے ساتھ اسے اس طرح ملا لیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا مشکل ہو۔ علماء کہتے ہیں کہ اگر مال خبیث بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ ایسے شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس مال کی ذمہ داری سے اپنے کو سبکدوش کر دے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر اس کا حقدار معلوم ہو تو اس کو اس کا حق پہنچائے یا اس کے ورثہ کے حوالہ کرے۔ بصورت دیگر فقراء پر صدقہ کر دے۔ اور دریں صورت پورا مال صدقہ کرنا ضروری ہے۔ لہٰذا صرف اس کے ایک حصہ (یعنی زکوۃ کی حد تک) صدقہ کرنے کا حکم دینا مفید نہیں ہوگا۔"[1]

(ب) : دوسری صورت یہ ہے کہ اس کے پاس مال حرام کے علاوہ کچھ حلال وطیب مال بھی ہو۔ اس کی بھی دو صورتیں ہوں گی :

۱۔ مال حلال اور مال حرام علیحدہ علیحدہ ہو، دونوں ایک دوسرے سے ممتاز و میز ہوں تو اس صورت میں بھی مال حرام پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ کیونکہ مال حرام واجب التصدق ہوگا یا اصحاب اموال معلوم ہوں تو ان تک واپسی ضروری ہوگی۔

۲۔ مال حرام اور مال طیب کو اس طرح خلط ملط کر دیا گیا ہو کہ دونوں کو علیحدہ کرنا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں اس مال میں زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس میں حضرت امام ابوحنیفہ اور صاحبین امام ابویوسف، امام محمد کا اختلاف ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ دراہم و دنانیر (موجودہ دور میں کرنسی نوٹ بھی دراہم و دنانیر کے حکم میں ہیں) کا اس طرح خلط ملط کر دینا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو استہلاک ہے۔ لہٰذا اس استہلاک کی وجہ سے وہ شخص پورے مال کا مالک بن جائے گا البتہ مال حرام کی مقدار کا وہ ضامن قرار پائے گا اور اس پورے مخلوط مال میں زکوۃ واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔

صاحب ولوالجیہ نے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ بہت کم ایسے

[1] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۳۳

لوگ ہیں جن کے پاس صرف مال حلال وطیب ہوتا ہے۔ ورنہ عام طور پر لوگوں کے مال میں غصب وغیرہ کی آمیزش ہوتی ہے۔ علامہ ابن نجیم مصری نے اس پر یہ اشکال کیا ہے کہ:

"اگرچہ امام صاحب کے قول کے مطابق "خلط" اور "استہلاک" کے ذریعہ وہ مال حرام کا مالک بن جائے گا۔ مگر وہ اس مقدار مال کا ضامن ہوگا تو گویا وہ مال مشغول بالدین ہوا۔ اور وجوب زکوۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا امام صاحب کے قول کے مطابق بھی اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ اسی لئے مجتبیٰ میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کردیں، تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ ابراء سے قبل وہ رقم مشغول بالدین ہوگی۔ یہ قید بہت مناسب ہے۔ اس کا یاد رکھنا ضروری ہے۔"[۱]

فتاویٰ تاتارخانیہ کی عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ خلط کی صورت میں بھی امام صاحب کے قول کے مطابق صرف اس صورت میں زکوۃ واجب ہوگی جب کہ اس کے پاس مال مخلوط کے علاوہ دوسرا طیب و حلال مال بقدر نصاب موجود ہو۔ اگر دوسرا نصاب نہ ہو تو چاہے مال مخلوط جس مقدار میں بھی ہو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ چنانچہ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

"ومن ملك اموالا غير طيبة او غصب اموالا وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامنا وان لم يكن سواها نصاب فلا زكوة عليه في تلك الاموال وان بلغت نصابا لانه مديون ومال المديون لا ينعقد سببا لوجوب الزكاة عندنا"[۲]

اور درمختار میں ہے:

"وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه والا فلا زكوة عليه"

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی صرف اس صورت میں مال مخلوط پر وجوب زکوۃ ہوگا جب کہ مال حرام کا مالک اسے بری الذمہ کردے۔ یا یہ شخص اس کے اصل

---

[۱] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۲۱ [۲] فتاوی التاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۹۹

مالک سے کچھ مال کے بدلے مصالحت کرے تو اس صورت میں چوں کہ اس مال کا خبث زائل ہو جائیگا اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"لکن علمت انه لا تجب زکاته الا اذا استبرأ من صاحبه او صالح عنه فیزول خبثه"۔ [1]

صاحبین فرماتے ہیں کہ مال حرام کو مال حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے وجوب ضمان نہیں ہوتا ہے۔ اور چوں کہ ضمان ہی کی فرع ملکیت ہے۔ اس لئے اس مال پر اسے ملکیت بھی حاصل نہیں ہوگی۔ لہذا اس مال پر نہ تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی اس میں وراثت جاری ہوگی کیونکہ وہ مال مشترک ہے۔ لہذا جتنا اس میں میت کا حصہ تھا صرف اسی میں وراثت جاری ہوگی۔

علامہ ابن نجیم مصری نے مال حرام پر وجوب زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ولهذا قالوا لو ان سلطاناً غصب مالاً وخلطه صار ملکاً له حتی وجبت علیه الزکاة وورث عنه علی قول ابی حنیفة لان خلط دراهمه بدراهم غیره عنده استهلاك، اما علی قولهما فلا یضمن فلا یثبت الملك لانه فرع الضمان فلا یورث عنه لانه مال مشترك فانما یورث حصة المیت منه وفی الولوالجیة وقوله ارفق بالناس اذ قلما یخلو مال من غصب۔ هکذا ذکروا وهو مشکل لانه وان کان ملکه عند ابی حنیفة بالخلط فهو مشغول بالدین والشرط الفراغ فینبغی ان لا تجب الزکاة فیه علی قوله ایضاً ولهذا شرط فی المجتبی والمعجمة ان یبرأ منه اصحاب الاموال لانه قبل الابراء مشغول بالدین وهو قید حسن یجب حفظه" [2]

اور اسی بنا پر فقہاء نے کہا ہے کہ اگر بادشاہ نے مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو وہ مال اس کی ملک ہو جائے گا۔ اور حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق اس مال پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی۔ اور وراثت بھی جاری ہوگی۔ اس لئے کہ ان

---

[1] شامی ج ۲ ص [illegible]　　[2] البحر الرائق ج ۲ ص [illegible]

کے نزدیک اپنے دراہم کو دوسرے کے دراہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے لیکن صاحبین کے قول کی بنیاد پر وہ ضامن نہیں ہوگا، اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی، اس لئے کہ ملکیت ضمان کی فرع ہے، لہٰذا اس مال میں وراثت بھی جاری نہیں ہوگی کیونکہ وہ مال مشترک ہے، صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی۔ ولوالجیہ میں امام صاحب کے قول کو "ارفق بالناس" قرار دیا ہے، اس لئے کہ بہت کم مال غصب وغیرہ سے پاک ہوتا ہے۔ فقہاء نے اسی طرح ذکر کیا ہے۔ لیکن امام صاحب کے قول کے مطابق زکوٰۃ کا وجوب مشکل ہے۔ اس لئے کہ اگرچہ خلط کے ذریعہ ملکیت حاصل ہو جائے گی لیکن وہ مال مشغول بالدین ہے، اور وجوب زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے، پس مناسب یہ ہے کہ امام صاحب کے قول کے مطابق بھی وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہئے اسی بنیاد پر منتقی میں یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اصحاب اموال اسے بری کر دیں اس لئے کہ ابراء سے قبل وہ رقم مشغول بالدین ہوگی، یہ قید بہتر ہے۔ اس کا یاد رکھنا ضروری ہے۔

علامہ ابن الہمام نے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اور اسی بنیاد پر فقہاء نے کہا کہ اگر سلطان نے کسی کا مال غصب کر لیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر لیا تو اس پر اسے ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوگی اور وراثت بھی جاری ہوگی۔ اور یہ بات مخفی نہیں ہے کہ یہ مسئلہ امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق ہے۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک دوسرے کے دراہم کو اپنے دراہم کے ساتھ مخلوط کر دینا استہلاک ہے لیکن صاحبین کے قول کے مطابق یہ استہلاک نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس مال کا ضامن نہیں ہوگا اور اس پر اسے ملکیت حاصل نہیں ہوگی کیونکہ ملکیت ضمان کی فرع ہے۔ اور نہ ہی اس پورے مال میں وراثت جاری ہوگی۔ اس لئے کہ وہ مال مشترک ہے۔ پس صرف میت ہی کے حصہ میں وراثت جاری ہوگی"۔ [1]

---

[1] فتح القدیر ۲ ص۱۶۰

علامہ حصکفی نے مالِ مخلوط پر زکوٰۃ کا حکم ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اگر سلطان نے مالِ مغصوب کو اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو وہ اس کا مالک ہو جائے گا۔ اور اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اور وراثت جاری ہو گی۔ اس لئے کہ دوسرے کے مال کو اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیا کہ ان کے درمیان تمیز ممکن نہ ہو امام ابو حنیفہ کے نزدیک استہلاک ہے۔ امام صاحب کا قول ارفق بالناس ہے، اس لئے کہ بہت کم ہی مال ایسا ہوتا ہے جو غصب وغیرہ سے مخلوط ہوتا ہے۔ اور زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہو گا جب کہ اس کے پاس مالِ مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہو جس سے وہ دین ادا کر سکے۔ ورنہ زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی شامی میں ہے: صاحبین کے قول کے مطابق وجوب ضمان نہیں ہو گا۔ لہٰذا ملکیت بھی ثابت نہیں ہو گی اس لئے کہ وہ ضمان کی فرع ہے۔ اور نہ اس مال میں وراثت جاری ہو گی۔ کیونکہ وہ مال مشترک ہے۔ صرف میت کے حصہ میں وراثت جاری ہو گی۔"[1]

ان تفصیلات کی روشنی میں مالِ حرام جو مخلوط ہو اس کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ:

"اس مال پر حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کی بنیاد پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔ کیوں کہ مالِ حرام کو مالِ حلال کے ساتھ مخلوط کر دینے کی وجہ سے بوجہ استہلاک اگرچہ اسے اس مال پر ملکیت حاصل ہو جائے گی۔ مگر چوں کہ وہ اس مقدار کا ضامن ہو گا۔ اور اس پر واجب ہو گا کہ مالِ حرام کی جتنی مقدار اس نے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے۔ اسے صاحبِ مال تک لوٹا دے۔ یا اگر صاحبِ مال کا علم نہ ہو تو اس کی طرف سے صدقہ کر دے۔"

اس طرح سے وہ رقم مشغول بالدین ہوئی۔ حالاں کہ وجوبِ زکوٰۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا ضروری ہے۔ البتہ اس مال پر وجوبِ زکوٰۃ کی یہ صورتیں ہیں:

(الف) اس شخص کے پاس مالِ مخلوط کے علاوہ اتنا مال ہے کہ وہ اس کے ذریعہ اپنے ذمہ واجب دین کو ادا کر دے تو بھی اس کے پاس بقدر نصاب مال رہ جائے تو اس صورت میں اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ درمختار میں ہے:

---

[1] شامی ج ۲ ص ۲۹۰

"وهذا إذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه یوفی دینه وإلا فلا زکوٰۃ" [۱]

(ب) جن لوگوں سے اس نے حرام طریقے سے حاصل کیا تھا وہ لوگ اپنی اپنی رقم سے اسے بری الذمہ کردیں، یا وہ شخص صاحب اموال سے کچھ مال دے کر مصالحت کرلے تو اس صورت میں چوں کہ مال حرام کا خبث دور ہو جائے گا اور وہ شخص پورے طور پر اس مال کا مالک بن جائے گا۔ اس لئے اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ شامی میں ہے:

"إلا إذا استبرأ من صاحبه أو صالحه عنه فیزول خبثه" [۲]

۵ ـــ دیون کی زکوٰۃ

ملک تام کی شرط کے ذیل میں دیون کی زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے کہ دین کی زکوٰۃ شرعاً کس پر واجب ہوگی، دائن پر جس کی ملک تو ہے لیکن قبضہ نہیں، یا مدیون پر جس کے قبضہ میں وہ رقم ہے، لیکن اس کی ملک میں نہیں یا دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی۔

دیون کی زکوٰۃ کے بارے میں امام ابو عبید (م ۲۲۴ھ) نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف کتاب الاموال" میں ائمہ سلف کے پانچ اقوال ذکر کئے ہیں:۔

۱ ـــ اگر دین کسی مالدار شخص کے ذمہ ہو تو اپنے دیگر اموال کے ساتھ دین کی بھی زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

۲ ـــ اگر دین کی وصولیابی کی امید نہ ہو، پھر وہ وصول ہو جائے تو قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔

۳ ـــ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے اس مال پر جتنا بھی سال گزرا ہو۔

۴ ـــ دین کی زکوٰۃ صرف قرض لینے والے پر واجب ہوگی، قرض دینے والے پر نہیں۔

۵ ـــ دین کی زکوٰۃ نہ تو دائن پر واجب ہوگی اور نہ مدیون پر۔ چاہے مدیون ثقہ اور مالدار ہو۔

---

[۱] [۲] شامی ج ۲ ص ۲۹۱

ائمہ مجتہدین میں سے امام مالک نے تیسرے قول کو اختیار کیا ہے یعنی ان کے نزدیک صرف ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی سفیان ثوری اور فقہاء عراق کی رائے ہے کہ اگر دین کے وصول ہونے کی امید ہو تو اس صورت میں گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی ہوگی۔ اور اگر دین کے وصولیابی کی امید نہ ہو تو اہل عراق کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی [۱]

تابعین میں سے حضرت عکرمہ، اور عطاء بن ابی رباح اس بات کے قائل ہیں کہ دین کی زکوٰۃ کسی پر بھی واجب نہیں ہوگی [۲]۔ ابن حزم نے حضرت عائشہ کا قول نقل کیا ہے کہ: لیس فی الدین زکاۃ۔ دین میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ ظاہریہ کا یہی مسلک ہے [۳]۔

علامہ یوسف القرضاوی نے لکھا ہے کہ جمہور فقہاء کے نزدیک دیون کی دو قسم ہے:

۱۔ ایک قرض وہ ہے جس کی وصولیابی متوقع ہو یعنی قرض ایسے شخص پر ہو جو اسے ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور دین کا اقرار بھی کرتا ہو۔ ایسے دین کی زکوٰۃ اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ہر سال ادا کی جائے گی۔ ابو عبید نے صحابہ میں سے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، جابرؓ، ابن عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"تابعین میں سے حسن البصری، ابراہیم، جابر بن زید، مجاہد اور میمون بن مہران کا یہی فتوی ہے [۴]"

۲۔ دوسرا قرض وہ ہے جس کی وصولیابی کی توقع نہ ہو یعنی دین ایسے کسی شخص پر ہو جو تنگدست ہو۔ اور اس کے خوشحال ہونے کی امید نہ ہو یا دین ایسے شخص پر ہو جو اس کا انکار کر رہا ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو اس صورت کا حکم مختلف فیہ ہے۔ اس کے بارے میں فقہاء کے دو اقوال ہیں:

۱۔ پہلا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ حضرت علیؓ اور ابن عباسؓ کا یہی مذہب ہے۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ کے بعد صرف ایک سال کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ حسن، عمر بن عبد العزیز کا یہی مسلک ہے۔ امام مالک کے نزدیک دیون کی تمام اقسام کا یہی حکم ہے۔

۳۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس مال پر نہ تو ایک سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ گذشتہ سالوں کی

---

[۱] کتاب الاموال ص ۵۲۱
[۲] بحوالہ بالا ص ۵۲۲
[۳] فقہ الزکاۃ ج ۱ ص ۱۳۳
[۴] کتاب الاموال ص ۵۲۳

بلکہ قبضہ کے بعد جب حولان حول ہو جائے گا تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمد کا یہی مذہب ہے۔[1]

حنفیہ کے نزدیک وہ دین جس کی وصولیابی کی امید نہ ہو پھر اتفاق سے وہ وصول ہو جائے تو اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی کیونکہ یہ قول حضرت علی مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ ابن الہمام نے حضرت حسن بصری اور عمر بن عبدالعزیز کا بھی یہی مسلک ذکر کیا ہے۔[2]

دین کے قابل وصول ہونے کی اور ناقابل وصول ہونے کے لحاظ سے فقہاء احناف نے دین کے اندر یہ تفصیل کی ہے:

۱۔ ایسا مقروض جو قرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور وہ قرض کا اقرار بھی کرتا ہو تو اس کے ذمہ واجب الادا دین کی زکوٰۃ دائن کو ادا کرنی پڑے گی۔ اگر مقروض تنگدست ہو تو بھی مشہور قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ لیکن حسن بن زیاد کی روایت یہ ہے کہ تنگدست پر دین ہونے کی صورت میں اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔

۲۔ ایسا شخص جس کا دیوالیہ ہو گیا ہو اور اسلامی حکومت نے اس کے دیوالیہ پن کی وجہ سے اُسے "مفلس" قرار دے دیا ہو۔ صاحبین کے قول کے مطابق ایسے شخص کے ذمہ جو دین ہو گا اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب نہیں ہو گی۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حکومت اور عدالت کی رائے کسی شخص کے دیوالیہ اور تفلیس کی بابت معتبر نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ دائن کو ادا کرنی ہو گی۔ امام ابوحنیفہ کے قول کے مطابق قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی صاحبین کے نزدیک گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔[3]

اسی طرح اگر مدیون دین سے انکاری ہو اور اس کے خلاف ثبوت فراہم ہو تو مشہور قول کے مطابق اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہو گی۔ مگر عدالت کی پیروی اور قاضی کے فیصلہ حاصل کرنے میں جو دشواریاں ہیں ان کے پیش نظر علماء نے اس صورت میں دائن پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی ہے۔ کیونکہ

---

[1] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۶ — [2] فتح القدیر ج ۲ ص ۱۲۳

[3] ھدایہ مع فتح القدیر ج ۲ ص ۱۲۱

گواہی کے لئے گواہوں کو عدالت کے سامنے پیش کرنا اور قاضی سے انصاف کی توقع رکھنا مشکل ہے۔[1]

لیکن اس سلسلہ میں حنفیہ کا اتفاق ہے کہ وہ دین جس سے مدیون انکاری ہو اور اس کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو تو اس دین پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ آئندہ اگر خلاف توقع وہ دین وصول بھی ہو جائے تو گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔[2]

دیون کی اقسام اور ان کا حکم

امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے :۔

۱۔۔۔۔ **دین قوی** :۔۔۔۔۔ وہ دین جو مال تجارت کے بدلے میں واجب ہو جیسے سامان تجارت کی قیمت، تجارت کے غلام اور مال تجارت کے غلہ کی قیمت، قرض بھی اسی حکم میں ہے۔ اسے "دین قوی" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دین قوی کے بارے میں امام ابوحنیفہ اور صاحبین کے مابین زکوٰۃ کے وجوب کی بابت کوئی اختلاف نہیں ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ جب دین کا ایک خمس یعنی چالیس درہم وصول ہو جائے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔ اور چالیس میں سے ایک درہم ادا کرنا پڑے گا۔ صاحبین کہتے ہیں کہ جتنا جتنا دین وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔[3]

۲۔۔۔۔ **دین متوسط** :۔۔۔۔۔ وہ دین جو کسی مالی عوض کے طور پر واجب ہو مگر وہ سامان تجارت کی قیمت نہ ہو بلکہ ایسے مال کے بدلے میں واجب ہو جس میں شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے استعمالی کپڑوں اور رہائشی مکان کی قیمت۔ خدمت کے غلام کی قیمت۔ ایسے دین کو "دین متوسط" کہا جاتا ہے۔ دین متوسط کے بارے میں امام ابوحنیفہ سے دو روایت ہے۔ ایک روایت کے مطابق "دین متوسط" ان کے نزدیک "دین قوی" کے حکم میں ہے۔ اور دوسری روایت کے مطابق "دین ضعیف" کے حکم میں۔ کتاب الاصل میں امام صاحب کے حوالے سے ذکر کیا گیا ہے کہ قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ کا نفس وجوب ہو جائے گا۔ البتہ ادائیگی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب اس پر قبضہ ہو جائے۔[4]

---

[1] عنایہ علی ہامش الہدایہ ج ۲ ص ۱۲۲ [2] ہدایہ علی ہامش الفتح ج ۲ ص ۱۲۱

[3] بدائع ج ۲ ص ۱۰ البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۱، المبسوط ج ۲ ص ۱۹۵ [4] حوالہ بالا

ابن نجیم نے لکھا ہے:

"صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کے نزدیک "دین وسط" پر اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ بقدر نصاب دین پر قبضہ ہو جائے۔ البتہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ اور قول ضعیف کے مطابق گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ نہیں دینی پڑے گی"[1]

ابن سماعہ نے امام ابو یوسف کے واسطے سے امام ابو حنیفہ سے نقل کیا ہے کہ دین کی صرف دو قسم ہے اور انھوں نے "دین وسط" کو "دین ضعیف" قرار دیا ہے۔ کرخی نے بھی اسی قول کو اختیار کیا ہے۔[2]

صحیح قول کے مطابق دین قوی اور دین متوسط میں صرف اتنا فرق ہے کہ دین قوی کے ایک خمس کی وصولیابی پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے۔ جب کہ دین متوسط کی صورت میں بقدر نصاب مال پر قبضہ ضروری ہوتا ہے۔ صاحبین کے نزدیک سارے دیون برابر ہیں۔ قبضہ سے پہلے ان کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ البتہ جتنی مقدار پر قبضہ ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ ادا کرنی پڑے گی۔[3]

۳ — **دینِ ضعیف** — وہ دین جو کسی مالی عوض کے بدلے میں واجب نہیں ہوتا ہے۔ جیسے مہر کی رقم، خلع، اور صلح من القصاص کی رقم۔ اس دین کا حکم یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ وصولیابی کے بعد جب اس رقم پر مکمل ایک سال گزر جائے گا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بدائع میں ہے:

"ولا زکوٰۃ فیہ مالم یقبض ویحول علیہ الحول بعد القبض"[4]

خلاصہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک دیون کی مذکورہ تمام قسموں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ لیکن ادائیگی قبضہ کے بعد ہوگی۔ دین قوی میں خمس نصاب یعنی کم سے کم چالیس درہم کی وصولیابی کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی اور دین متوسط اور دین ضعیف میں نصاب کی مالیت کے بقدر قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم ہوگا۔ البتہ دین متوسط میں گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑیگی جب کہ دین ضعیف میں حولان حول کے بعد زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

مالکیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں:

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص [illegible]   [2] المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۱۹۵

[3] البحر الرائق ج ۲ ص [illegible]، بدائع ج ۲ ص [illegible]، مبسوط ج ۲ ص ۱۹۵   [4] بدائع ج ۲ ص [illegible]

۱ــــــ دین کی ایک قسم وہ ہے جس پر قبضہ کے بعد مکمل ایک سال گزرنے کے بعد زکوۃ کی ادائیگی واجب ہوتی ہے وراثت، ہبہ، وقف، صدقہ، عورت کا مہر اور خلع کا عوض، اسی قبیل کے دین سے تعلق رکھتا ہے۔ ان تمام دیون میں قبضہ سے پہلے زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضہ کے بعد سے جب ایک سال اس پر گزر جائے گا تو اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔

۲ــــــ دوسرے وہ دین ہے جس میں صرف ایک سال کی زکوۃ واجب ہوتی ہے، جیسے دین قرض اور دین تجارت" جسے حنفیہ کے نزدیک" دین قوی" سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس طرح کے دین میں مالکیہ کے نزدیک حسب ذیل چار شرطوں کے ساتھ وجوب زکوۃ ہوگا۔

۱ــــــ قرض کی اصل سونا، چاندی ہو یا جمع کئے گئے سامان تجارت کی قیمت ہو، مثلاً تجارتی کپڑوں کی قیمت۔

۲ــــــ اس دین کے ایک حصہ پر دائن کا قبضہ ہو چکا ہو، اگر دین کا کچھ بھی حصہ اس کے قبضہ میں نہیں آیا تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

۳ــــــ قبضہ کی ہوئی شئی نقد سونے، چاندی کے قبیل سے ہو، اگر اس نے سامان تجارت مثلاً کپڑے یا گیہوں پر قبضہ کیا تو اس کی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

۴ــــــ جتنے مال دین پر اس کا قبضہ ہوا ہے وہ کم سے کم بقدر نصاب ہو، یا اگر نصاب سے کم ہو مگر اس کے پاس دوسری مالیت ہو جس کے ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

۳ــــــ تیسرے دین مدیر ہے: دین مدیر سے اس تاجر کا دین مراد ہے جو موجودہ قیمت کے ساتھ خرید و فروخت کرتا ہے۔ پس اگر دین کی اصل سامان تجارت ہو تو وہ ہر سال دین کی زکوۃ ادا کریگا۔[1] شوافع کے نزدیک اگر دین دراہم و دینار یا سامان تجارت کی قیمت کے قبیل سے ہو تو جب دائن اپنے دین پر قبضہ کرلے گا یا اپنے دین کے حاصل کرنے پر اسے قدرت حاصل ہو جائے گی تو گذشتہ تمام سالوں کی اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ اگر دین مویشی اور مطعوم کے قبیل سے ہو تو اس پر زکوۃ واجب

---

[1] الشرح الکبیر ج ا ص [illegible]، بدایۃ المجتہد ج ا ص [illegible]، الشرح الصغیر ج ا ص [illegible]، الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص [illegible]

نہیں ہوگی[1]

دین کے بارے میں حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی چاہے دین معجل ہو یا مؤجل اور چاہے مقروض دین کا اقرار کرنے والا ہو یا اس سے انکاری ہو۔ اور چاہے وہ تنگدست ہو یا خوشحال یا ٹال مٹول کرنے والا۔ البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد واجب ہوگی۔ اور گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی پڑیگی[2]

۷۔۔۔۔ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ

"تملک تام" ہی کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں سرکاری محکموں مختلف پرائیویٹ کمپنیز اور ادارے میں جو لوگ ملازمت کرتے ہیں۔ ان کی ماہانہ تنخواہ میں سے ایک متعین حصہ وضع کرکے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کردیا جاتا ہے اور کچھ فیصد سرکار یا کمپنی اپنی طرف سے اس میں اضافہ کرتی ہے۔ اور ریٹائرمنٹ .... کے وقت وہ پوری رقم مع بونس کے ملازم کو دے دی جاتی ہے۔ دوران ملازمت بھی بعض خاص قواعد کی پابندی کرتے ہوئے ملازم کو اپنے اس محفوظ فنڈ سے کچھ حصہ نکالنے کا اختیار ہوتا ہے۔ یہ رقم عام اصطلاح میں پراویڈنٹ فنڈ (P.F) کہلاتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا رقم پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر ہوگی تو کب؟ اور اگر زکوٰۃ وصولیابی کے بعد واجب ہوگی تو گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی؟ یا قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ پراویڈنٹ فنڈ (P.F) پر زکوٰۃ کا حکم لگانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس رقم کی حیثیت کی تعیین کرلی جائے کہ دین کی کس قسم میں اس کا شمار ہے۔ پھر اس پر حکم لگانا آسان ہوگا۔ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک دین کی تین قسم ہے:

دین قوی:۔۔۔۔ وہ ہے جو سامان تجارت یا سونے چاندی کے بدلے کسی کے ذمہ واجب ہو۔ (اس کی تفصیل دیون کی کشت کے ذیل میں گزرچکی ہے۔

دین متوسط:۔۔۔۔ جو مالی معاوضہ کے طور پر ذمہ میں واجب ہو مگر وہ ایسے سامان کی قیمت ہو جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔ جیسے استعمالی کپڑے اور رہائشی مکان کی قیمت۔

---

[1] الفقہ الاسلامی وادلتہ ج ۲ ص ۷۵۳ [2] المغنی ج ۳ ص ۴۷

دین ضعیف :۔ جو مالی معاوضہ کے بغیر واجب ہو۔ جیسے عورت کا دین مہر، خلع اور صلح کی رقم۔

ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کو دین قوی قرار نہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ وہ کسی سامان تجارت کا معاوضہ نہیں ہے۔ بلکہ ملازم کی خدمت کا معاوضہ ہے۔ اور خدمت مال تجارت ہے یا نہیں؟ اس میں حنفیہ کے نزدیک یہ تفصیل ہے کہ:

> "غلام اور مکان اگر تجارت کے لئے نہ ہو تو اس کی خدمت و اجرت کو مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے۔ البتہ جو غلام اور مکان تجارت کے لئے ہو اس کی خدمت و اجرت کو مال تجارت قرار دیا گیا ہے[1] تو جب غلام کی خدمت کو علی الاطلاق مال تجارت قرار نہیں دیا گیا ہے بلکہ صرف تجارت کے غلام کی خدمت کو مال تجارت قرار دیا گیا تو آزاد شخص کی خدمت کو بدرجہ اولیٰ مال تجارت قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔"

اب صرف دو احتمال باقی رہ جاتے ہیں :۔

۱ ـــــ اگر خدمت کو مال تجارت قرار دیا جائے تو وہ "دین متوسط" میں داخل ہوگا۔

۲ ـــــ اور اگر سے مال ہی قرار نہ دیا جائے تو وہ دین ضعیف میں داخل ہوگا۔

خدمت و اجرت کے بارے امام ابو حنیفہ سے دو قول منقول ہیں :۔

۱ ـــــ ایک قول یہ ہے کہ وہ "دین متوسط" کے حکم میں ہے اور قبضہ سے پہلے بھی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مبسوط، جامع اور الاصل میں امام صاحب سے یہی قول منقول ہے۔ علامہ شمس الدین سرخسی نے اس قول کو اصح قرار دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ منفعت عقد کے ذریعہ مالیت کا حکم لے لیتی ہے۔ اس قول کے مطابق اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہونے کے بارے میں امام صاحب سے دو قول منقول ہیں۔

۱۔ ایک قول یہ ہے کہ جب تک دو سو درہم (بقدر نصاب) پر قبضہ نہ ہو جائے زکوٰۃ کی ادائیگی واجب نہیں ہوگی۔

۲۔ دوسرا قول یہ ہے کہ چالیس درہم پر قبضہ کرنے کے بعد اس کی زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوگی۔

۲ ـــــ دوسرا قول یہ ہے کہ خدمت و اجرت "دین ضعیف" کے حکم میں ہے اور وہ مہر کی طرح ہے۔

---

[1] المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۲

امام ابو یوسف نے اسے امام صاحب سے نقل کیا ہے۔ اس قول کے مطابق اس کی وصولیابی کے بعد جب حولان حول ہو جائیگا تو اس کی زکوٰۃ واجب ہو گی[۱]

اجرت وخدمت کے بارے میں تیسری روایت یہ ہے کہ اجرت وخدمت علی الاطلاق نہ تو مال ہے اور نہ غیر مال، بلکہ اگر عبد تجارت کی خدمت یا مکان تجارت کی اجرت ہے تو وہ مال ہے، ورنہ مال نہیں ہے۔ صاحب مبسوط نے اس روایت کو "اصح" قرار دیا ہے۔[۲]

مگر یہ سب مباحث اور روایات کا اختلاف غلام کی خدمت کے بارے میں ہے، جو من وجہ مال ہے۔ آزاد کی خدمت کے مال ہونے کی صراحت کسی فقیہ نے نہیں کی ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں پراویڈنٹ کی رقم "دین قوی" میں داخل نہیں ہو سکتی اور اسے "دین متوسط" میں بھی داخل کرنا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ مل جائے۔ اور اگر بالفرض اسے "دین متوسط" میں داخل بھی کر دیا جائے تو صحیح قول کے مطابق اس کا حکم بھی "دین ضعیف" کی طرح یہی ہے کہ اس پر گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

لہٰذا پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ جب وہ رقم قبضہ میں آجائے گی تو سال مکمل ہونے کے بعد اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی۔ گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ حضرت تھانوی علیہ الرحمہ نے ۱۳۰۰ھ پر زکوٰۃ کا عدم وجوب ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "اس روایت سے معلوم ہوا کہ اس جمع شدہ روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ وصول کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس تفصیل سے کہ اگر اس کے پاس پہلے سے کوئی نصاب نہیں تب تو بعد حولان حول کے اور اگر کوئی نصاب ہو تو اس نصاب کی زکوٰۃ کے ساتھ۔"[۳]

مفتی محمد شفیع صاحب مفتی اعظم پاکستان نے لکھا ہے:

> "روایات فقہیہ کو دیکھنے اور غور کرنے سے احقر کو یہی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس فنڈ کی رقم پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں۔"[۴]

---

[۱] المبسوط للسرخسی ج ۲ ص ۔۔ [۲] بحوالہ بالا

[۳] امداد الفتاوی ج ۲ ص ۲۵

۲ ـــــ دوسری شرط نما

نما کی تعریف اور اس کی حقیقت

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا نامی ہونا ہے۔ نما، بالعموم لغت میں زیادتی اور بڑھوتری کے معنی میں آتا ہے۔ جدید اصطلاح میں نما یا نمو کے معنی ہیں وہ مال جو صاحب مال کو فائدہ پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں:۔

نما حقیقی اور نما تقدیری ـــــ حقیقی کا اطلاق مویشیوں کی نسل بڑھنے اور کاروبار میں اضافے ہونے پر ہوتا ہے۔ اور تقدیری کا اطلاق ایسے مال پر ہوتا ہے جس کو بڑھایا جانا ممکن ہو، یعنی اضافہ پذیری کی صلاحیت رکھنے والا مال صاحب مال یا اس کے نائب کے قبضہ میں ہو۔[۱]

لہٰذا وہ مال جس میں صاحب مال اپنے ذریعہ یا اپنے نائب کے ذریعہ اضافہ اور بڑھانے پر قدرت نہ رکھتا ہو، اس کی زکوٰۃ اس پر واجب نہیں ہوگی۔ اگرچہ اس مال پر اسے ملکیت حاصل ہو۔ جیسے مال ضمار، اور اسی وصف نما کے فوت ہونے کی وجہ سے مال مفقود، عبد آبق، دریا میں گرے ہوئے مال صحرا میں دفن کئے ہوئے مال پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی گئی ہے۔[۲]

حیوانات میں نمو اور افزائش نسل کے ذریعہ ہوتی ہے اور حیوانات کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ، سونے اور چاندی میں خلقی طور پر نما پایا جاتا ہے۔ اس لئے ہر حال میں اس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ شریعت نے وجوب زکوٰۃ کے لئے حقیقت نما کو ضروری قرار نہیں دیا ہے، کیونکہ نما ایک امر خفی ہے۔ اور اس میں لوگوں کے طریقے اور ان کی عادتیں باہم مختلف ہوتی ہیں۔ اس لئے شریعت نے حیوانات کے اندر "اسامہ" کو حصول نسل کے قائم مقام قرار دیا ہے۔ اور حیوانات، اور سونے چاندی کے علاوہ دیگر اموال میں تجارت کی نیت سے اسے اپنے پاس مکمل ایک سال روک کر رکھنے کو حصول نما کے قائم مقام قرار دیا ہے۔[۳]

---

[۱] البحر الرائق ج ۲ ص [illegible]، شامی ج ۲ ص [illegible]، بدائع ج ۲ ص [illegible] [۲] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص [illegible]

[۳] بدائع ج ۲ ص [illegible]، الفتاویٰ التاتارخانیہ ج ۲ ص [illegible]

نمو کے شرط ہونے کی حکمت

محقق ابن الہمام نے "نمو" کے شرط لگانے کی حکمت و مصلحت ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اگرچہ زکوٰۃ کا مقصد ابتلاء ہے تاہم اس سے مقصود فقراء کے ساتھ مواساۃ اور ہمدردی ہے اس طور سے کہ وہ خود فقیر نہ بن جائے۔ اس کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ وہ اپنے کثیر مال میں سے تھوڑا سا مال ان پر خرچ کرے۔ لہٰذا اگر اموال غیر نامیہ میں زکوٰۃ واجب کی جاتی تو چند سال گزر جانے کے بعد اس کے برعکس صورت پیدا ہو سکتی ہے۔"[۱]

وہ اموال جن کی نشوونما رک گئی ہو ان پر زکوٰۃ

نمو کے ذیل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ اموال جن کی نشوونما اور افزائش رک گئی ہو۔ ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اگر اس پر زکوٰۃ واجب کی جاتی ہے تو رفتہ رفتہ وہ مال ہی ختم ہو جائیگا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان کے نمو میں رکاوٹ کی دو صورتیں ہیں:

۱۔۔۔ ایک وہ رکاوٹ ہے جو نفس مال کی طرف سے ہو۔

۲۔۔۔ دوسری وہ ہے جو صاحب مال کی طرف سے ہو۔

جو رکاوٹ مال کی طرف سے ہو مثلاً مال غصب کر لیا گیا ہو اور مال مغصوب کے خلاف کوئی ثبوت فراہم نہ ہو یا ایسا قرض جس کے واپس ملنے کی کوئی امید نہ ہو۔ یا مال دریا میں گر گیا ہو یا مال صحرا میں دفن کیا گیا اور دفن کی جگہ بھول گیا ہو تو ان صورتوں میں اصحاب اموال شرعاً معذور قرار پائیں گے اور قبضہ سے پہلے ان اموال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

رہی وہ رکاوٹ جو خود صاحب مال کی طرف سے ہو تو عدم افزائش کے معاملے میں شریعت نے اس عذر کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے۔ اور رکاوٹ کے اسباب کی تفصیلات میں گئے بغیر اس پر زکوٰۃ واجب قرار دی گئی ہے، کیونکہ ایک مسلمان پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے مال کو نفع بخش

---

[۱] فتح القدیر ج ۲ ص ۱۱۳

بنانے کی کوشش کرے اور ہر جائز ذریعہ سے اس میں اضافہ کی کوشش کرے[1]

۳ــــ تیسری شرط ــ حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال کا "حاجت اصلیہ" سے فارغ ہونا ہے۔ اگر کسی شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہے اور اسے اس مال پر "ملک تام" بھی حاصل ہے اور وہ مال نامی بھی ہے، مگر وہ مال اس کی حاجت اصلیہ میں مشغول ہے، تو شرعاً اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مال کے حاجت اصلیہ سے فارغ ہونے کو وجوب زکوٰۃ کی شرط اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس کے بغیر غنا (مالداری) اور نعمت کا تحقق ہی نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ جو شخص ضروریات اصلیہ کا محتاج ہوتا ہے اسے عرفاً مالدار ہی نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اور نہ وہ شخص برضا ورغبت زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔ علامہ کاسانی نے اس کے شرط ہونے کی حکمت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

> "مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا اس لئے ضروری ہے کہ غنا درحقیقت اسی صورت میں پایا جاتا ہے، کیوں کہ جو شخص ضروریات اصلیہ کا محتاج ہوگا وہ غنی نہیں کہا جاسکتا، اور نہ اس صورت میں تنعم کا مفہوم پایا جاتا ہے جس کے شکر کے طور پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے، اور نہ ہی اس صورت میں برضا ورغبت زکوٰۃ ادا کرسکتا ہے۔ حالاں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش دلی اور برضا ورغبت اپنے اموال کی زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے۔"[2]

فقہاء کی اصطلاح میں حقیقتاً حاجت اصلیہ میں وہ چیزیں داخل ہیں جن کا انسان اپنی بقا و تحفظ کے لئے محتاج ہو، مثلاً اشیاء خورد و نوش، ہر موسم کے لحاظ سے لباس، رہائشی مکان، فرنیچر، اہل علم کے لئے علمی وفنی کتابیں، اہل حرفت کے لئے آلات حرفت، اور وہ ساری چیزیں حاجت اصلیہ کے دائرہ میں آتی ہیں جنھیں عرفاً ضروریات زندگی سمجھا جاتا ہے۔ علامہ ابن نجیم اور ابن عابدین شامی نے ابن الملک کے حوالہ سے حاجت اصلیہ کی یہ تعریف کی ہے:

---

[1] فقہ الزکاۃ ج ا ص ۱۳۳   [2] بدائع ج ۲ ص ۱۱

"بما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج لدفع الحر أو البرد أو تقديراً كالدين فان المديون محتاج الى قضائه بما فى يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك"۔ [1]

"حاجت اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کردیں، تحقیقاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلات حرب، گرمی اور سردی سے تحفظ دینے والے کپڑے، یا تقدیراً جیسے قرض کیوں کہ قرضدار ضرورت محسوس کرتا ہے کہ اپنے کو قید سے بچانے کے لئے جو ہلاکت کے مترادف ہے نصاب کے مال میں سے قرض ادا کرے۔ اسی طرح آلات حرفت گھریلو سامان، سواری کے جانور اور اہل علم کے لئے علمی و فنی کتابیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک جہالت بھی ہلاکت ہی کے مثل ہے:

حاجت اصلیہ کا مفہوم زمان ومکان کے تغیر سے بدلتا رہے گا

حاجت اصلیہ کا تعلق دراصل انسان کی شخصی اور انفرادی ضروریات سے ہے، جس میں زمان ومکان، عرف وتعامل اور ماحول کے لحاظ سے تبدیلی عین فطرت ہے۔ حالات زمانے اور مکان وماحول کے تغیر سے انسان کی بنیادی حاجتیں بھی بدلتی رہتی ہیں اس لئے حاجت اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین کرنا مشکل ہے۔ اسے متبلی بہ کے حالات پر چھوڑ دینا چاہئے۔

حاجت اصلیہ کی تعریف سے بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کا دائرہ بہت ہی مختصر، محدود اور تنگ ہے۔ اور اس کے اندر صرف وہی چیزیں داخل ہیں، جو انسان کو ہلاکت سے یقینی طور پر بچاتی ہیں۔ مگر حاجت اصلیہ کے ذیل میں جن چیزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان پر نظر ڈالنے سے محسوس ہوتا ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ کافی حد تک وسیع اور تمام ہی ضروریات زندگی کو شامل ہے۔ فقہاء کرام نے جس طرح ہلاکت جسمانی کا لحاظ کرکے اس سے تحفظ دینے والی اشیاء کو اس کے دائرہ میں شمار کیا ہے۔

---

[1] شامی ج ۲ ص [illegible]، بحر ج ۲ ص [illegible]

اسی طرح انھوں نے ہلاکت معنوی اور روحانی کو بھی اعتبار کیا ہے۔ اور اس سے بچانے والی چیزوں کو "حاجت اصلیہ" کا عنوان دیا ہے۔ چنانچہ اہل علم کے لئے اس کے موضوع سے متعلق علمی و فنی کتابوں کو حاجت اصلیہ" کا درجہ دیتے ہوئے اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ جہالت ان کے لئے ہلاکت و تباہی کے درجہ میں ہے۔ "فان الجهل عندهم كالهلاك"[1]

علامہ کاسانی نے حاجت اصلیہ کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس کی انسان کو اپنی بقاء و تحفظ کے لئے ضرورت پڑتی ہے:

"لانه من ضرورات حاجة البقاء وقيام البدن"[2]

غور کیا جائے فقہاء نے حاجت اصلیہ کے ذیل میں رہائشی مکانات، سردی اور گرمی سے تحفظ دینے والے لباس پیشہ ورانہ آلات، اور آلات حرب وغیرہ کو شمار کیا ہے۔ جن کا تعلق شخصی ضروریات وحاجات سے ہے جن میں زمان و مکان اور حالات کے تغیر سے تبدیلی ممکن ہے۔ اس لئے حاجت اصلیہ کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ حاجت اصلیہ اور اس کے حدود کی تعیین نہیں کی جاسکتی ہے۔ بلکہ حالات و زمانہ اور عرف و ماحول کی تبدیلی سے اس میں تبدیلی ہوتی رہے گی۔ لباس و پوشاک کا معیار زمانہ اور مسلک و تمدن کے لحاظ سے بدلے گا۔ سواری میں فرق آئے گا، کھانے پینے کی اشیاء میں تبدیلی ہوگی، رہائشی مکانات ور گھریلو سامان میں فرق ہوگا اور یہ چیزیں حاجت اصلیہ کے زمرہ میں آئیں گی۔ البتہ اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ حضرات فقہاء کرام نے حاجت اور تحسین و زینت کے درمیان جو فرق کیا ہے اسے ملحوظ رکھا جائے۔ اور جو چیزیں تحسین و زینت کے دائرہ میں آتی ہیں انہیں حاجت کے دائرہ میں نہیں رکھا جائے۔

واضح رہے کہ حاجت اصلیہ سے مراد مکلف بالزکوٰۃ کی، اس کے اہل و عیال اور ان افراد کی حاجت اصلیہ ہے جن کا نفقہ شرعاً اس پر واجب ہوتا ہے جیسے بیوی بچے۔

"والمعتبر هنا الحاجات الاصلية للمكلف بالزكاة ومن يعوله من الزوجة والاولاد"[3]

---

[1] شامی ج ۲ ص [illegible] [2] بدائع ج ۲ ص [illegible]

[3] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص [illegible]

۴ــــ چوتھی شرط ــــ دین سے محفوظ ہونا

وجوب زکوۃ کی چوتھی شرط مال کا دین سے محفوظ ہونا ہے۔ اگر کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہو مگر وہ مقروض ہو اور قرض کی ادائیگی کے بعد صاحب نصاب نہ رہتا ہو تو اس پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کے پاس پچاس ہزار کی مالیت ہے مگر وہ چالیس ہزار کا مقروض ہے تو اس شخص پر صرف دس ہزار جو فارغ عن الدین ہے۔ اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

کون سا دین مانع زکوۃ ہے

دین کی بحث کے ذیل میں یہ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

۱ــــ کن اموال میں دیون مانع زکوۃ ہیں۔

۲ــــ کس قسم کے دیون مانع زکوۃ ہیں۔

۳ــــ دیون کی اقسام

۴ــــ طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوۃ میں مانع ہیں یا نہیں؟

اب ہم ان پر ترتیب وار گفتگو کرتے ہیں۔

۱ــــ کن اموال میں دیون مانع زکوۃ ہیں

جمہور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ دین اموال باطنہ (سونا، چاندی اور سامان تجارت) میں مانع زکوۃ ہے یعنی دین کی مقدار مال منہا کرنے کے بعد بقیہ مال میں زکوۃ واجب ہوگی۔ عطاء، سلیمان بن یسار، حسن، نخعی، لیث، مالک، سفیان ثوری، اوزاعی، احمد، اسحاق، ابو ثور، امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کی بھی رائے ہے۔ امام مالک کے استاذ ربیعۃ الرای حماد بن سلمان اور امام شافعی کا قول جدید اس کے خلاف ہے۔

اموال ظاہرہ (حیوانات اور کھیتوں) کے بارے میں بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ اس میں دین مانع زکوۃ نہیں ہے۔ امام مالک، اوزاعی، شافعی اور امام احمد کی ایک روایت اسی کے مطابق ہے۔[۱]

---

[۱] المغنی ج ۳ ص ۴۲-۴۳

ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ سوائے کھیتی اور پھل کے تمام ہی اموال میں دین مانع زکوٰۃ ہے۔[1]

۲-۳ - کس قسم کے دیون مانع زکوٰۃ ہیں

دیون کی قسمیں: حنفیہ کے نزدیک دیون کی تین قسمیں۔

۱۔۔۔۔ وہ دیون جن کا تعلق خالص بندوں سے ہو۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں:

(الف) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو جیسے قرض اور سامان تجارت کی قیمت..... اجرت وغیرہ۔

(ب) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔ جیسے وہ مال حرام جس کے مالک کا پتہ نہ ہو۔

۲۔۔۔۔ وہ دیون جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہو۔ ان کی بھی دو صورتیں ہیں:

(الف) بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا ہو۔ جیسے زکوٰۃ، عشر اور خراج۔ گو یہ چیزیں حق اللہ کے قبیل سے ہیں، مگر بندوں کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اموال ظاہرہ، مویشی اور زرعی پیداوار میں امام وقت کی طرف سے اس کا مطالبہ ہوتا ہے اور اموال باطنہ سونا چاندی اور سامان تجارت میں بھی امام یا اس کے نائب کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ بندوں کی طرف سے اس کا کوئی مطالبہ کرنے والا نہ ہو، جیسے دیون، نذور و کفارات۔ ان دیون میں سے دین عبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی موجود ہو وہ وجوب زکوٰۃ کے باب میں مانع ہے اور صرف اس صورت میں زکوٰۃ واجب ہوگی جب کہ دین کی مقدار مالیت نکالنے کے بعد باقی ماندہ مالیت بقدر نصاب ہو جائے۔

دین عبد کی وہ قسم جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہ ہوتا ہو، جیسے مال حرام، صحیح قول کے مطابق وہ بھی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوگا۔

وہ دین جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتا ہے۔ اس میں صرف وہ دین وجوب زکوٰۃ اور وجوب

---

[1] المغنی ج ۳ ص ۴۲-۴۳

صدقۃ الفطر میں مانع ہوگا جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ مگر یہ دین بھی عشر خراج کے وجوب میں مانع نہیں ہوگا۔ بحر میں ہے:

"لان الدین لا یمنع وجوب العشر والخراج ویمنع صدقۃ الفطر" [1]

باقی وہ سارے دیون جن کا مطالبہ بندوں کی طرف سے نہیں ہوتا ہے جیسے دیون نذور کفارات تو وہ مانع نہیں ہوں گے۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

"وجوب زکوۃ کی ایک شرط مال کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ اور دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ اگر کسی کے ذمہ ایسا دین ہو تو وہ بقدر دین مانع زکوۃ ہوگا۔ چاہے وہ دین معجل ہو یا مؤجل۔ امام شافعی کے نزدیک دین چاہے جس قسم کا ہو وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہوگا۔ کاسانی نے دین کے مانع ہونے کی دلیل کے طور پر حضرت عثمان کا یہ قول پیش کیا ہے کہ انھوں نے رمضان المبارک میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا تھا:

"لوگو! تمہارے زکوۃ دینے کا مہینہ سایہ فگن ہوگیا ہے۔ پس جس شخص کے پاس مال ہو اور مقروض ہو تو وہ مقدار دین کو منہا کرنے کے بعد اپنے باقی مال کی زکوۃ ادا کرے گا۔"

بحر الرائق میں ہے:

"مراد وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندوں کی طرف سے ہوتا ہو۔ لہذا نذور و کفارہ کا دین وجوب زکوۃ میں مانع نہیں ہوگا۔" [2]

عورت کا مہر مانع وجوب زکوۃ ہے یا نہیں

یہ سوال کہ عورت کا دین مہر وجوب زکوۃ میں مانع ہوگا یا نہیں؟ یعنی جس طرح دوسرے دیون مانع وجوب ہیں مہر کی رقم بھی مانع ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہائے کے تین اقوال ملتے ہیں:

۱ــــ ایک قول یہ ہے کہ مطلقاً عورت کا مہر وجوب زکوۃ میں مانع ہے۔

۲ــــ دوسرا قول یہ ہے کہ مہر معجل مانع ہے، مؤجل مانع نہیں ہے۔

---

[1] بدائع ج ۲ ص ۶ [2] بحر ج ۲ ص ۲۱۸

۳ ـــــ تیسرا قول یہ ہے کہ اگر مہر کی ادائیگی کا فوری ارادہ ہو تو مانع ہے اور اگر ادائیگی کا ارادہ نہ ہو تو مانع نہیں ہے۔ علامہ شامی نے قہستانی کے حوالے سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

"زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ غیر مانع۔ اھ ۱؎

بحر الرائق میں ہے:

"وفی صدر الشریعۃ قید المہر المؤجل الی الطلاق او الموت وقیل المہر المؤجل لا یمنع

لانہ غیر مطالب بہ عادۃ بخلاف المعجل وقیل ان کان الزوج علی عزم الاداء منع

والا فلا لانہ لا یعد دینا۔ اھ ۲؎

مولانا اشرف علی تھانوی نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ ۳؎

پس حاصل یہ ہے کہ اگر بیوی کا مہر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ ہو تو اس صورت میں عورت کا مہر وجوب زکوۃ میں مانع ہوگا، اس کی ادائیگی کے بعد اگر مال بقدر نصاب رہ جائے تو اس پر وجوب زکوۃ ہوگا۔ اور اگر فوری طور پر ادا کرنے کا ارادہ نہ ہو تو پھر مہر مانع وجوب زکوۃ نہیں ہوگا اور اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

طویل الاجل ترقیاتی قرضے وجوب زکوۃ میں مانع ہیں یا نہیں؟

دیون کی بحث کے ذیل میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے دور میں زراعتی قرضے، تعمیر مکان کے لئے قرض اور اس قسم کے مختلف ترقیاتی قرضے سرکار اپنے شہریوں کو دیتی ہے جن کی ادائیگی کے لئے ۲۰ سال سے لے کر ۴۰ سال کی طویل مدت مقرر کی جاتی ہے، اس مدت کے دوران قسطوار قرض کی ادائیگی ضروری ہوتی ہے، اس قرض کی مقدار بھی عموماً بہت بڑی ہوتی ہے، مثلاً زید نے اپنے کسی تجارتی کاروبار کے لئے ۵ کروڑ روپے قرض لئے جسے پچاس قسطوں میں ادا کرنا ہے یعنی سالانہ دس لاکھ روپے ادا کرنا ہے، یا کسی شخص نے ٹریکٹر کی خریداری کے لئے ایک لاکھ روپے قرض لیا جسے دس سال میں دس ہزار سالانہ کے حساب سے ادا کرنا ہے۔ ان صورتوں میں وجوب زکوۃ کے لئے اموال زکوۃ میں پورے قرض کو منہا کیا جائے گا یا صرف واجب الاداء قسط منہا کرکے باقی اموال پر زکوۃ واجب قرار دی جائے گی؟

۱؎ شامی ج ۲ ص ۔ ۲؎ البحر الرائق ج ۲ ۳؎ امداد الفتاوی ج ۲

اس سلسلہ میں اگرچہ موجودہ علماء یہی تحریر فرماتے ہیں کہ دین معجل ہو یا مؤجل، دونوں ہی وجوب زکوٰۃ میں مانع ہوں گے۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

"فكذا يمنع وجوب الزكاة بقدره حالا كان او مؤجلا"[1]

تاہم بعض مشائخ کی رائے یہ ہے کہ دین مؤجل وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہوگا۔ خود کاسانی نے بعض مشائخ سے یہ نقل کیا ہے:

"وقال بعض مشائخنا ان المؤجل لا يمنع لانه غير مطالب به عادة"

شامی نے شرح الطحاوی کے حوالے سے امام ابوحنیفہ سے نقل کیا ہے کہ امام صاحب ایسے دین کو مانع زکوٰۃ قرار نہیں دیتے تھے۔ شامی ہی نے قہستانی کے حوالے سے یہ بات نقل کی ہے کہ صحیح یہ ہے کہ ایسا دین وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔[2]

فتاوی تاتارخانیہ میں صدر الائمہ السرخکی کے حوالے سے ان کے بعض مشائخ کے بارے میں نقل کیا ہے کہ ان حضرات کے نزدیک دین مؤجل وجوب زکوٰۃ میں مانع نہیں ہے۔

"ذكر صدر الائمة السرخكي عن مشائخه انه لا يمنع"[3]

ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال یہ ہے کہ اس قسم کے طویل الاجل ترقیاتی قرضوں میں صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع کرکے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

کمپنیوں کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ کا حکم

زکوٰۃ کے ذیل میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کسی بھی کمپنی میں متعدد شرکاء اور حصہ دار ہوتے ہیں جو اپنے حصہ کے بقدر مالیت کے مالک ہوتے ہیں۔ بعض صورتیں ایسی ممکن ہیں کہ کمپنی کا مجموعی اثاثہ اور مالیت نصاب زکوٰۃ سے زائد ہو مگر شرکاء کے حصص کو علیحدہ کرنے کی صورت میں کوئی بھی صاحب نصاب نہ ہوتا ہو یا بعض صاحب نصاب ہوں تو اس صورت میں زکوٰۃ کا وجوب کمپنی کی مجموعی مالیت کے لحاظ سے ہوگا یا ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا؟ اس سلسلہ میں حکم شرعی یہ ہے کہ کمپنی کی مجموعی مالیت اور اس کے

---

[1] بدائع ج ۲ ص ۶ [2] شامی ج ۲ ص [illegible] [3] فتاوی تاتارخانیہ ج ۲ ص [illegible]

اثاثے میں وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا بلکہ کمپنی کے شرکاء کی انفرادی حالت کا اعتبار ہوگا۔ اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت ہوگی جس کے ملانے سے وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہو تو صرف اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ مثلاً کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ ہے جو بلاشبہ نصاب شرعی سے کافی زائد مالیت ہے۔ کمپنی کے شرکاء کی تعداد ایک لاکھ ہے تو وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت ایک کروڑ کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر شریک کی انفرادی حیثیت کو دیکھا جائے گا اور جس شریک کا حصہ بقدر نصاب ہوگا یا اس کے پاس دوسری مالیت پہلے سے موجود ہو جس کو ملانے سے وہ صاحب نصاب ہو جاتا ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور جس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہوگا اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر سائمہ جانور، دو یا دو سے زائد افراد کے مابین مشترک ہو یا سامان تجارت تو وجوب زکوٰۃ میں شرکاء کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ ہر شریک کی انفرادی حالت معتبر ہوگی امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر ان کے درمیان معاملہ شرکت درست اور صحیح ہوگا تو پھر زکوٰۃ کا وجوب "مجموعی مالیت" پر ہوگا۔ فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

"قال اصحابنا واذا كان النصاب بين خليطين لا تجب فيه الزكاة وقال الشافعي تجب عند وجود شرائط الخلط ...... ولو كانت السوائم بين اثنين فبلغ نصيب واحد نصابا دون الآخر تجب عليه دون صاحبه ولو لم يبلغ نصيب كل واحد نصابا لا يجب شئ وفي شرح الطحاوي فان كان نصيب كل واحد منهما على الانفراد يبلغ نصابا كاملا تجب الزكاة والا فلا "۔[1]

درمختار میں ہے:

"ولا تجب الزكاة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة فيه"۔[2]

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ: جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ شرعاً منصوص ہیں، اموال زکوٰۃ

[1] فتاویٰ تاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۹۸-۲۹۹

[2] درمختار علی هامش الشامی ج ۲ ص ۳۰۰

قیاسی نہیں ہیں۔ لہٰذا قیاس و ظن کے ذریعہ کسی ایسی چیز پر زکوٰۃ واجب قرار نہیں دی جا سکتی جس پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ معدنیات میں سے صرف سونے اور چاندی پر زکوٰۃ واجب کی گئی ہے۔ باقی معدنیات چاہے جتنی بھی قیمتی اور مالیت رکھنے والی ہوں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں کی گئی ہے۔ لہٰذا ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی چاہے جتنی بھی مالیت کے ہیرے، جواہرات اپنے پاس محفوظ کئے جائیں یا زیورات کی شکل میں محفوظ کئے جائیں ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ اگر کوئی شخص ہیرے اور جواہرات کی تجارت شروع کر دے تو پھر ان کا حکم سامانِ تجارت کا ہوگا اور سامانِ تجارت کی حیثیت سے ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ در مختار میں ہے:

"لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفًا اتفاقًا الا ان تکون للتجارۃ والاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارۃ بشرط عدم المانع"[1]

فتاویٰ تاتارخانیہ میں ہے:

"ولیس فیما یشتری للتجمل والزینۃ من خادم ومتاع ولؤلؤ وجوھر وملبس للنفقۃ شئ خزانۃ الفقہ ولیس فی الیواقیت وفی المضمرات ولو کان حلیًا الا ان تکون للتجارۃ"[2]

اموال تجارت میں کس نرخ کا اعتبار ہوگا

مال تجارت کی زکوٰۃ میں قوت خرید کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ سامانِ تجارت کی موجودہ قیمت و مالیت معتبر ہوگی اور اسی لحاظ سے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس سلسلہ میں علماء احناف کے درمیان اختلاف ہے کہ کس دن کی قیمت معتبر ہوگی۔ حضرت امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ جس دن اس مال پر سال گزرا اور اس پر زکوٰۃ کی ادائیگی واجب ہوئی اس دن اس سامان کی جو قیمت و مالیت رہی ہوگی اسی کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ امام ابویوسف اور امام محمد کے نزدیک جس دن زکوٰۃ ادا کی جائیگی

---

[1] در مختار علی ہامش الشامی ج ۲ ص ۲۷۳ [2] تاتارخانیہ ج ۲ ص ۲۲۳

اس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ علامہ کاسانی نے لکھا ہے:

"ولو اراد ان یؤدی القیمة جاز عندنا خلافاً للشافعی لکن عند ابی حنیفة فی الزیادة والنقصان جمیعاً ان یؤدی قیمتها یوم الحول ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وعندهما فی الفصلین جمیعاً یؤدی قیمتها یوم الاداء"۱

فتاوی ہندیہ میں ہے:

"وان ادی من قیمته یعتبر یوم الوجوب وهو تمام الحول عند الامام وقالا یوم الاداء لمصرفها"۲

فتاوی تاتارخانیہ میں ہے:

"وان ادی من القیمة ادی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمتها یوم حولان الحول الذی هو یوم الوجوب عند ابی حنیفة وعندهما یؤدی قیمتها یوم الاداء"۳

زکوۃ کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ جس مال میں زکوۃ واجب ہوتی ہے اسی مال سے زکوۃ بھی ادا کی جائے مگر فقہاء کرام نے شریعت کی دی ہوئی رخصتوں کے پیش نظر یہ کہا ہے کہ اصل سامان کے بجائے اگر اس کی قیمت ادا کر دی جائے تو بھی زکوۃ ادا ہو جائے گی۔ اس لئے کہ قیمت اصل کا بدل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے صاحبین کا مسلک زیادہ راجح اور قابل عمل معلوم ہوتا ہے کہ جس دن زکوۃ ادا کی جا رہی ہے، اس دن کی قیمت کا اعتبار کیا جائے۔ کیوں کہ وہی قیمت اصل کا بدل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ تھوک کے بھاؤ کا اعتبار ہوگا یا چلفر فروختگی کا۔ تو ظاہر ہے کہ اگر تھوک کے حساب سے مال فروخت کیا جاتا ہے تو تھوک کے بھاؤ کا لحاظ ہوگا۔ اور اگر چلفر فروخت کیا جاتا ہے تو چلفر فروختگی کا اعتبار ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص دونوں طرح سے فروخت کرتا ہو تو پھر انفع للفقراء، کے اصول کے پیش نظر چلفر فروختگی کے لحاظ سے ادا کرے۔ ہدایہ میں ہے:

"یقومها بما هو انفع للمساکین احتیاطاً لحق الفقراء"۴

---

۱ بدائع ج ۲ ص [illegible] ۲ فتاوی ہندیہ ج ۱ ص [illegible]

۳ تاتارخانیہ ج ۲ ص [illegible] ۴ ہدایہ علی ہامش الفتح ج ۲ ص [illegible]

اگر اراضی کی خرید و فروخت تجارتی کاروبار کے نقطۂ نظر سے کی جائے تو وہ سامان تجارت ہونے کی وجہ سے اموال تجارت میں شامل ہیں اور سال پورا ہونے پر نقد رقم کے علاوہ جو اراضی ان کی ملکیت میں ہیں ان کی موجودہ معروف قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ وجوب زکوٰۃ میں اراضی کی موجودہ قیمت کا اعتبار ہوگا۔ آئندہ متوقع قیمت فروخت کا اعتبار نہیں ہوگا۔

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

شیئرز چونکہ ایک تجارتی اثاثہ اور سرمایہ ہیں، لہٰذا شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ شیئرز کی زکوٰۃ میں تفصیل یہ ہے:

"جو کمپنی تجارت کرتی ہے اور خود سامان تیار کر کے فروخت کرتی ہے جیسے ریشم اور کپڑے کے کارخانے تو اس صورت میں کمپنی کی مالیت کی حیثیت سامان تجارت کی ہوگی اور راس المال اور اس کے منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ آلات حرفت اور ضروری اشیاء کی مالیت اس سے مستثنیٰ ہوگی۔ اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے صرف کرایہ وصول کرتی ہے مکان، دکانات، دکانات دیتی ہے تو ایسی کمپنی کے صرف منافع پر وجوب زکوٰۃ ہوگا۔"

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

"شیئرز پر زکوٰۃ ہے۔ شیئرز جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسے کہ ریشم اور کپڑے کے کارخانے یعنی خام سامان خرید کر تجارت کرنے والے کارخانے اور کمپنی وغیرہ تو اصل رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور جو کمپنی تجارت نہیں کرتی ہے محض کرایہ وصول کرتی ہے تو زکوٰۃ نفع پر واجب ہے۔ اصل رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔"[1]

یوسف القرضاوی نے شیئرز کی زکوٰۃ کے بارے میں لکھا ہے:

"جن اداروں یعنی کمپنیوں کا سرمایہ مشینوں اور عمارتوں وغیرہ میں لگا رہتا ہے جیسے پریس، فیکٹریاں، کرایہ پر چلنے والی موٹریں، تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے نہیں بلکہ ان کی خالص آمدنی سے

---

[1] فتاویٰ رحیمیہ ج ۲ ص ۱۰

منافع سے لی جائے گی۔ ایسی تجارتی کمپنیاں جن کا بیشتر سرمایہ منقولات میں لگا رہتا ہے اور جن کی تجارت کی جاتی ہے اور جو اصلاً باقی نہیں رہتیں تو ان کی زکوٰۃ ان کے حصص سے بازار کی قیمت کے مطابق وصول کی جائے گی۔ اس قیمت میں منافع کو شامل کر کے اور غیر منقولہ سامان کی قیمت کو حصص میں سے وضع کر کے اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا پڑے گا۔[۱]

واضح رہے کہ شیئرز کی مالیت کا تعین ان کی بنیادی قیمت و مالیت کو سامنے رکھ کر نہیں کیا جائے گا بلکہ بوقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس کا جو نرخ اور مالیت ہوگی اس کا اعتبار کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈز کی زکوٰۃ

بونڈز (BONDS) درحقیقت بنک، کمپنی یا حکومت کے قرض دار ہونے کا وثیقہ اور تمسک ہے جن کا حامل متعینہ رقم مع منافع پانے کا حقدار ہوتا ہے۔ گویا بونڈ کا مالک دین مؤجل کا مالک ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دین قوی کے قبیل سے ہے۔ اس لئے کیش کرانے کے بعد تمام گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

محور ثانی — نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی کے نصاب میں سے کسے معیار قرار دیا جائے

یہ حقیقت ہے کہ شریعت اسلامی نے سونے اور چاندی کو مستقل نصاب کی حیثیت سے تسلیم کیا ہے اور دونوں ہی اپنی جگہ پر اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر اس وقت سونے اور چاندی کے نرخ میں غیر معمولی تفاوت اور فرق پیدا ہو جانے کی وجہ سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اموال تجارت میں نصاب وجوب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے یا سونے کے نصاب سے؟ اسی طرح نصاب حرمت زکوٰۃ (غنا یعنی کسی شخص کو غنی قرار دے کر اس کے لئے زکوٰۃ لینا ممنوع قرار دیا جائے) کا معیار کسے قرار دیا جائے؟

---

[۱] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۵۲۸

اس سلسلہ میں علماء کے خیالات ورجحانات مختلف ہیں کہ وجوب زکوۃ کے لئے دونوں میں سے کسے اصل اور معیار قرار دیا جائے۔ علامہ یوسف القرضاوی کا رجحان اس طرف ہے کہ سونے کو معیار قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔ مگر خود قرضاوی نے علماء معاصرین کے بارے میں لکھا ہے کہ ان کی اکثریت چاندی کو معیار قرار دیتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"البتہ اس وقت ہمیں اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم نقدین سونے چاندی میں سے کس کے ذریعہ نصاب شرعی کی تحدید وتعیین کریں گے یعنی غنا کی وہ آخری حد کیا ہوگی جس پر وجوب زکوۃ کا حکم ہوگا۔ اس گفتگو کی ضرورت اس بنا پر پڑی کہ شارع نے سونے چاندی کو علیحدہ علیحدہ نصاب مقرر کیا تھا۔ ایک کا نصاب دوسرے کے مخالف تھا تو کیا ہم چاندی کو وجوب زکوۃ کا معیار قرار دیں گے۔ بہت سے علماء معاصرین کا اسی طرف میلان ہے اور اس میلان کی دو وجہ ہے:

۱۔ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے۔ اس کا ثبوت احادیث صحیحہ مشہورہ سے ہے۔

۲۔ چاندی کو معیار قرار دینے اور اس کے ذریعہ تقدیر کی صورت میں فقراء کا زیادہ فائدہ ہے کیوں کہ چاندی کو معیار قرار دینے کی صورت میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر زکوۃ واجب ہوگی"[1]

راقم الحروف کا بھی اسی طرف رجحان ہے کہ وجوب زکوۃ کے لئے نصاب چاندی کو معیار قرار دیا جائے۔ لہذا اس دور میں اگر کسی کے پاس سامان تجارت یا کوئی دوسری مالیت نصاب چاندی کے بقدر ہو تو اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اور وہ غنی قرار پائے گا۔ اس کے لئے زکوۃ لینا حرام ہوگا۔ زکوۃ کے باب میں ہمیشہ فقراء ومساکین کی منفعت کے پہلو کو پیش نظر رکھنا چاہئے کیوں کہ زکوۃ کی مشروعیت ہی فقراء کو نفع پہنچانے کے لئے ہوتی ہے۔

محور ثالث ——— مصارف زکوۃ

اہل مدارس کے لئے ایک آسان راہ

اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے کہ ایک طالب علم جو مستحق زکوۃ ہے ادارہ اس کے قیام

---

[1] فقہ الزکاۃ ۱؍۲۶

و طعام تعلیم اور دوسری ضروریات کے انتظام پر ہونے والے اخراجات بابت ماہ مثلاً فلاں سو روپے کا چیک اس کے حوالے کرے۔ چیک پر طالب علم کا قبضہ اصل رقم پر قبضہ تصور کیا جائے گا اور اس طرح سے وہ اس رقم کا مالک ہو جانے کے بعد جب وہ چیک مدرسہ کو واپس کرے گا تو مدرسہ والے کو اس رقم کو مدرسین کی تنخواہ اور تعمیرات میں خرچ کرنے کی گنجائش ہوگی۔ مدارس اسلامیہ کے ذمہ داران کے لئے یہ آسان اور قابل عمل طریقہ ہے۔ اس پر عمل کرنے سے بہت ساری پریشانیوں سے حفاظت ہوگی۔

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندہ کا وکیل اور طلبہ کا نائب ہے

مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندہ کا وکیل ہے کیوں کہ معطی نے اسی کو زکوٰۃ صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اسے وکیل بنایا ہے۔ اس لئے قبضہ مہتمم من کل الوجوہ قبضہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہوگا اور تملیک طلبہ اور تملیک مستحق زکوٰۃ ضروری ہوگی۔ اور محض مہتمم مدرسہ کو زکوٰۃ دے دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ نیز مہتمم مدرسہ طلبہ کا بھی نائب ہے۔ واضح رہے کہ طلبہ کے نائب ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جہاں چاہے زکوٰۃ کی رقم صرف کرے بلکہ وہ جس کا نائب ہے اور جس کی نیابت کے طور پر اس نے زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی رقوم وصول کی ہے اس پر صرف کرنا متعین ہے۔ اگر وہ غیر مصرف میں اسے صرف کر دیتا ہے تو زکوٰۃ دہندہ کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس مسئلہ میں لکھا ہے:

> "مہتمم مدرسہ کا قسم نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے۔ جیسا امیر نائب جملہ عامہ کا ہوتا ہے۔ پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے۔ اس کے قبضہ سے ملک معطی سے نکل اور ملک طلبہ کا ہوگیا اگرچہ وہ مجہول الکمیہ والذوات ہوں مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے"[1]

کمیشن پر زکوٰۃ : مدارس اسلامیہ کے سفراء و محصلین عاملین زکوٰۃ کے حکم میں آتے ہیں جن کا مستحق زکوٰۃ ہونا نص قرآنی سے ثابت ہے کیوں کہ عامل زکوٰۃ جو مصرف زکوٰۃ ہے وہ شخص ہے جسے امیر المسلمین نے لوگوں کی زکوٰۃ اور دیگر صدقات واجبہ کی تحصیل کے لئے مامور کیا ہو۔ عنایہ شرح ہدایہ میں ہے :

[1] فتاویٰ رشیدیہ

"العامل هو الذی یبعثہ الامام لجبایۃ الصدقات"[1]

الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں ہے کہ عامل زکوٰۃ صرف اس صورت میں زکوٰۃ لینے کا مستحق ہوگا جب کہ امام وقت نے زکوٰۃ کی وصولی پر اسے مامور کیا ہو "وانما یاخذ العامل منہا اذ اقرّتہا الامام"[2]

امام المسلمین کو تمام مسلمانوں پر ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے اور اس بنیاد پر اسے زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا شرعاً حق ملتا ہے اور زکوٰۃ کی وصولی کے لئے اس کا تعین کیا ہوا عملہ مستحق زکوٰۃ قرار پاتا ہے۔ مگر مدارس کے مہتمم کو ولایت عامہ حاصل نہیں ہوتی ہے اس لئے اس کے محصلین وسفراء کو عاملین زکوٰۃ کی حیثیت حاصل نہیں ہوگی۔

دوسری بات یہ ہے کہ عامل صدقات کو زکوٰۃ کی رقم بطور معاوضہ واجرت نہیں ملتی ہے بلکہ وہ اپنے اوقات کو امور مسلمین کے لئے فارغ کر دیتا ہے اور ہر وقت اس میں مشغول رہتا ہے اس لئے جزاء احتباس کے طور پر بقدر کفایت (جو اس کے اور اس کے اہل وعیال کے گذارے کے لئے کافی ہو) اسے مال زکوٰۃ میں سے دیا جاتا ہے۔ عنایہ میں ہے:

"فیعطیہ ما یسعہ ای یکفیہ...... لانہ فرغ نفسہ لہذا العمل وکل من فرغ نفسہ لعمل من امور المسلمین یستحق علی ذالک رزقاً کالقضاۃ والمقاتلۃ ولیس ذالک علی وجہ الاجارۃ لانہا لا تکون الا علی عمل معلوم اومدۃ معلومۃ واجرۃ معلومۃ"[3]

الاختیار لتعلیل المختار میں ہے:

"ولیس ذالک بالاجارۃ لانہ عمل غیر معلوم"[4]

مدارس کے سفراء کو زکوٰۃ کی رقم بطور اجرت ومعاوضہ دی جاتی ہے اور زکوٰۃ کی رقم کو اجرت ومعاوضہ کے طور پر دینا جائز نہیں ہے۔

---

[1] عنایہ علی ہامش الفتح ج ۲ ص ۲۰ [2] الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱ ص ۶۲۳

[3] عنایہ ج ۲ ص ۲۰ [4] الاختیار لتعلیل المختار ج ۱ ص ۱۱۹

کمیشن پر چندہ کرانے میں کئی طرح کی خرابیاں ہیں۔

۱۔۔۔۔۔ اس میں اجرت مجہول ہوتی ہے۔ عمل و مدت کی بھی تعیین نہیں ہوتی حالانکہ عقد اجارہ کی صحت کے لئے اجرت کی تعیین، عمل اور مدت کا معلوم ہونا ضروری ہے۔

۲۔۔۔۔۔ زکوٰۃ کی رقم کا زیادہ تر حصہ خود محصلین و سفراء پر خرچ ہو جاتا ہے جو مشروعیت زکوٰۃ کے خلاف ہے۔ زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کو نفع پہنچانے کے لئے ہوئی ہے اور اس صورت میں ان تک زکوٰۃ کی رقم کا بہت کم حصہ پہنچ پاتا ہے۔

۳۔۔۔۔۔ مدارس کے ذمہ داران کے لئے زکوٰۃ کی رقم کو اس کے مصرف میں صرف کرنا ضروری ہے اور جب تک وہ رقم اپنے مصرف میں صرف نہیں ہوگی زکوٰۃ دہندگان بری الذمہ نہیں ہوں گے۔ اس لئے ان وجوہات کی بنا پر کمیشن پر چندہ کرانا شرعاً ممنوع اور ناجائز ہے۔ البتہ اگر کمیشن کی رقم زکوٰۃ و صدقات واجبہ کے علاوہ غیر واجب التملیک رقم سے ادا کی جائے تو اس صورت میں صرف ایک خرابی لازم آئے گی اور وہ ہے اجرت کا مجہول ہونا جسے بعض مجبوریوں کے تحت گوارہ کیا جا سکتا ہے۔

ھذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب۔ ■■■

مسائل زکوٰۃ

از: مولانا مفتی محمد جنید عالم ندوی قاسمی ——— مفتی امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ پھلواری شریف پٹنہ

الحمد للہ رب العلمین ربہ نستعین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

اما بعد

زکوٰۃ ——— اسلام کے بنیادی ارکان میں سے تیسرا اہم ترین رکن ہے جس کی فرضیت نص قطعی سے ثابت ہے اور اس کا منکر کافر ہے قرآن واحادیث نبویہ میں اس کی ادائیگی کی بہت تاکید اور عدم ادائیگی پر بہت سخت وعیدیں بھی آئی ہیں اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنی کتاب مقدس قرآن عظیم میں اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ادائیگی زکوٰۃ کا متعدد جگہوں میں حکم دیا ہے زکوٰۃ کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ قبل کی شریعتوں میں بھی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ دینے کا حکم اور اس کی اہمیت کو واضح کیا گیا ہے۔

زکوٰۃ کی ادائیگی میں کمزوروں، پریشان حال لوگوں، یتیموں، بیواؤں اور عاجز ولاچار لوگوں کی اعانت ومدد ہے جو اسلام کا اہم ترین معاشرتی اور سماجی دشواریوں کے حل کا اصول وضابطہ اور بے مثال نظام حیات ہے اور اللہ رب العزت کی خوشنودی ورضا کے حصول کا سبب اور حکم خداوندی کی بجاآوری ہے۔ زکوٰۃ دینے سے گناہ دھلتے ہیں ایمانی اور روحانی قوت حاصل ہوتی ہے اخلاق وعادات میں جلا پیدا ہوتی ہے اور انسانی قلب وجگر عرفان الٰہی کی مقدس روشنی سے منور وروشن ہوتا ہے۔ لالچ، حرص، بغض وعداوت جیسے اخلاق رذیلہ سے انسان کو دور رکھتی ہے۔ اخوت وبھائی چارگی، ایثار وقربانی اور جود وسخا سے کریمانہ وصف اور خصائل حمیدہ پیدا ہوتے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے مال ودولت سے نواز کر جو فارغ البالی عطا کی ہے اس کا تقاضہ اور حق ہے کہ انسان اپنے رب کا شکر یہ ادا کرے۔ اللہ کی عنایت کردہ مال ودولت سے غرباء ومساکین کا حق ادا کرے جس کی عملی صورت ادائیگی زکوٰۃ اور فرضیت کی شکل میں یہ ذمہ صاحب مال پر ڈال دی گئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اللہ رب العزت نے اس حقیقت کو بھی واضح فرمادیا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے

اور صدقہ دینے سے اس میں کوئی کمی نہیں ہوتی ہے بلکہ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے اور اس قدر اضافہ ہوتا ہے کہ انسانی فکر ورگ اس کی گہرائیوں اور برکتوں کا تصور نہیں کر سکتی ہے اور وہ سوچ بھی نہیں سکتا ہے۔

اس لئے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ مسائل معلوم کر کے اپنے ان اموال کی جن پر زکوٰۃ فرض ہے پوری ایمانداری اور دیانت کے ساتھ زکوٰۃ کی ادائیگی کا اہتمام کر کے اللہ کے فرمان اور حکم کی بجاآوری کریں۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ تمام اموال میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے بلکہ خاص اصناف میں مخصوص شرائط کے ساتھ زکوٰۃ فرض ہے جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

اموالِ زکوٰۃ

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے وہ دو طرح کے ہیں:

(الف) اموال ظاہرہ

(ب) اموال باطنہ

اموال ظاہرہ درج ذیل ہیں:

۱۔۔۔ سائمہ جانور یعنی وہ جانور جو پورا سال، یا سال کا بیشتر حصہ چرنے پر اکتفا کرتے ہوں اور مالک کو ان کا چارہ دینا نہ پڑتا ہو۔ اس طرح سائمہ جانور جن پر زکوٰۃ فرض ہے وہ تین طرح کے ہیں:

(الف) ابل۔ اونٹ۔ اس میں ہر نوع کے اونٹ داخل ہیں

(ب) بقر۔ گائے، بیل، بھینس وغیرہ نر و مادہ

(ج) غنم۔ ضمی، بکری، دنبہ اور بھیڑ

۲۔۔۔ کھیت کی ہر طرح کی پیداوار خواہ غلے ہوں یا سبزیاں ہوں یا پھل۔ عشر یا نصف عشر واجب ہے یعنی اگر رہٹ اور پانی وغیرہ کے ذریعے سے فصل تیار ہوئی ہے تو بیسواں حصہ ورنہ دسواں حصہ واجب ہے۔

۳۔۔۔ اموال باطنہ میں نقود اور عروض التجارۃ آتے ہیں۔

نقود یعنی خواہ اثمان خلقیہ ہوں مثلاً سونا، چاندی یا اثمان عرفیہ یعنی مختلف ممالک کی کرنسیاں جو ثمن عرفی کی حیثیت سے رائج ہوں مثلاً ہندوستانی نوٹ یا سکے یا ریال پونڈ وغیرہ۔

اثمان خلقیہ خواہ سکے ہوں یا زیورات بنائے گئے ہوں۔ اور عروض التجارہ وہ سامان جو تجارت کی نیت سے خرید

بدائع الصنائع ج ۲ ص ۰۰۰

کر رکھا گیا ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے خواہ فی الحال تجارت ہوتی ہو یا نہ ہوتی ہو۔

"وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام"

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں ایک شرط ملک تام کی ہے۔ اگر کسی شی کا مالک متعین نہیں ہے تو اس شی پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ جیسے وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے جانوروں میں ملک نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے چوں کہ زکوٰۃ میں تملیک متعین شرط ہے اور غیر ملک میں تملیک متصور نہیں۔

اما الشرائط التی ترجع الی المال فمنها الملک فلا تجب الزکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک وھذا لان فی الزکوٰۃ تملیکا والتملیک فی غیر الملک لا یتصور [1]

ملک تام پر وجوب زکوٰۃ کی حکمت

ملک تام پر زکوٰۃ کیوں واجب ہے اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی تحریر فرماتے ہیں:

"ملکیت بڑی نعمت ہے کیونکہ یہ آزادی اور انسانیت کا نتیجہ اور ثمرہ ہے جس سے غلام اور جانور محروم ہوتے ہیں ملکیت سے آدمی کی قائدانہ حیثیت معلوم ہوتی ہے اور ملک تام کے ذریعہ انسان اپنے مال سے منتفع ہوتا ہے اور از خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کے بڑھانے پر قادر ہوتا ہے۔ اس عظیم نعمت کا شکریہ ادا کرنا انسان پر لازم ہے کہ جب اس کو یہ نعمت نصیب ہو تو وہ اس کی زکوٰۃ ادا کرے۔" [2]

ملک تام سے مراد ملک تام سے مراد ملک رقبہ اور ملک ید ہے۔ ملک رقبہ یہ ہے کہ اس شی پر مکمل ملکیت حاصل ہو اور ملک ید یہ ہے کہ وہ چیز اپنے قبضہ و تصرف میں ہو۔ اگر ملکیت حاصل نہیں ہے جیسا کہ غلام کو اپنے مال پر ملکیت حاصل نہیں ہے اس کا جو بھی مال ہے اس کے آقا کا ہے یا مدیون (جس پر قرض ہے) کے پاس جو مال ہے اس پر اس کا قبضہ تو ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے۔ یا ملکیت تو حاصل ہے لیکن قبضہ و تصرف میں نہیں ہے، یا اس سے انتفاع پر

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۹   [2] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۱

قدرت نہیں ہے۔ جیسا کہ مہر کی رقم ہے۔ قبضہ سے قبل ملکیت تو ہے لیکن قبضہ وتصرف میں نہیں۔ غرض یہ کہ ملکیت رقبہ یا ملکیت ید دونوں میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

(ومنها الملك التام) وهو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكوٰة كذا في السراج الوهاج۔ [1]

ملک تام کی مراد میں اختلاف

سیدنا حضرت امام اعظم ابو حنیفہؒ حضرت امام ابو یوسفؒ اور حضرت امام مالکؒ تو یہی فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک رقبہ اور ملک ید دونوں ضروری ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ حضرت امام زفرؒ اور حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید شرط نہیں ہے۔ اگر کسی شئی پر مکمل ملکیت ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ خواہ قبضہ وتصرف میں ہو یا نہ ہو۔

ومنها الملك المطلق وهو ان يكون مملوكا له رقبة ويدا وهذا قول اصحابنا الثلاثة وقال زفر اليد ليس بشرط وهو قول الشافعيؒ [2]

مال ضمار میں زکوٰۃ

چوں کہ امام زفرؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ملک ید وجوب زکوٰۃ کے لئے شرط نہیں ہے۔ اس لئے ان دونوں حضرات کے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ کے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ چوں کہ مال ضمار میں ملک رقبہ تو حاصل ہے لیکن ملک ید مفقود ہے۔

مال ضمار کی تفسیر

مال ضمار ہر وہ مال ہے جس پر اصل ملکیت تو قائم ہو لیکن انتفاع پر قدرت نہ ہو جیسا کہ بھاگا ہوا غلام، گم شدہ چیز، مال مفقود، سمندر میں ضائع شدہ مال۔ اسی طرح وہ مال جس کو کسی نے غصب کر لیا۔ اسی طرح وہ مال جو جنگل یا بہت پرانے مکان میں دفن کر دیا ہو اور جگہ یاد نہ ہو یہ سب مال ایسے ہیں کہ ملکیت تو قائم ہے لیکن انتفاع پر قدرت نہیں ہے [3]

---

[1] الفتاوی الهندیہ ج۱ کتاب الزکوٰۃ ص ۱۷۲ مطبوعہ مصر بیروت۔ [2] بدائع الصنائع کتاب الزکوٰۃ ج۲ ص ۸۰۸۔ [3] ۔۔۔ ج ۲ ص ۸۸

حضرت امام زفر اور حضرت امام شافعیؒ ان تمام روایات سے استدلال کرتے ہیں جو اس باب میں عام ہیں ان میں ملک رقبہ اور ملک ید کی کوئی تفصیل نہیں ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے اگر کسی مال کا مالک متعین ہے تو اس پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو جس کی دلیل مسافر کے مال پر وجوب زکوٰۃ ہے اگر مال گھر میں دفن کر دیا ہو اور جگہ یاد نہ ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اسی طرح قرض پر قبضہ سے پہلے زکوٰۃ واجب ہے باوجودیکہ ان تینوں صورتوں میں ملکیت تو ثابت ہے لیکن مال قبضہ و تصرف میں نہیں ہے ـــــــ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ مال کا وظیفہ ہے۔ لہٰذا مال ضمار میں زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ ملکیت ثابت ہے۔

فریق اول کی ایک دلیل تو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم لا زکوٰۃ فی مال الضمار ہے یعنی مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے ـــــــ دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ مال جس سے مالک انتفاع نہ کر سکتا ہو وہ مالک کے حق میں معدوم ہے اس کے ذریعے غنی اصحاب نصاب نہیں سمجھا جاتے تھے اور جو صاحب نصاب نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جہاں تک مسافر کے مال میں وجوب زکوٰۃ کا تعلق ہے تو چونکہ مسافر اپنے نائب کے ذریعہ اپنے مال میں انتفاع پر قدرت رکھتا ہے اور جو مال گھر میں مدفون ہے اس سے بھی انتفاع ممکن ہے کیونکہ گھر کو کھود کر مدفون کی جگہ معلوم کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح قرض سے بھی انتفاع ممکن ہے کہ دائن جب چاہے مدیون سے اپنے قرض کا مطالبہ کر سکتا ہے اس لئے ان تینوں صورتوں میں یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ملک ید نہیں ہے [1]

خلاصہ کلام یہ کہ حنفیہ کے نزدیک مفتی بہ قول کے مطابق وجوب زکوٰۃ کے لئے ملک ید اور ملک رقبہ دونوں ضروری ہے اگر ان میں سے کوئی ایک بھی مفقود ہو تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

جواب : سوال سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خرید و فروخت کا معاملہ مکمل ہو چکا ہے اور خریدار نے پیشگی قیمت بھی ادا کر دی ہے لیکن بائع (فروخت کرنے والے) نے ابھی تک مبیع خریدار کے حوالہ نہیں کیا ہے ایسی صورت میں پیشگی ثمن اور مبیع دونوں پر وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ زیر بحث ہے کہ ان دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر۔

<u>ثمن پر زکوٰۃ</u> : بیع مکمل ہو جانے کے بعد ثمن پر بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو ہر دو صورت بائع کو ثمن میں تصرف کا ثرث

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲، ص ۹ ـ ۱۰

اختیار ہوتا ہے۔ اور جب بائع کو ثمن میں تصرف کا شرعاً اختیار ہے تو بائع کے ذمہ ثمن پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ خواہ بائع کا قبضہ ہو یا نہ ہو کیونکہ وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جارہی ہے۔ (جاز التصرف فی الثمن) بهبة (وبیع وغیرهما لو عیناً) ای مشارا الیه (قبل قبضه) [1] نیز ثمن کی حیثیت دین قوی کی ہوتی ہے اور دین قوی پر دائن (قرض خواہ) کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں جب کہ ثمن بائع کے قبضہ و تصرف میں آچکا ہے تو بائع کے ذمہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

شبہ۔ یہاں پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ اگر بائع کے پاس مبیع ہلاک ہو جائے یا کسی دوسری وجہ سے بیع ختم کرنا پڑے تو بائع پر ثمن کی واپسی ضروری ہے۔ اور جب بیع فسخ ہو جانے کی صورت میں بائع پر ثمن کی واپسی ضروری ہے تو وہ اس ثمن کا مالک کہاں ہوا کہ اس پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگے۔

شبہ کا ازالہ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بائع تو اس ثمن کا مکمل مالک ہو گیا اور جہاں تک بیع کے فسخ ہونے کی صورت میں ثمن کی واپسی کا سوال ہے تو ثمن کی واپسی بائع کے ذمہ میں ہے عین ثمن کی واپسی ضروری نہیں ہے۔ ثمن کے مثل یا اس کے بقدر کوئی دوسری چیز بھی واپس کر سکتا ہے۔ اگر ثمن پر بائع کو ملکیت حاصل نہ ہوتی تو عین ثمن کی واپسی بائع پر ضروری ہوتی ـــــ اس کی نظیر اجارہ طویلہ میں چند سالوں کی پیشگی اجرت پر زکوٰۃ کی ہے یعنی کسی نے مکان یا دوکان ایک لمبی مدت کے لئے کرایہ لیا اور چند سالوں کا پیشگی کرایہ مالک مکان و دوکان کو ادا کر دیا تو اس پیشگی کرایہ کی رقم پر زکوٰۃ مالک مکان و دوکان کے ذمہ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ کرایہ کی رقم پر قبضہ کر لینے کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا، اور اگر بالفرض اجارہ فسخ کرنے کی صورت میں کرایہ کی رقم واپس بھی کرنی پڑے تو عین اسی رقم کی واپسی ضروری نہیں ہوگی، جو کرایہ میں دی تھی بلکہ اس کی واپسی ذمہ میں ہوگی۔ اس کے بقدر کوئی دوسری مالیت بھی واپس کر سکتا ہے۔

واما زكوة الاجرة المعجلة عن سنين فى الاجارة الطويلة التى يفعلها بعض الناس عقوداً و يشترطون الخيار ثلثة ايام فى رأس كل شهر فتجب على الآجر لانه ملكها بالقبض وعند الانفساخ لايجب عليه رد عين المقبوض بل قدره فكان كدين لحقه بعد الحول۔ [2]

---

[1] الدر المختار على هامش رد المحتار مطلب فى بيان الثمن والمبيع والدين۔ ج ۴ ص [illegible]

[2] شرح فتح القدير كتاب الزكوة مطبوعه مصر۔ ج ۱، ص [illegible]

مبیع پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ خرید و فروخت مکمل ہو چکی لیکن مبیع پر خریدار کا قبضہ نہیں ہوا تو مبیع پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو خریدار پر یا فروخت کرنے والے پر؟ اس کی تفصیل درج ذیل ہے

(الف) اصولاً اور شرعاً فروخت کرنے والے کے ذمہ مبیع کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ مبیع فروخت کرنے والے کی ملکیت سے نکل چکی ہے۔

(ب) البتہ خریدار کے ذمہ واجب ہے یا نہیں اس سلسلہ میں کتب فقہ کی عبارتیں مختلف نظر آتی ہیں ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ شرح فتح القدیر، درمختار، یوسف القرضاوی کی فقہ الزکوٰۃ کی عبارت اس سلسلہ میں صریح ہے کہ مشتری (خریدار) پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ خریدار کو قبضہ سے قبل مبیع پر ملک تام حاصل نہیں ہے کیونکہ خریدار قبضہ سے قبل مبیع میں کوئی تصرف نہیں کرسکتا ہے

شرح فتح القدیر میں ہے:

ویخرج ایضا المشتری للتجارة اذا لم یقبض حتی حال حول لازکوة فیه اذ لم یتفد ملك التصرف وکمال الملك بکونه مطلقا للتصرف وحقیقته مع کونه حاجزاً۔ [1]

فقہ الزکوٰۃ میں ہے:

ولهذا قالوا: لا تجب الزکوة علی المشتری فیما اشتراه للتجارة قبل القبض لعدم الید [2]

حضرت علامہ علاء الدین الحصکفی درمختار میں تحریر فرماتے ہیں:

ولا فیما اشتراه لتجارة قبل قبضه [3]

حضرت علامہ شامی اس سلسلہ میں مطمئن نظر نہیں آتے ہیں چنانچہ درمختار کی عبارت قبل قبضہ کے تحت لکھتے ہیں کہ:

"قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ تو قبضہ سے قبل

---

[1] شرح فتح القدیر۔ ج ۲ ص۱۲۲ [2] فقه الزکوة مطبوعه بیروت۔ ج ۱ ص۱۳۰

[3] الدر المختار علیٰ هامش رد المحتار: ج ۲ ص۔

ہی واجب ہوگی لیکن اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی (قولہ قبل قبضہ) اما بعدہ فیزکیہ

عما مضی کما نبہ فی البحر عن المحیط[1]

لیکن حضرت علامہ شامی نے فتاوی خانیہ کے حوالے سے جو جزئیہ نقل کیا ہے اور اس کی روشنی میں بحث جو اٹھائی ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔ ملاحظہ ہو شامی کی عبارت:

لکن فی الخانیۃ رجل لہ سائمۃ اشتراھا رجل للسیامۃ ولم یقبضھا حتی حال الحول ثم قبضھا لا زکوۃ علی المشتری فیما مضی لانھا کانت مضمونۃ علی البائع بالثمن الخ ومقتضی التعلیل عدم الفرق بین ما اشتراھا للسیامۃ او للتجارۃ فتامل[2]

لیکن خانیہ میں ہے کہ ایک شخص کے پاس سائمہ جانور (وہ جانور جو پورا سال یا سال کا بیشتر حصہ جنگل میں چرنے پر اکتفا کرتا ہو) ہے اور دوسرے شخص نے اس کو سائمہ بنانے کے لئے خریدا اور سال گزرنے کے بعد اس پر قبضہ کیا تو خریدار پر گذشتہ سال کی زکوۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ وہ بائع پر مضمون بالثمن ہے یعنی اگر سائمہ جانور ہلاک ہو جائے تو بائع پر اس کے ثمن کی واپسی ضروری ہوگی۔ اس علت کا تقاضہ یہ ہے کہ جانور خواہ سائمہ بنانے کے لئے خریدا ہو یا تجارت کے لئے دونوں کے حکم میں فرق نہ ہو۔ علامہ شامی نے فتامل ——— کہہ کر اس مسئلہ میں مزید غور وفکر کی دعوت دے دی اور اپنے عدم اطمینان کا اظہار بھی کر دیا۔

مسئلہ کا فقہی جائزہ

چونکہ کتب فقہ کی ان عبارتوں کی روشنی میں کوئی قطعی رائے قائم کرنا مشکل ہے اس لئے ہم پہلے اس کا فقہی جائزہ لیتے ہیں کہ اس میں وجوب زکوۃ کی شرط ملک تام (ملک رقبہ و ملک ید) پائی جاتی ہے یا نہیں اس کے بعد اپنی رائے قائم کریں گے۔

مذکورہ صورت میں غور کرنے کے بعد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مبیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو ملک رقبہ تو حاصل ہے اس لئے کہ بیع مکمل ہونے کے بعد ہی مبیع پر خریدار کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے خواہ مبیع پر خریدار کا

---

[1] شامی ج ۲ ص ۔ [2] شامی ج ۲ ص ۔

قبضہ ہو یا نہ ہو۔

البیع ینعقد بالایجاب والقبول[1] البتہ یوں کہ مبیع پر قبضہ سے قبل خریدار کو تصرف کا حق حاصل نہیں ہے اس لئے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ خریدار کو مبیع پر قبضہ سے قبل ملک ید حاصل نہیں ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ مذکورہ صورت میں خریدار پر بھی مبیع کی زکوٰۃ واجب نہ ہو۔

قال فی الفتح الاصل ان کل عقد ینفسخ بھلاک العوض قبل القبض لم یجز التصرف فی ذلک العوض قبل قبضہ اذا کان عیناً لا یجوز بیع شیء من ذلک ولا ان یشرک فیہ غیرہ[2]

لیکن اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خریدار کو ملک رقبہ کے ساتھ ملک ید بھی حاصل ہے اس لئے کہ جب بیع مکمل ہو چکی ہے اور خریدار نے ثمن بھی ادا کر دیا ہے تو اس کو شرعاً مبیع سے انتفاع پر قدرت حاصل ہے کیونکہ وہ جس وقت چاہے فروخت کرنے والے سے مبیع کا مطالبہ کر کے مبیع سے انتفاع حاصل کر سکتا ہے۔ لہذا اس کی حیثیت دین قوی کی ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

یہ دو نقطہ ہائے نظر ہمارے سامنے تھے۔ علامہ ابن نجیم نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح البحر الرائق میں محیط السرخسی کے حوالے سے ان دونوں نقطۂ ہائے نظر کو نقل کیا ہے ـــــــ محیط السرخسی نے دوسری رائے (قبضہ سے قبل خریدار پر مبیع کی زکوٰۃ واجب ہو) کو صحیح قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وقد منا ان المبیع لا تجب زکوتہ علی المشتری وذکر فی المحیط فی بیان اقسام الدین ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصاباً لان الملک فیہ ناقص بافتقاد الید والصحیح انہ یکون نصاباً لانہ عوض عن مال کانت یدہ ثابتۃ علیہ وقد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعاً[3]

علامہ ابن نجیم نے محیط السرخسی کی مذکورہ عبارت نقل کرنے کے بعد بہت ہی بہتر اور عمدہ فیصلہ فرمایا ہے کہ زکوٰۃ تو قبضہ کے

---

[1] ھدایہ ج ۳ ص۲ [2] شامی فصل فی التصرف فی المبیع والثمن ج ۴ ص۱۶۲

[3] البحر الرائق ج ۲ ص۲۰۹-۲۰۸

قبل ہی واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور دین قوی کی طرح گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ فمعنى هذا قولهم لا تجب الزكوة معناه قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زكوته فيما مضى كالدين القوي۔ [1]

خلاصۂ جواب راقم الحروف علامہ ابن نجیم کے مذکورہ فیصلے سے متفق ہے اور مذکورہ بحثوں کی روشنی میں اپنی رائے بھی یہی رکھتا ہے کہ قبضہ سے قبل مبیع کی زکوٰۃ خریدار پر واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی اور دین قوی کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

عقد اجارہ میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوٰۃ

جواب۔ ۲۰ - کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کر دی جاتی ہے۔ اس کی حیثیت رہن کی ہوتی ہے۔ اور شئ مرہون پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے نہ ہی راہن پر اور نہ ہی مرتہن پر ــــــ راہن پر اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہے کہ شئ مرہون اس کے قبضہ و تصرف میں نہیں ہے اور شئ مرہون سے اس وقت تک انتفاع بھی نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ وہ مرتہن کے قبضہ میں رہے۔ اور مرتہن پر اس لئے زکوٰۃ واجب نہیں ہے کہ اس کے قبضہ اور تصرف میں تو ہے لیکن اس کی ملکیت نہیں ہے۔ گویا کہ راہن اور مرتہن دونوں کی ملکیت ناقص ہونے کی وجہ سے ان دونوں میں سے کسی پر شئ مرہون کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

لہٰذا کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم پر زکوٰۃ نہ تو کرایہ دار کے ذمہ واجب ہوگی نہ ہی مالک کے ذمہ واجب ہوگی ــــــ البتہ کرایہ دار کو وہ رقم جب واپس مل جائے تو پھر اس پر سال گزر جائے یا پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس دوسری مالیت ہو تو اس کے ساتھ ضم کر کے کرایہ دار کو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی

ولا في مرهون بعد قبضه (درمختار) وقوله: اي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد عليه واذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضية وهو معنى قول الشارح بعد قبضه ويدل عليه قول البحر ومن

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۲۲

ومانع الوجوب الرهن اذ ظاهره ولو كان الرهن ازيد من الدين اهـ [۱]

مدارس اور اداروں میں جمع شدہ رقم پر زکوٰۃ

جواب: مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔

۱ ——— چندہ دہندگان نے چندہ کی رقم کسی خاص مد، مثلاً مسجد یا مدرسہ کی تعمیر پر صرف کرنے کے لئے دیا ہو۔

۲ ——— ہدایا، عطیات اور صدقاتِ نافلہ کی رقم جو عام مد میں صرف کرنے کے لئے دی گئی ہو۔

۳ ——— زکوٰۃ، صدقۂ فطر، چرمِ قربانی یا دیگر صدقاتِ واجبہ کی رقمیں۔

پہلی صورت میں چونکہ مدرسہ یا ادارہ کے منتظم و مہتمم چندہ دہندگان کے وکیل ہوتے ہیں اس لئے جب تک وہ رقم جس مد پر صرف کرنے کے لئے چندہ دہندگان نے دی ہے اس مد پر صرف نہ کر دی جائے چندہ دہندگان ہی اس کے مالک رہیں گے۔ وہ جب چاہیں اس رقم کو واپس لے سکتے ہیں اور دوسرے مد میں صرف کر سکتے ہیں۔ یا صرف کرنے کا حکم دے سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں مدرسہ یا دینی ادارہ میں جمع شدہ رقوم پر ملکیت کے تمام احکام جاری ہوں گے۔ اور سال گزرنے پر چندہ دینے والوں کے ذمہ ان رقوم کی زکوٰۃ بھی واجب الادا ہوگی۔

دوسری اور تیسری صورت میں، مہتمم و منتظم رقم دینے والوں کے بھی وکیل ہوتے ہیں اور مدارس میں پڑھنے والے طلبہ یا دیگر تمام فقراء و مساکین کے بھی وکیل ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں مذکورہ دونوں طرح کی رقوم کے شرعاً حقدار وہ تمام طلباء و فقراء و مساکین ہوتے ہیں جو متعین نہیں ہیں اور جس مال کا مالک متعین نہ ہو اس مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، جیسا کہ وقف کی جائداد اور آزاد چھوڑے ہوئے گھوڑے یا اسلامی خزانہ بیت المال میں جمع شدہ رقوم زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ، یا صدقاتِ نافلہ، مالِ فئی، مالِ غنیمت کا خمس وغیرہ۔ اسی طرح عام فقراء، مساجد، مجاہدین، یتامیٰ، بیوائیں یا دیگر ابوابِ خیر پر وقف شدہ اشیاء پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیوں کہ ان تمام صورتوں میں مال کا مالک متعین نہیں ہے۔ لہٰذا مدارس اور دینی اداروں میں جمع شدہ دونوں طرح کی رقوم پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں مالک متعین ہے ——— علامہ یوسف القرضاوی لکھتے ہیں

وعلى هذا اذا كان هنالك مال لا مالك له او عن بالمالك المالك المعين.

---

[۱] شامی کتاب الزکوٰۃ ج ۲ صد

فلا زكوة فيه وكذلك أموال الحكومة التي تجمعها من الزكوات أو الضرائب أو غيرها من الموارد فلا زكوة فيها لعدم المالك المعين في ملك جميع الأمة ومنها الفقراء ...... ولذا قالوا لا تجب الزكوة في مال فئ ولا في خمس غنيمة لأنه يرجع إلى الصرف في مصالح المسلمين وكذلك كل مايدخل ملكية عامة كالأرض الموقوفة ونحوها۔

وكذلك الموقوف على جهة عامة كالفقراء أو المساجد أو المجاهدين أو اليتامى أو الرباط أو المدارس أو غيرها ذلك من أبواب الخير فالصحيح أن لا زكوة فيها[1]

خلاصۂ جواب

(الف) پہلی صورت میں جب کہ مدارس یا دینی اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں کسی خاص مد پر صرف کرنے کے لئے دی گئی ہوں چندہ دہندگان کے ذمہ اس کی زکوۃ واجب ہوگی۔ اگر سال گزر گیا اور وہ رقم محفوظ ہے تو چندہ دہندگان اس کی زکوۃ ادا کریں گے۔

(ب) دوسری اور تیسری صورت میں جب کہ صدقاتِ واجبہ کی رقم ہو یا عطایا، عطیات اور صدقات نافلہ کی رقم ہو مالک متعین نہ ہونے کی وجہ سے ان رقوم پر کسی کے ذمہ بھی زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

مالِ حرام پر زکوۃ کا حکم

جواب: کسی کے قبضہ میں مال حرام ہونے کی تین صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) پورا کا پورا مال حرام اور مال خبیث ہو ــــ حلال اور طیب مال کچھ بھی نہ ہو۔

(ب) حرام وحلال دونوں مال ہوں لیکن ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں۔ باہم مخلوط نہ ہوں۔

(ج) حرام وحلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہوں کہ ان دونوں کے درمیان تمیز مشکل ہو۔

چوں کہ پہلی اور دوسری دونوں صورتوں میں جب کہ کل مال حرام ہو یا حلال حرام دونوں ہوں اور دونوں کے الگ الگ ہونے سے

---

[1] فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۳۱-۱۳۲

علاوہ ہوں مال حرام پر قبضہ کرنے والے کی ملکیت نہیں ہوتی ہے جیسا کہ علامہ شامی نے "قنیۃ" کے حوالے سے نقل کیا ہے :

"وفی القنیۃ الرشوۃ یجب ردھا ولا تملک" [1]

اس لئے ان دونوں صورتوں میں "مال حرام" پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیوں کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے ملکیت شرط ہے

"وفی القنیہ لو کان الخبیث نصابا لا یلزمہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیہ فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ" [2]

اس مال کا حکم یہ ہے کہ اگر مالک معلوم ومتعین ہو تو وہ مال اس کے حوالہ کیا جائے۔ مالک کے حوالہ خواہ براہ راست ہو اور یہ کہہ کر دیا جائے کہ تمہارا فلاں مال ہے۔ یا اگر اس طرح حوالہ کرنے میں کوئی شرعی یا قانونی رکاوٹ ہو یا جان ومال کے نقصان یا عزت کی پامالی کا قوی اندیشہ ہو تو بغیر کہے ہوئے بھی کسی بھی ذریعہ سے اس کی ملک تک پہنچا دینا ضروری ہوگا یا اگر مالک معلوم ومتعین نہ ہو تو اس کے وبال سے بچنے کے لئے مالک کی طرف سے اس کا تصدق واجب ہوگا۔

"والحاصل أنه إن علم أرباب الأموال وجب رده وإلا فإن علم عين الحرام لا يحل له ويتصدق به بنية صاحبه" [3]

اس مال حرام کو فقراء ومساکین پر صدقہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔ البتہ رفاہ عام پر بھی صرف کرنے کی گنجائش ہے۔ [4]

مخلوط مال حرام وحلال پر زکوٰۃ کا حکم

تیسری صورت جب کہ مال حرام وحلال باہم اس طرح مخلوط ہو چکے ہوں کہ ان کے درمیان تمیز مشکل ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں کہ چوں کہ مال حرام وحلال دونوں کے باہم مخلوط ہو جانے

---

[1] شامی کتاب الحظر ج ۵ صـ۳۶۲   [2] رد المحتار کتاب الزکوٰۃ ج ۲ صـ۲۵

[3] شامی مطلب فیمن ورث مالاً حراماً ج ۲ صـ۱۳۰ [4] اس کی پوری تفصیل تیسرے مجلہ فقہ اسلامی میں مذکور ہے۔ وہاں پر دیکھی جاسکتی ہے۔

کی وجہ سے استہلاک پایا گیا اس لئے وہ مال جس کے قبضہ میں ہے وہ اس کا مالک ہے ــــ اس میں وراثت بھی جاری ہوگی اور اس پر زکوۃ بھی واجب ہوگی۔

جہاں تک ضمان کا تعلق ہے کہ مالک کے آنے پر اس مال کی واپسی ضروری ہے تو اس سلسلہ میں امام صاحب یہ فرماتے ہیں کہ ضمان اس کے ذمہ میں ہے بعینہ اسی مال کی واپسی ضروری نہیں ہے۔

امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ قبضہ کرنے والا اس مال کا مالک نہیں ہے بلکہ وہ مال اس کے پاس بطور امانت ہے ان دونوں حضرات کے نزدیک ملکیت کے احکام اس پر جاری نہیں ہوں گے نہ وراثت جاری ہوگی اور نہ ہی اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔

علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں اور علامہ علاء الدین الحصکفی نے در مختار میں "الولوالجیۃ" کے حوالہ سے امام صاحب کے قول کو ارفق بالناس قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا مال کم ہے جو حرام مال سے خالی ہو۔ اگر اس طرح کے اموال میں وراثت جاری نہ ہو اور زکوۃ واجب قرار نہ دی جائے تو وارثین اور فقراء و مساکین کا حق مارا جائے گا۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ مفتی بہ قول کے مطابق مذکورہ مخلوط مال پر زکوۃ واجب ہے لیکن غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ حقیقت میں اس مال پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اور امام صاحب اور صاحبین کے مابین اختلاف صرف وراثت کے جاری ہونے میں ہے نہ کہ وجوب زکوۃ میں۔ امام صاحب کے نزدیک ملکیت کی وجہ سے وراثت جاری ہوگی اور صاحبین کے نزدیک وراثت جاری نہیں ہوگی۔ لیکن تینوں کا اس پر اتفاق ہے کہ مذکورہ مال پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ اگر امام صاحب کا یہ قول کہ ملکیت ثابت ہو جائے گی تسلیم کر لیا جائے تو بھی ان کے قول کے مطابق زکوۃ واجب نہیں ہونی چاہئے کیونکہ وہ مال مضمون بالدین ہے۔ اگر مالک کا پتہ ہو تو وہ مال مالک کے حوالہ کیا جائے گا ورنہ بلا نیت ثواب اس کا تصدق واجب ہوگا۔ اور وجوب زکوۃ کے لئے مال کا دین سے فارغ ہونا بھی ضروری ہے۔

علامہ ابن نجیم نے البحر الرائق میں یہی اشکال کیا ہے۔ اور امام صاحب کے قول کے مطابق وجوب کی ایک شرط "المبتغی" کے حوالہ سے یہ نقل کی ہے کہ:

"زکوۃ اس شرط کے ساتھ واجب ہے کہ مالکان نے اس مال کی ادائیگی سے بری کر دیا ہو کیونکہ بری کرنے سے قبل وہ مال مضمون بالدین ہے اس لئے زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔"

علامہ ابن نجیم نے اس قید کو حسن اور اس کو محفوظ کر لینا واجب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ ہو البحر الرائق کی پوری عبارت:

"ولذا قالوا لو أن سلطاناً غصب مالاً وخلطه صار ملكاً له حتى وجبت عليه الزكوٰة وورث عنه على قول أبي حنيفة لأن خلط دراهمه بدراهم غيره عنده استهلاك أما على قولهما فلا يضمن فلا يثبت الملك لأنه فرع الضمان ولا يورث عنه لأنه مال مشترك فإنما يورث حصة الميت منه وفي الولوالجية وقولهما أرفق بالناس إذ قلما يخلو مال عن غصب إلا هكذا ذكروا وهو مشكل لأنه وإن كان ملكه عند أبي حنيفة بالخلط فهو مشغول بالدين والشرط الفراغ عنه وينبغي أن لا تجب الزكوٰة فيه على قوله أيضاً ولذا اشترط في المبتغى بالغين المعجمة أن يبرئه أصحاب الأموال لأنه قبل الابراء مشغول بالدين وهو قيد حسن يجب حفظه" [1]

علامہ شامی نے اس موقع سے جو بحث کی ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ علامہ شامی نے فتاوی تتارخانیہ کے حوالے سے نقل کیا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

(الف) مال حرام وحلال کے مخلوط ہونے کی صورت میں اس پر قبضہ کرنے والا شخص اس مال کا مالک تو ہو جائے گا لیکن وہ اس مال کا ضامن ہوگا۔

(ب) اگر اس مخلوط کے علاوہ بقدر نصاب حلال وطیب مال نہیں ہے تو مال مخلوط پر شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہوگی اس لئے کہ وہ مشغول بالدین ہے۔

(ج) اگر مال مخلوط کے علاوہ دوسرا پاک مال بقدر نصاب موجود ہے تو اس مال میں زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس صورت میں یہ مسئلہ قابل غور ہے کہ زکوۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی جو بقدر نصاب ہے یا مال مخلوط میں بھی واجب ہوگی۔ اگر مال مخلوط میں زکوۃ واجب ہوگی تو پورے مال میں یا صرف جائز و پاک مال میں؟ علامہ شامی کی عبارت سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوۃ صرف زائد مال میں واجب ہوگی۔ مال مخلوط میں زکوۃ واجب ہی نہیں ہوگی۔

"وفي الفصل العاشر من التتارخانية عن فتاوى الحجة من ملك أموالاً ... الخ

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۵

طيبة أو غصب اموالاً وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامناً وإن لم يكن له سواها نصاب فلا زكوة عليه فيها وإن بلغت نصاباً لأنه مديون ومال المدين لا ينعقد سبباً لوجوب الزكوة عندنا الا فأفاد بقوله وإن لم يكن له سواها نصاب الا أن وجوب الزكوة مقيد بما اذا كان له نصاب سواها......

لكن لا يخفى أن الزكوة حينئذ إنما تجب فيما زاد عليها لا فيها" [۱]

لیکن اس سلسلہ میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مال حرام کی مقدار معلوم و متعین ہو تو حرام مال کی مقدار کے علاوہ جو جائز مال کی مقدار ہے اس پر زکوۃ واجب ہوگی۔ اور حرام مال کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔ اور اگر حرام و حلال دونوں باہم اس طرح مخلوط ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی کی بھی مقدار معلوم نہیں ہے تو پورے مال مخلوط پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ پورے مال کو صدقہ کرنا ہوگا۔

مال حرام کا مالک معلوم ہونے اور نہ ہونے پر زکوۃ کا حکم

اس موقع سے یہ بحث بھی قابل ذکر ہے کہ اگر مال حرام کا مالک معلوم و متعین ہو تو کیا حکم ہے اور اگر معلوم و متعین نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ دونوں صورتوں میں حکم یکساں ہے یا کوئی فرق بھی ہے؟

علامہ شامی نے اس مسئلہ پر بحث کی ہے۔ ان کی بحث سے دو رائیں سامنے آتی ہیں۔

۱ــــ اگر مالک معلوم و متعین نہ ہو تو ایسی صورت میں زکوۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ وہ دین مانع وجوب زکوۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ اور جب مالک کا پتہ ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ اس دین کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ رہا نہیں ــــ علامہ شامی نے اپنے شیخ کی یہی رائے نقل کی ہے۔

۲ــــ مال حرام کا مالک معلوم و متعین ہو یا نہ ہو بہر دو صورت زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ کل مال کا تصدق واجب ہوگا ــــ علامہ شامی کا رجحان بھی یہی ہے۔

"كما أفاده شيخنا بأن المراد ما اذا لم يعلم أصحاب المال المغصوب لأن الدين انما يمنع وجوب الزكوة اذا كان له مطالب من جهة العباد وجهل

---

[۱] شامی کتاب الزکوۃ ج ۲ ص ۲۵

أصحابه لا يبقى له مطالب فلا يمنع وجوبها ثبتت لكن فيه منا من القنية والبزازية

إنه يجب التصدق بكله لا يفيد التصدق ببعضه لأن المغصوب إن علمت

أصحابه أو ورثتهم وجب رده عليهم وإلا وجب التصدق به" ؎

خلاصۂ جواب

(الف) اگر مال مخلوط میں مال حلال وحرام کے درمیان تمیز مشکل ہو اور مال حرام وحلال کی مقدار بھی معلوم ومتعین نہ ہو تو کل مال کا تصدق واجب ہوگا۔ اس طرح کے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(ب) اگر مال مخلوط کے علاوہ جائز وطیب مال بقدر نصاب موجود ہو تو اس زائد مال پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(ج) مال مخلوط میں اگر حلال وحرام دونوں کی مقدار معلوم ومتعین ہو تو مال مخلوط کے حلال مال کی مقدار پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اور مال حرام کے بقدر صدقہ کرنا ہوگا۔

دین پر زکوٰۃ

جوابؒ: دین پر زکوٰۃ واجب ہے یا نہیں؟ اگر واجب ہے تو دائن اور مدیون دونوں پر یا کسی ایک پر؟ اس سلسلہ میں درج ذیل تفصیل ہے:

۱ــــــ دائن اور مدیون دونوں پر زکوٰۃ واجب ہو۔ اس کا قائل کوئی بھی فقیہ نہیں ہے۔

۲ــــــ دائن اور مدیون دونوں میں سے کسی پر بھی دین کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اس کے قائل حضرت عکرمہ اور حضرت عطاء ہیں۔ ابن حزم نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا یہی قول نقل کیا ہے۔ اصحاب ظواہر کا مسلک بھی یہی ہے۔ امام مالک کا مسلک بجز چند استثنائی صورتوں کے تقریباً یہی ہے۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ دین میں وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرط "ملک تام" نہیں پائی جارہی ہے۔ نہ تو دائن کی ملکیت تام ہے اور نہ ہی مدیون کی۔ مدیون کے قبضہ وتصرف میں ہے، لیکن اصل ملکیت حاصل نہیں ہے اور دائن کو اصل ملکیت حاصل ہے، لیکن اس کے قبضہ وتصرف میں نہیں ہے۔ لہٰذا ملک تام نہ پائے جانے کی وجہ سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

؎ حوالہ مذکور ج ۲ ص ۲۶

۳ــــــ دورِ صحابہ سے لے کر ان کے بعد تک کے جمہور فقہائے کے نزدیک مدیون پر تو زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ دائن پر کچھ تفصیل کے ساتھ زکوٰۃ واجب ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

دین کی قسمیں

یہ حضرات دین کی دو قسمیں کرتے ہیں۔

(الف) ــــ **دین غیر مرجو** ـ وہ دین جس کے ملنے کی امید نہ ہو مثلاً ایسے نادار اور مفلس پر دین ہو جس کی مالداری کی امید نہ ہو۔ یا ایسے شخص پر دین ہو جو دین کا انکار کرتا ہو اور کوئی شرعی شہادت موجود نہ ہو۔

(ب) **دین مرجو** ـ وہ دین جس کے ملنے کی امید ہو مثلاً کسی ایسے صاحب مال پر دین ہو جو اس دین کا اقرار بھی کرتا ہو۔

جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

حضرت علی اور حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ :

"جس دین کے ملنے کی امید نہ ہو اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ البتہ اس کی ادائیگی اس پر قبضے کے بعد لازم ہوگی۔ اور قبضے کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی"

حضرت امام شافعی اور حضرت امام زفر بھی یہی فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ ان حضرات کے نزدیک "ملک تام" سے مراد اس مال کا مکمل مالک ہونا ہے۔ خواہ وہ قبضہ و تصرف میں ہو یا نہ ہو۔ اسی وجہ سے ان حضرات کے نزدیک مال ضمار میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس مال میں ملکیت باقی ہے تو حق اللہ یعنی زکوٰۃ وہ کیسے ساقط ہوگا۔

امام ابو حنیفہ اور ان کے دونوں شاگرد امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک اس طرح کے دین کا حکم "مال ضمار" کا ہے۔ مال ضمار (وہ مال جس سے انتفاع پر قدرت نہ ہو) کی طرح قبضہ سے قبل اس دین پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جب اس دین کے ملنے کی امید نہیں ہے اور نہ اس سے انتفاع پر قدرت ہے تو اس مال کی وجہ سے غنا کا تحقق نہیں ہوگا۔ اور زکوٰۃ غنی (صاحب نصاب) پر واجب ہے نہ کہ غیر صاحب نصاب پر۔

علامہ یوسف القرضاوی نے "فقہ الزکوٰۃ" میں اس مسئلہ پر مدلل اور سیر حاصل بحث کی ہے اور آخر میں امام صاحب کی رائے سے مکمل موافقت کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ تحریر فرماتے ہیں۔

"ونحن نوافق أبا حنيفة في اعتبار هذا النوع من الدين المجحود او الميئوس منه والمال الضمار بصفة عامة إذا قبضه صاحبه كالمال الجديد المستفاد" [1]

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس پر زکوٰۃ کا حکم

جس دین کے ملنے کی امید ہو اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی دو رائیں ہیں۔

۱۔ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کے نزدیک جس دین کے ملنے کی امید ہو وہ "دین قوی" ہے۔ ہر سال اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، البتہ زکوٰۃ کی ادائیگی قبضہ کے بعد لازم ہوگی۔ اور قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنی ہوگی لیکن مقتول کی دیت اور بدل کتابت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ بلکہ قبضہ کے بعد سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

یہ دونوں حضرات فرماتے ہیں کہ :

"بدل کتابت اور مقتول کی دیت کے علاوہ اس طرح کے تمام دیون پر صاحب دین کو "ملک تام" حاصل ہے اس لئے کہ وہ دین کی وصولیابی پر قادر ہے، جب چاہے وہ اس کا بدل وصول کر سکتا ہے لہٰذا اس طرح کے تمام دیون پر "ملک تام" پائے جانے کی وجہ سے قبضہ سے قبل بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ دیت اور بدل کتابت پر ان کی ملکیت ناقص ہے اس لئے ان دونوں میں قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ دیت پر اس لئے ملکیت ناقص ہے کہ اگر قاتل کے عاقلہ میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تو اس پر جو دیت ہے وہ ساقط ہو جائیگی، اس سے معلوم ہوا کہ دیت پر مقتول کے وارثین کی ملکیت ناقص ہے۔ ورنہ مرنے والے کے ذمہ دین کے ساقط ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے اور "بدل کتابت" درحقیقت دین ہی نہیں ہے اس لئے کہ مکاتب پر جب تک ایک درہم بھی باقی ہو وہ غلام ہے اور غلام پر آقا کا دین واجب نہیں ہوتا ہے۔

---

[1] پوری تفصیل کے لئے دیکھئے فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۱۳۵ تا ۱۴۱

مکاتب جو کچھ بھی کماتا ہے اس پر من وجہ آقا کی ملکیت بھی رہتی ہے اور من وجہ مکاتب کی بھی۔
آقا کی ملکیت تو اس لئے رہتی ہے کہ غلام کا جو بھی مال ہے وہ آقا کا ہے اور مکاتب کی ملکیت اس
لئے رہتی ہے کہ مکاتب اپنی کمائی میں آزاد ہے۔"

۲ ——— امام صاحب اس طرح کے دیون کی تین قسمیں کرتے ہیں۔ دین قوی۔ دین متوسط اور دین ضعیف۔

دین قوی کسی کا قرض کسی کے ذمہ ہو یا تاجر نے سامان تجارت فروخت کیا اور خریدنے والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی ہے، اس کو دین قوی کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ سال گزرنے کے بعد قبضہ سے قبل بھی ہر سال زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ نصاب زکوٰۃ کے ۱/۵ کے برابر یعنی چالیس درہم یا اس کی مالیت کے بقدر رقم وصول ہو جائے۔ اس سے قبل زکوٰۃ کی ادائیگی لازم نہیں ہوگی لیکن ادائیگی کے وقت گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی حساب کر کے ادا کرنا ہوگی۔

واضح رہے کہ ایک درہم کا وزن تین ماشہ اور ۱/۵ رتی چاندی کے برابر ہوتا ہے۔ آٹھ رتی برابر ایک ماشہ اور بارہ ماشہ برابر ایک تولہ ہوتا ہے۔ اس طرح چالیس درہم کا وزن دس تولہ چھ ماشہ چاندی کے برابر ہوا۔ گویا کہ "دین قوی" میں زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ دس تولہ اور چھ ماشہ چاندی یا اس کی قیمت کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔

دین متوسط وہ قرض جو کسی سامان کی قیمت ہو لیکن وہ سامانِ تجارت کی قیمت نہ ہو۔ اس کو دین وسط کہتے ہیں۔ اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں امام ابو حنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کا حکم دین قوی کی طرح ہے کہ "دین قوی" کی طرح اس میں بھی گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ البتہ اس میں زکوٰۃ کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ دو سو درہم یعنی ساڑھے باون (۵۲ ۱/۲) تولہ چاندی یا اس کے بقدر قرض وصول ہو جائے۔

امام صاحب سے دوسری روایت یہ ہے کہ اس میں دین ضعیف کی طرح گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔ صاحب بدائع وغیرہ نے اسی دوسرے قول کو صحیح قرار دیا ہے۔ [۱]

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع ج ۲ ص [illegible]

دین ضعیف ـــــ وہ قرض جو کسی مال کے عوض مدیون پر عائد نہ ہو خواہ وہ کسی چیز کا معاوضہ ہی نہ ہو جیسے حصۂ میراث یا وصیت کا مال جو کسی پر قرض ہو یا کسی چیز کا معاوضہ تو ہو لیکن مال کا معاوضہ نہ ہو مثلاً مہر یہ معاوضہ تو ہے لیکن مال کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ ملک بضعہ کا معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے۔ اس کو دین ضعیف کہتے ہیں۔ دین ضعیف پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ قبضہ کے بعد جب سال گزر جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

دیون کی مذکورہ بالا تقسیم اور "دین قوی" پر زکوٰۃ واجب ہونے اور "دین متوسط" اور "دین ضعیف" پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کے سلسلہ میں امام صاحب کے دو نقطۂ نظر ہیں۔

۱ ـــــ پہلا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دین درحقیقت مال نہیں ہے بلکہ صاحب دین کو مال کا مالک بنا دینے اور مال اس کے حوالہ کر دینے کا ایک واجبی اور ضروری عمل ہے اور ظاہر ہے کہ عمل مال نہیں ہے لہٰذا جب دین مال نہیں تو اصولاً تمام دیون میں زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے کیونکہ زکوٰۃ مال میں واجب ہوتی ہے۔ البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو وہ مال کے حکم میں ہے کیونکہ کسی چیز کا بدل اس کے قائم مقام ہوا کرتا ہے گویا کہ خود مال تجارت اس کے قبضہ میں ہے جس پر سال گزر رہا ہے لہٰذا اصولاً و شرعاً "دین قوی" میں تو زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔ دوسرے دیون میں نہیں۔

۲ ـــــ دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اگر دین کو مال مملوک تسلیم کر لیا جائے تب بھی چونکہ قبضہ و تصرف میں نہیں ہے اور نہ ہی اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیوں کہ دین ذمہ میں واجب ہے۔ حقیقتاً مال نہیں ہے اور جو چیز ذمہ میں واجب ہو اس پر قبضہ کا احتمال نہیں رہتا ہے اس لئے مال مملوک تسلیم کر لینے کی صورت میں بھی تمام دیون پر اصولاً زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہئے۔ البتہ جو دین مال تجارت کے عوض میں ہو اس کو مال تجارت کے قائم مقام دیتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس پر قبضہ کا احتمال ہے کیونکہ کسی شیٔ کا بدل اس شیٔ کے قائم مقام ہوتا ہے لہٰذا اس دین پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہئے۔

دیون کی اس تقسیم اور عدم تقسیم کے سلسلہ میں فتویٰ امام صاحب کے قول پر ہے۔ اسی قول کو عام مشائخ نے اختیار کیا ہے۔ البتہ صاحبین کا قول اختیار کرنا احوط ہے۔ [1]

---

[1] دیون کی اس پوری تفصیل کے لئے دیکھئے بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۰ تا ۱۲، البحر الرائق ج ۲ ص ۲۰۸ اور فتاویٰ خانیہ علی ہامش الفتاویٰ الهندیہ ج ۱ ص ۲۵۳

معاوضہ ہے جو مال نہیں ہے۔ خدمت مال ہے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں حسب تصریحات فقہاء "عبد تجارت" (وہ غلام جو تجارت کے لیے ہو) کی خدمت تو مال ہے لیکن کوئی بھی فقیہ آزاد شخص کی خدمت کو مال قرار نہیں دیتا ہے۔ اس رقم کو "مال ضمار" میں بھی شامل نہیں کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ اس دین کے ملنے کی امید ہے۔ اب لامحالہ اس کو "دین ضعیف" میں شامل کرنا ہوگا جس پر قبضہ کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اوپر دیون کی تفصیل میں یہ بات گزر چکی ہے امام ابو حنیفہؒ کا قول راجح اور مفتی بہ ہے اور صاحبین کا قول احوط ہے لہٰذا مفتی بہ قول کے مطابق پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ بلکہ قبضہ کے بعد جب اس پر سال گزر جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی یا اگر پہلے سے بقدر نصاب اس کے پاس مال موجود ہو جس پر سال گزر رہا ہو تو مال مستفاد کی طرح اس رقم کو بھی سابق نصاب کے ساتھ ضم کر کے زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرنی ہوگی۔

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نماء

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط مال کا "نامی" ہونا ہے۔ مال غیر نامی میں زکوٰۃ شرعاً واجب نہیں ہے۔ وجوب زکوٰۃ کے لیے "مال نامی" کی شرط کیوں ہے، اس کی حکمت بیان کرتے ہوئے علامہ ابن ہمام لکھتے ہیں:

> "زکوٰۃ کی مشروعیت اس لئے ہے تاکہ اللہ تعالیٰ نے جس کو مال و دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہ اپنے مال کا کچھ حصہ نکال کر فقراء و مساکین کو دے جس سے ان کی غمخواری ہوگی۔ زکوٰۃ میں اتنا مال نہ دے جس سے وہ خود فقیر ہو جائے۔ اگر ایسے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے جس میں "نمو" کی صلاحیت نہ ہو تو زکوٰۃ دینے والا خود ہی فقیر ہو جائے گا جو اسلامی روح کے خلاف ہے۔"[1]

نماء کی حقیقت

نماء کا لغوی معنی مطلق زیادتی ہے۔ جب مال میں اضافہ ہو تو "نمی المال" کہا جاتا ہے اور جب کسی کے مال میں زیادتی کی دعا دی ہو تو اس وقت "انماہ اللہ تعالیٰ" کہا جاتا ہے۔ نماء کے لغوی معنی سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "مال نامی" وہ مال کہلائے گا جس میں حقیقتاً زیادتی ہو، لیکن یہ ضروری نہیں ہے اور نہ یہی مقصود ہے۔

---

[1] فتح القدیر ج ۲ ص ۱۲۳

بلکہ زیادتی خواہ حقیقۃً ہو یا مال کو زیادتی کے لئے تیار کیا گیا ہو یعنی تجارت یا سائمہ بنانے کے ذریعہ اس میں زیادتی ہو سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر ہر وہ مال "مال نامی" کہلائے گا جس میں اضافہ پر قدرت ہو۔ خواہ براہ راست یا اپنے نائب کے ذریعہ۔ صاحب بدائع الصنائع علامہ کاسانی لکھتے ہیں:

"ومنها کون المال نامیاً لان معنی الزکوٰۃ وھو النماء لا یحصل الا من المال النامی ولسنا نعنی بہ حقیقۃ النماء لان ذلک غیر معتبر وانما نعنی بہ کون المال معداً للاستنماء بالتجارۃ او بالاسامۃ"۔[1]

نماء کی قسمیں

نماء کی شرعاً دو قسمیں ہیں۔ حقیقی اور تقدیری۔

نماء حقیقی سے مراد یہ ہے کہ تجارت یا سائمہ جانوروں کے ذریعہ حقیقۃً یعنی بالفعل زیادتی حاصل کی جائے۔

نماء تقدیری سے مقصود یہ ہے کہ زیادتی پر قدرت ہو خواہ براہ راست اضافہ پر قادر ہو یا اپنے نائب کے ذریعہ۔ علامہ شامی البحر الرائق کے حوالے سے نقل کرتے ہیں:

"وفی الشرع ھو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات والتقدیری تمکنہ من الزیادۃ بکون المال فی یدہ او ید نائبہ بحر"[2]

علامہ زیلعی نے کنز الدقائق کی اپنی مشہور ترین شرح "تبیین الحقائق" میں نماء کی حقیقت اور اس کی قسموں پر بحث کرتے ہوئے "نماء" کی دوسری قسم بھی بیان کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

"نماء حقیقی اور نماء تقدیری دونوں میں سے ہر ایک کی دو دو قسمیں ہیں۔ خلقی اور فعلی"

نماء خلقی سے مراد سونا اور چاندی ہے کیونکہ یہ دونوں تجارت کے لئے ہی پیدا کئے گئے ہیں۔ اسی وجہ سے ان دونوں میں تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو ہر دو صورت زکوٰۃ واجب ہوگی۔ حتیٰ کہ اگر خرچ کرنے کے لئے رکھے گئے ہوں تب بھی شرعاً ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

نماء فعلی سے مقصود یہ ہے کہ اس مال کی خلقت تو نماء کے لئے نہ ہو لیکن بندہ نے اس کو نماء کے لئے تیار کر دیا ہو مثلاً مال کو تجارت کی نیت سے یا جانور کو سائمہ بنانے کی غرض سے خریدا تو ان دونوں صورتوں میں نماء

---

[1] بدائع الصنائع ج ۲ ص [illegible] [2] رد المحتار ج ۲ ص [illegible] والبحر الرائق ج ۲ ص [illegible]

فطلاً پائی جائے گی۔ ملاحظہ ہو تبیین الحقائق کی عبارت:

"وینقسم کل واحد منهما الی قسمین الخلقی والفعلی فالخلقی الذهب والفضة لأنهما خلقا للتجارة فلا یشترط فیهما النیة والفعلی ما یکون باعداد العبد وهو العمل بنیة التجارة" [۱]

سونا اور چاندی کی خلقت تجارت کے لئے ہوئی ہے۔ اس کا مطلب شیخ شلبی نے تبیین الحقائق کے حاشیہ پر علامہ کمال کے حوالہ سے یہ بیان کیا ہے کہ ان دونوں کی تخلیق ہی اس لئے ہوئی ہے کہ ان کے ذریعہ دوسری چیزیں حاصل کی جائیں تاکہ ان سے کھانے پینے پہننے اور رہائش وغیرہ کی ضرورت پوری ہوسکے۔ اس طرح گویا کہ ان کی تخلیق تجارت کے لئے ہوئی ہے۔

"قال الکمال رحمہ اللہ وقولهم فی النقدین خلقا للتجارة معناه انهما خلقا للتوسل بهما الی تحصیل غیرهما وهذا لان الضرورة ماسة فی دفع الحاجة والحاجة فی المأکل والمشرب والملبس والمسکن وهذه غیر نفس النقدین وفی اخذهما علی التغالب ما لا یخفی فخلق النقد لیرغب او لیستبدل بهما ما تندفع الحاجة بعینه بعد خلق الرغبة فیهما فکانا للتجارة خلقة" [۲]

نمائے عرفی مال نامی کی ایک قسم "عرفی" کی بھی ہے۔

یعنی وہ مال جس کو اللہ تعالیٰ نے نمو کے لئے پیدا نہیں فرمایا لیکن لوگوں نے اس کو مال نامی خلقی کے قائم مقام قرار دے دیا۔ اس طرح وہ مال "عرفاً" مال نامی قرار پایا۔ مثلاً سونا، چاندی کے علاوہ مختلف ممالک کی مختلف کرنسیاں۔ جیسے کاغذی نوٹ، سکے، ڈالر اور ریال وغیرہ۔

اس طرح نماء کی کل چھ قسمیں ہو جاتی ہیں جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ نماء حقیقی خلقی ۲۔ نماء حقیقی عملی ۳۔ نماء حقیقی عرفی ۴۔ نماء تقدیری خلقی ۵۔ نماء تقدیری عملی ۶۔ نماء تقدیری عرفی۔

---

[۱] تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۵۶ [۲] حاشیہ چلپی علیٰ تبیین الحقائق ج ۱ ص ۲۵۶

مال غیر نامی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے نمو شرط ہے تو اس مال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے جس میں سرے سے "نمو" کی صلاحیت ہی نہیں ہے یا نمو کی صلاحیت تو ہے لیکن مالک کو کسی طرح بھی "نمو" پر قدرت نہیں ہے نہ براہِ راست اور نہ ہی اپنے نائب کے ذریعہ۔ اسی وجہ سے مال ضمار (مال مفقود، مال مغصوب) یا اس طرح کے دیگر اموال پر شرعاً زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح ضروریات کے سامان پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ اس طرح کے اموال "مال نامی" سے خارج ہیں۔ علامہ ابن نجیم نماء اور اس کی قسموں کو بیان کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"فلا زکوۃ علی من لم یتمکن من تنمیۃ مالہ کمال الضمار الخ"[1]

نمو سے عجز کی دو صورتیں ہیں

اس موقع سے اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک ہے مال کا "نمو" سے عاجز ہونا مثلاً مال ضمار وغیرہ۔ دوسری صورت ہے مالک کا عاجز ہونا مثلاً مال قبضہ میں ہے لیکن مالک تجارت وغیرہ کے ذریعہ نماء پر قادر نہیں ہے۔ پہلی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ البتہ دوسری صورت میں زکوٰۃ واجب ہے اس لئے کہ مالک کا عجز شرعاً معتبر نہیں ہے کیونکہ وہ ایسا حیلہ اختیار کرسکتا ہے جس سے مال میں اضافہ ہو مثلاً شرکت، مضاربت وغیرہ کا معاملہ کرے۔ بہرحال! اسباب کے مہیا کرنے سے وہ عاجز نہیں ہے۔ لہٰذا مالک کے عاجز ہونے کے باوجود مال نامی پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔[2]

مال نامی کا دائرہ

مال نامی سے متعلق ایک اہم بحث یہ آتی ہے کہ "مال نامی" کا دائرہ محدود و مخصوص ہے یا غیر محدود اور عام؟ اس سلسلہ میں دو نظریے ہمارے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ابن حزم، شوکانی اور صدیق حسن خان وغیرہ اس بات کے قائل ہیں کہ "مال نامی" کا دائرہ محدود ہے

---

[1] البحر الرائق ج ۲ ص ۲۲۲

[2] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۱۴۳-۱۴۵

اور بعض خاص اصناف پر زکوٰۃ واجب ہے جن پر زکوٰۃ لینے کا ثبوت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ ابن حزم نے اپنی مشہور کتاب "محلی" میں ان کی تعداد آٹھ بتائی ہے۔

۱۔ ابل ۲۔ بقر ۳۔ غنم ۴۔ قمح ۵۔ شعیر ۶۔ تمر ۷۔ فضہ ۸۔ ذہب

ان کے علاوہ دوسرے اصناف پر جن پر زکوٰۃ لینے کا ثبوت احادیث سے نہیں ہے زکوٰۃ واجب قرار نہیں دیتے ہیں۔ یہ حضرات اس سلسلہ میں دو باتیں فرماتے ہیں:

(الف) مسلمان کا مال محترم ہے جس کا ثبوت نصوص سے ہے۔ لہٰذا بغیر نص کے مسلمان کے مال سے کچھ لینا جائز نہیں ہے

(ب) زکوٰۃ تکلیف شرعی ہے۔ اس میں قیاس کا کوئی دخل نہیں ہے۔

۲ ـــــ جمہور صحابہ، تابعین، محدثین اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ "مال نامی" کا دائرہ غیر محدود اور وسیع ہے۔ جس مال میں بھی نمو کی صلاحیت موجود ہو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی گو خصوصیت سے اس مال پر زکوٰۃ لینے کا ثبوت نہ ہو۔ جمہور کے مسلک کی بنیاد چند اصولوں پر قائم ہے جو درج ذیل ہیں:

(الف) قرآن کریم کی جن آیات اور احادیث نبویہ کی جن روایات سے زکوٰۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے وہ عام ہیں۔ ان میں کوئی قید نہیں کہ فلاں مال میں زکوٰۃ واجب ہے اور فلاں میں نہیں۔ البتہ روایات سے یہ واضح ہے کہ وجوب زکوٰۃ کے لئے "مال نامی" ہونا ضروری ہے اس لئے "مال نامی" کی قید لگانی ہوگی۔

(ب) ہر مالدار (صاحب نصاب) پر ضروری ہے کہ وہ اخلاق رذیلہ بخل اور لالچ وغیرہ سے پاک صاف ہو اور مال کی محبت اس کے دل سے نکل جائے اور یہ طہارت مال میں زکوٰۃ نکالنے کے ذریعہ ہو سکتی ہے جو کسی بھی مال کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ جس مال سے بھی وہ زکوٰۃ دے گا اس کا تزکیہ ہوگا۔

(ج) مال کی طہارت بھی ضروری ہے کہ کمائی کے دوران کچھ شبہات پیدا ہوئے ہوں وہ دور ہو سکیں اور مال کی طہارت اس کی زکوٰۃ دینا ہے۔ جو صرف مذکورہ آٹھ قسموں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ ہر "مال نامی" کی طہارت ضروری ہے۔

(د) زکوٰۃ کی مشروعیت فقراء و مساکین کی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہے اور ان کی ضرورت صرف مذکورہ اموال سے پوری نہیں ہوگی بلکہ ہر "مال نامی" سے ان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ اس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ اموال غیر نامیہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہو لیکن چونکہ روایات میں اموال نامیہ کی قید لگائی گئی ہے اس لئے اموال غیر نامیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

جہاں تک مال مسلم کے احترام کا تعلق ہے تو وہ خاص اس کی ملکیت میں ہے۔ زکوٰۃ تو حق اللہ یا بالفاظ دیگر حق الجماعۃ ہے۔ اس کی وصولیابی تو بہر حال ضروری ہے۔ اور جہاں تک ان اموال سے زکوٰۃ وصول نہ کرنے کا تعلق ہے تو یاتو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان اموال میں "نمو" کی صلاحیت کمزور تھی اس لئے ان کے مالکان کی رعایت کرتے ہوئے زکوٰۃ معاف کر دیا یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اموال کے مالکان کو اپنا نائب بنا کر زکوٰۃ دینے کا حکم دے دیا ہو۔ بہر حال ، جمہور کا مسلک صحیح ہے۔ "مال نامی" کا دائرہ غیر محدود اور عام ہے [۱]

وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط — حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی شرطوں میں سے ایک بنیادی شرط "اموال نامیہ" کا حوائج اصلیہ سے زائد ہونا ہے جو مال حوائج اصلیہ میں شامل ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لئے کہ اس مال کے ذریعہ غنی کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ شرعاً غنی پر واجب ہے۔ نیز حوائج اصلیہ میں شامل اموال پر زکوٰۃ کی ادائیگی خوش دلی سے نہیں ہو سکتی ہے جب کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ " ادوا زکوۃ اموالکم طیبۃ بہا انفسکم" یعنی اپنے اموال کی زکوٰۃ خوش دلی سے نکالو [۲]

حاجت کے ساتھ اصلیہ کی قید کیوں لگائی گئی ہے اس پر بحث کرتے ہوئے علامہ یوسف القرضاوی نے بڑی اچھی بات لکھی ہے کہ :

"چوں کہ انسان کی حاجتیں بیشمار اور لامحدود ہیں، خاص طور سے اس زمانہ میں جب کہ تعیش وکمال، حاجت کا اور حاجت، ضرورت کا درجہ اختیار کر چکی ہے اس لئے ہر وہ چیز جس کی خواہش انسان رکھتا ہے اس کو حاجت اصلیہ میں شمار کر کے وجوب زکوٰۃ سے خارج نہیں کر سکتے ہیں، کیوں کہ انسان حریص ہے اگر اس کو سونے کی دو وادی مل جائے تو خواہش کرے گا کہ تیسری بھی مل جائے۔"

ملاحظہ ہو عبارت :

" وانما قلنا : الحاجۃ الاصلیۃ، لان حاجات الانسان کثیرۃ ولا تکاد

---

[۱] پوری تفصیل کے لئے دیکھئے فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۴۵ تا ۱۴۹ [۲] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۲۲۳

تقتضي وخاصة في عصرنا الذي كادت تصبح فيه الكماليات حاجيات والحاجيات ضروريات فليس كل ما يرغب فيه الانسان يعد حاجة اصلية لان ابن آدم لو كان له واديان من ذهب لابتغى ثالثاً" ۔ ؎۱

حاجت اصلیہ کی تعریف

حاجت اصلیہ کسے کہتے ہیں ؟ اس کی تعریف علامہ یوسف القرضاوی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

" ولكن الحاجات الاصلية ما لا غنى للانسان عنه في بقائه كمأكله وملبسه ومشربه ومسكنه وما يعينه على ذلك من كتب علمه وفنه وادوات حرفته ونحو ذلك "

یعنی حاجت اصلیہ ہر وہ چیز ہے جو انسان کی بقا کے لئے ضروری اور معین و مددگار ہو جیسے کہ کھانا ، کپڑا ، پانی یا رہائشی مکان یا جس علم وفن کو حاصل کرنے والا ہے اس علم و فن کی کتابیں ، یا جس پیشہ کو اختیار کرنے والا ہو اس پیشہ کے آلات وغیرہ ؎۲

فقہاء احناف نے حاجت اصلیہ کی نہایت ہی علمی اور دقیق تفسیر بیان کی ہے چنانچہ علامہ شامی ابن ملک کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں :

" وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد او تقديراً كالدين فان المديون محتاج الى قضائه بما في يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك " ؎۳

یعنی حاجت اصلیہ سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کو ہلاکت سے محفوظ رکھے خواہ وہ ہلاکت حقیقی ہو

؎۱ فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص۱۵۲ ؎۲ حوالہ مذکور

؎۳ رد المحتار ج ۲ ص۶

یا تقدیری، حقیقی کی مثال نفقہ، رہائشی مکان، آلات حرب، سردی، گرمی سے بچنے کے لئے ضروری کپڑے ہیں اور تقدیری کی مثال "دین" ہے اس لئے کہ مدیون اس بات کا محتاج ہے کہ اس کے پاس جو مال ہے وہ اس کو دے کر قرض کی ادائیگی کر دے تاکہ قید وغیرہ سے محفوظ رہ سکے کیوں کہ قید ایک طرح سے ہلاکت ہی ہے۔ آلات حرفہ گھریلو سامان اور سواری کے جانور بھی تقدیری کی مثال ہیں اسی طرح علم و فن حاصل کرنے والوں کے لئے اس علم و فن کی کتابیں ہیں کیوں کہ جہالت ہلاکت کے مانند ہے۔

خلاصہ یہ کہ حاجت اصلیہ میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو انسان کی بقا اور اس کے وجود کے لئے ضروری ہیں۔ اور جو اس کو ہلاکت سے محفوظ رکھ سکیں خواہ حقیقۃً ہو یا تقدیراً۔

حاجت اصلیہ کا دائرہ

یہاں پر ایک بحث یہ ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ کیا ہے؟ آیا جس شخص کے مال پر زکوۃ واجب ہے اسی کی ضروریات کی چیزیں حوائج اصلیہ میں شامل ہونگی یا دوسرے لوگوں کی ضروریات بھی اس کے حوائج اصلیہ کے تحت آئیں گی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ صرف زکوۃ دینے والے تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کی ضروریات کے ساتھ بیوی، نابالغ اولاد یا جن بالغ اولاد کا نفقہ اس پر واجب ہے۔ اسی طرح والدین اور دیگر رشتہ دار جن کا نفقہ واجب ہے ان سب کی ضروریات اس کے حوائج اصلیہ میں شمار ہوں گی۔

"والمعتبر هنا: الحاجات الاصلية للمكلف بالزكوة، ومن يعوله من الزوجة والاولاد، مهما بلغ عددهم، والوالدين والاقارب الذين تلزمه نفقتهم فان حاجتهم من حاجته" ۔[1]

حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور کے اعتبار سے ہوگا

چوں کہ زمانہ، حالات اور ماحول کی تبدیلی سے لوگوں کی حاجت و ضرورت میں تبدیلی آتی رہتی ہے ہر دور میں ہر ایک کی حاجت و ضرورت یکساں نہیں ہوتی۔ ایک چیز ہے جو عام انسانوں کی حاجت و ضرورت

---

[1] فقہ الزکوۃ ج ۱ ص ۱۵۱

خارج ہے لیکن کسی خاص انسان مثلاً وزیر اعظم کی حاجت وضرورت میں شامل ہے اس لئے "حاجت اصلیہ" کا تعین ہر دور اور ہر زمانہ کے اعتبار سے ہوگا حتیٰ کہ افراد و اشخاص کے اعتبار سے بھی حاجت اصلیہ کا تعین علٰحدہ ہوگا۔ وقت کے صاحب الرای اور اولی الامر جو لوگ ہوں گے ان پر چھوڑ دیا جائے گا۔ وہ جس کو حاجت اصلیہ میں شمار کریں گے اس کا شمار "حاجت اصلیہ" میں ہوگا۔ ہر ایک کو "حاجت اصلیہ" کے تعین کا اختیار نہیں ہوگا۔

"والذی نری علی کل حال: ان الحاجات الاصلیۃ للانسان قد تتغیر وتتطور بتغیر الازمان والبیئات والاحوال۔ والاولی ان تترک لتقدیر اھل الرای واجتھاد اولی الامر" [۱]

وجوب زکوٰۃ کی چوتھی شرط — دین سے محفوظ ہونا ہے

وجوب زکوٰۃ کی بنیادی شرطوں میں سے ایک شرط "مال نامی" کا دین سے محفوظ ہونا بھی ہے اگر مال نامی "حوائج اصلیہ" سے زائد ہے لیکن دین سے محفوظ نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس دس ہزار روپے حوائج اصلیہ سے زائد ہیں۔ لیکن وہ دس ہزار روپے کا مقروض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں یا پانچ ہزار روپے کا مقروض ہے تو پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ البتہ بقیہ پانچ ہزار روپے میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے ماہ رمضان المبارک میں صحابہ کرام کی ایک بڑی جماعت کی موجودگی میں خطبہ دیا، اور خطبہ کے دوران یہ ارشاد فرمایا:

"فمن کان لہ مال وعلیہ دین فلیحسب مالہ بما علیہ ثم لیزک بقیۃ مالہ" [۲]

یعنی اگر کسی کے پاس مال ہے اور اس پر دین بھی ہے تو دین کے بقدر مال الگ کر کے بقیہ مال کی زکوٰۃ دے۔ کسی صحابی نے اس پر نکیر نہیں کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ مدیون کا مال زکوٰۃ کے عموم سے خارج ہے۔ اور مال کی جو مقدار دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ نیز جو مال دین کی ادائیگی کے ساتھ مشغول ہو وہ حوائج اصلیہ میں سے ہے کیوں کہ دین کی ادائیگی انسان کی حاجت اصلیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور جس

---

[۱] فقہ الزکوٰۃ ج ۱ ص ۱۵۲ — [۲] بحوالہ بدائع الصنائع ج ۲ ص ۱۹

مال کا شمار حوائج اصلیہ میں ہو اس کی موجودگی میں غنیٰ کا تحقق نہیں ہوتا ہے اور زکوٰۃ غنی پر واجب ہے نہ کہ غیر غنی پر۔ لہٰذا دین کے بقدر جو مال ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں قرار پائے گا۔ اور اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی علامہ کاسانی لکھتے ہیں

"ولانہ محتاج الیہ حاجۃ اصلیۃ لان قضاء الدین من الحوائج الاصلیۃ والمال المحتاج الیہ حاجۃ اصلیۃ لا یکون مال الزکوٰۃ لانہ لا یتحقق بہ الغنی ولا صدقۃ الا عن ظہر غنی علی لسان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"[1]

اب یہاں پر تین باتیں قابل ذکر ہیں جن پر قدرے تفصیل سے بحث کی جائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

۱۔ کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے؟

۲۔ وہ دین جو مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی کتنی قسمیں ہیں؟

۳۔ کون سا دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے؟

پہلی صورت — کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے

کس مال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس سلسلہ میں غور کرنے سے فقہاء کرام کے تین اقوال سامنے آتے ہیں۔

(الف) بعض فقہاء اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کے درمیان فرق کرتے ہیں ان کے نزدیک اموال باطنہ (نقود اور اموال تجارت) میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ اموال ظاہرہ جیسا کہ جانور اور کھیت کی پیداوار میں نہیں۔

(ب) جمہور کے نزدیک اموال ظاہرہ اور باطنہ دونوں طرح کے اموال میں دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے

(ج) البتہ امام ابو حنیفہؒ کا راجح قول یہ ہے کہ کھیت کی جو بھی پیداوار ہو خواہ غلے ہوں یا پھل وغیرہ اس میں دین مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے۔ دین کے باوجود زمین کی کل پیداوار پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا۔ اس لئے کہ عشر زمین کا فریضہ ہے نہ کہ اموال کا۔ لہٰذا مالک کے غنا اور فقر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ زمین سے جو بھی پیداوار ہوگی اس پر عشر یا نصف عشر واجب ہوگا۔ اسی وجہ سے

---

[1] بحوالہ بدائع الصنائع ج ۲ ص ۶

اراضی موقوفہ کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے۔ یہی قول احناف کا متفق ہے اور اسی پر عمل بھی ہے۔

"واما العشر فظاهر الرواية فلا لان العشر مؤنة الارض النامية كالخراج فلا يعتبر له تحقق المالك ولهذا لا يعتبر فيه اهلية المالك عندنا فيجب في الاراضي الموقوفة واراضي المكاتب" [۱]

دوسری صورت ۔ اس دین کی قسمیں جو مانع زکوٰۃ ہے

جو دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی بنیادی دو قسمیں ہیں۔ دین اللہ اور دین العبد۔ پھر ان میں سے ہر ایک کی مختلف صورتیں ہیں جو درج ذیل ہیں:۔

۱ ـــــ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ مثلاً زکوٰۃ "دین اللہ" ہے لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا بندہ ہے اس لئے کہ "اموال ظاہرہ" میں تو خود سلطان مطالبہ کرتا ہے۔ اور "اموال باطنہ" میں اس کے نائب یعنی اصحاب اموال۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ابتدائی دور تک تو "اموال ظاہرہ" اور "اموال باطنہ" دونوں کی زکوٰۃ کی وصولیابی حکومت وقت کی جانب سے ہوا کرتی تھی لیکن جب بعد میں اموال کی کثرت ہوئی لہٰذا زکوٰۃ کی وصولیابی اور تمام اموال کا تتبع دشوار ہوا تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے خود اصحاب اموال کو زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دے دیا۔ اس طرح اصحاب اموال سلطان کے نائب اور وکیل قرار پائے۔ اسی وجہ سے اگر اصحاب اموال "اموال باطنہ" کی زکوٰۃ خود ادا نہ کریں تو سلطان ان سے زکوٰۃ کی ادائیگی کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ [۲]

۲ ـــــ دین اللہ جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو۔ مثلاً حج، قربانی، نذر یا نماز، روزہ وغیرہ کا کفارہ کہ یہ سب دین اللہ ہیں لیکن ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کی ادائیگی پر نہ تو کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی قید و بند کیا جا سکتا ہے۔

۳ ـــــ دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ ہو۔ مثلاً ایسا دین ہے جس کے مالک کا بیٹا ہے اس طرح کے دین کا مطالبہ کرنے والا خود مالک یا اس کا نائب موجود ہے۔

۴ ـــــ دین العبد جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہ ہو۔ مثلاً کسی کے پاس مال حرام ہے لیکن اس کے

---

[۱] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۵۶

[۲] دیکھئے شامی ج ۲ ص ۵ کتاب الزکوٰۃ

مالک کا پتہ نہیں ہے تو ایسی صورت میں مال حرام "دین العبد" تو ہے لیکن اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے۔ اسی طرح "مہر مؤجل" کہ اس کی ادائیگی کا وقت موت یا طلاق ہے۔ ہندوستانی عرف و عادت کے مطابق بیوی موت یا طلاق سے قبل اپنے اس دین کا مطالبہ نہیں کر سکتی ہے۔ گویا کہ یہ دین ہی نہیں ہے۔ اس طرح مہر مؤجل دین العبد تو ہے لیکن کوئی عبد اس کا مطالبہ کرنے والا نہیں ہے۔

۵ــــ دین العبد اصالۃً ہو۔ یعنی براہ راست یہ دین اس کے ذمہ عائد ہو۔ کسی دوسرے کے دین کی ذمہ داری نہ لی ہو۔

۶ــــ دین العبد کفالۃً ہو۔ کسی پر دوسرے شخص کا قرض تھا۔ مقروض شخص اس کی ادائیگی میں ٹال مٹول کر رہا تھا۔ یا اس کی ادائیگی سے قاصر تھا۔ اور قرض دینے والا مسلسل اس سے مطالبہ کر رہا تھا اور پریشان کئے ہوا تھا۔ دوسرے شخص نے اس قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری لے لی۔ جس نے قرض کی ضمانت لی ہے اس پر یہ دین اصالۃً نہیں ہوگا بلکہ کفالۃً ہوگا۔ قرض دینے والا اپنے قرض کا مطالبہ ضمانت لینے والے سے بھی کر سکتا ہے۔

۷ــــ دین العبد معجل ہو۔ یعنی وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری ہو۔ دائن ہر وقت اپنے دین کا مطالبہ کر سکتا ہے۔

۸ــــ دین العبد مؤجل ہو۔ وہ دین جس کی ادائیگی فی الفور ضروری نہ ہو۔ دائن وقت سے پہلے اپنے دین کا مطالبہ نہیں کر سکتا ہے۔

یہ دین کی چند صورتیں ہوئیں۔ ان میں سے کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

تیسری صورت - کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے

تیسری اور اہم بحث یہ ہے کہ مذکورہ بالا دیون میں سے کون سا دین مانع وجوب زکوۃ ہے اور کون سا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء احناف کی یہ تصریحات موجود ہے کہ وہ دین مانع وجوب زکوۃ ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ موجود ہے۔ خواہ وہ دین اللہ ہو یا دین العبد۔ اصالۃً ہو یا کفالۃً اور مؤجل ہو یا معجل۔ لہذا زکوۃ جو دین اللہ لیکن مطالبہ کرنے والا بندہ یعنی سلطان یا اس کا نائب موجود ہے۔ یا کسی کے دین کی ضمانت لے لی ہو یا طویل الاجل دین ہو یہ مانع وجوب زکوۃ ہیں۔ علامہ علاء الدین الحصکفی در مختار میں لکھتے ہیں:

"فارغ عن دین له مطالب من جهة العباد سواء کان لله کزکاة وخراج او للعبد ولو کفالة او مؤجلا الخ" [1]

البتہ اگر ایسا دین ہے جس کا مطالبہ کرنے والا کوئی بندہ نہیں ہے وہ مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہے لہٰذا نذور، کفارات، صدقۂ فطر اور وجوب حج وغیرہ، یہ دیون مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوں گے کیوں کہ ان کا مطالبہ کرنے والا کوئی عبد نہیں ہے۔ ان کا اثر احکام آخرت میں ظاہر ہوگا یعنی ان کی ادائیگی پر ثواب اور ترک گناہ ہوگا۔ احکام دنیا میں ان کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوگا۔ اسی وجہ سے اس طرح کے دیون کی ادائیگی پر نہ تو جبر کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی عدم ادائیگی پر قید و بند۔ بدائع الصنائع میں ہے۔

"واما الديون التي لا مطالب لها من جهة العباد كالنذور والكفارات وصدقة الفطر ووجوب الحج ونحوها لا يمنع وجوب الزكوة لان اثرها في حق احكام الآخرة وهو الثواب بالاداء والاثم بالترك فاما لا اثر له في احكام الدنيا الا ترى انه لا يجبر ولا يحبس فلا يظهر في حق حكم من احكام الدنيا فكانت ملحقة بالعدم في حق احكام الدنيا" [2]

جہاں تک اس مال حرام کا تعلق ہے جس کے مالک کا پتہ نہیں ہے اصولاً اس کو مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کا مطالبہ کرنے والا کوئی عبد نہیں ہے لیکن یہ بھی مانع وجوب زکوٰۃ ہے اس کی تفصیل مال حرام کی بحث میں گزر چکی ہے۔

مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں

ایک بحث مہر کی رہ جاتی ہے کہ مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

اس سلسلہ میں فقہاء کے تین اقوال ملتے ہیں۔

۱۔ مطلقاً مہر مانع وجوب زکوٰۃ ہے خواہ معجل ہو یا مؤجل اور اس کی ادائیگی کا ارادہ ہو یا نہ ہو۔

۲۔ مہر معجل مانع ہے، مہر مؤجل نہیں۔

۳۔ اگر شوہر مہر ادا کرنے کا عزم رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

---

[1] الدر المختار علی ہامش رد المحتار ج ۲ ص ۵   [2] بدائع الصنائع ج ۲ ص ۶

علامہ شامی نے قہستانی کے حوالہ سے دوسرے قول کو راجح قرار دیا ہے: "زاد القہستانی عن الجواھر والصحیح انہ غیر مانع" [۱] جب کہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تیسرے قول کو راجح قرار دیا ہے۔ یعنی اگر شوہر مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں [۲]

راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اگر مہر معجل ہے تو یہ مانع وجوب زکوٰۃ ہے خواہ شوہر فی الفور ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اس لئے کہ عورت جس وقت چاہے اپنے مہر معجل کا مطالبہ کر سکتی ہے۔ اس میں طلاق اور موت سے قبل بھی مطالبہ کا حق ہے اسی طرح اگر مہر مؤجل ہے اور شوہر فی الحال مہر کی ادائیگی کا ارادہ رکھتا ہے تو مہر مؤجل بھی مانع وجوب زکوٰۃ ہوگا۔ البتہ اگر مہر مؤجل میں فی الحال ادائیگی کا کوئی ارادہ نہیں ہے تو چوں کہ ہندوستانی عرف وعادت کے مطابق موت یا طلاق سے قبل عورت کو مہر کے مطالبہ کا کوئی حق نہیں ہے اس لئے ایسی صورت میں مہر مؤجل مانع وجوب زکوٰۃ نہیں ہوگا۔

دین طویل الاجل بھی مانع زکوٰۃ ہے

چوں کہ فقہی تصریحات کے مطابق دین مؤجل بھی مانع زکوٰۃ ہے جیسا کہ اوپر در مختار وغیرہ کے حوالہ سے گزر چکا اس لئے سرکار کی جانب سے مختلف پروگراموں کے تحت ملنے والا قرض جس کی ادائیگی کے لئے ایک لمبی مدت مقرر ہوتی ہے، مانع وجوب زکوٰۃ ہے۔ پورے قرض کو منہا کرنے کے بعد بقیہ مال کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنیز جس کی مالیت مشترک ہے چند افراد کے درمیان، کسی خاص فرد کی ملک نہیں، اور مال مشترک کا حکم یہ ہے کہ اس کی مجموعی مالیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے بلکہ ہر شریک کے حصہ کا اعتبار کیا جاتا ہے۔ اسی پر شرعاً زکوٰۃ واجب ہوتی ہے جس کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب پہنچ جائے لہٰذا مذکورہ صورت میں وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں کمپنیز کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہیں ہوگا۔ بلکہ ہر فرد کے حصہ کا علیحدہ علیحدہ اعتبار کیا جائیگا جس کے حصہ کی مالیت بقدر نصاب ہو اسی پر زکوٰۃ شرعاً واجب ہوگی۔ مال مشترک پر زکوٰۃ کے سلسلہ میں ملاحظہ ہو

---

[۱] شامی ج ۲ ص ۵

[۲] دیکھئے امداد الفتاوی ج ۲ ص ۹-۱۰

درمختار اور شامی کی عبارت :

"(ولا تجب) الزکوۃ عندنا (فی نصاب) مشترک (من سائمۃ) ومال تجارۃ (وان صحت الخلطۃ فیہ) . . . . فان بلغ نصیب احدھما نصاباً زکاہ دون الآخر (درمختار) (قولہ فی نصاب مشترک) المراد ان یکون بلوغہ النصاب بسبب الاشتراک وضم احد المالین الی الآخر بحیث لا یبلغ مال کل منھما بانفرادہ نصاباً" [1]

ہیرے اور جواہرات پر زکوۃ

اصول یہ ہے کہ سونے اور چاندی یا مختلف ممالک کی مختلف کرنسیاں جو ثمن کی حیثیت اختیار کرچکی ہیں اور سائمہ جانوروں کے علاوہ کسی بھی مال میں جب تک اس کو تجارت کی نیت سے حاصل نہ کیا جائے زکوۃ واجب نہیں ہوتی۔ اسی وجہ سے فقہاء نے صراحتہً لکھا ہے کہ ہیرے، جواہرات مثلاً لعل، یاقوت، زمرد وغیرہ یا جائداد یا وہ جانور جن کو چارہ کھلایا جاتا ہے یا غلام یا کپڑے یا دیگر سامان وغیرہ میں شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہے الا یہ کہ ان کو تجارت کی نیت سے حاصل کیا جائے۔ لہٰذا مذکورہ صورت میں جو ہیرے اور جواہرات محض انکم ٹیکس سے بچنے کی غرض سے خرید کر محفوظ کردیئے جاتے ہیں، خریدتے وقت ان میں تجارت کی نیت نہیں ہوتی ان پر شرعاً زکوۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو خواتین ہیرے اور جواہرات کو محض تزئین اور آرائش کے لئے استعمال کرتی ہیں ان پر بھی زکوۃ واجب نہیں ہے۔ گرچہ ان ہیروں اور جواہرات کی قیمت ہزاروں اور لاکھوں روپے کیوں نہ ہوں۔

"لا زکوۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفاً اتفاقاً (الا ان تکون للتجارۃ) والاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیۃ التجارۃ الخ (درمختار) (قولہ والجواھر) کاللعل والیاقوت والزمرد وامثالھا درر عن الکافی (قولہ وان ساوت الفاً) فی نسخۃ الوفا (قولہ ماعدا الحجرین) . . . .

---

[1] شامی باب زکوۃ المال ج ۲ ص ۲۲

وما عدا ذكر كالجواهر والعقارات والمواشي العلوفة والعبيد والثياب والأمتعة ونحو ذلك من العروض ... [1]

اموال تجارت کی زکوۃ میں کس دن کی قیمت کا اعتبار ہوگا

مفتی بہ قول کے مطابق زکوۃ کی ادائیگی کے وقت سامانِ تجارت کی جو قیمت ہوگی اسی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا اور اسی حساب سے زکوۃ ادا کی جائے گی۔ سامانِ تجارت کی خرید و فروخت جس اعتبار سے ہوتی ہو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی یعنی اگر سامان کی خرید و فروخت تھوک بھاؤ سے ہوتی ہو تو تھوک بھاؤ سے اور اگر پھٹکر کے اعتبار سے ہوتی ہو تو اسی اعتبار سے قیمت لگائی جائے گی۔

"وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الأداء وفي السوائم يوم الأداء إجماعًا وهو الأصح وفي رد المحتار: وفي المحيط يعتبر يوم الأداء بالإجماع وهو الأصح ... وعليه فاعتبار يوم الأداء يكون متفقًا عليه عنده وعندهما" [2]

اراضی کی خرید و فروخت کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ غلہ حاصل کرنے کے لئے خریدی جائے اور ضرورت پڑنے پر فروخت بھی کی جائے۔ ایسی صورت میں اراضی کی مالیت پر زکوۃ واجب نہیں ہوگی بلکہ اس کی پیداوار پر عشر واجب ہوگا۔ اگر زمین عشری ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اراضی کی خرید و فروخت تجارت کی غرض سے ہو یعنی اراضی کی خرید و فروخت کا کاروبار ہو اور ضمنی طور پر غلہ بھی حاصل کیا جائے ایسی صورت میں جو اراضی سال گزرنے پر مالک کے پاس بچ جائے وہ اموالِ تجارت میں شمار ہوں گی اور ان اراضی کی مالیت پر زکوۃ واجب ہوگی۔ زکوۃ کی ادائیگی کے وقت ان اراضی کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا۔

شیئرز کی زکوۃ

شیئرز چونکہ تجارتی سرمایہ ہے اس لئے اس پر شرعاً زکوۃ واجب ہوگی۔ البتہ یہ مسئلہ قابلِ غور ہے کہ شیئرز کی زکوۃ کس اعتبار سے ادا کی جائے گی یعنی زکوۃ اصل رقم پر واجب ہوگی یا اصل رقم اور منافع

---

[1] رد المحتار کتاب الزکوۃ قبیل باب السائمۃ ج ۲ ص ۱۲   [2] شامی ج ۲ ص ۲۲

دونوں پر یا زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیئرز کی جو قیمت ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً ایک تجارتی کمپنی قائم ہے جس کی مالیت مثلاً ایک لاکھ کی ہے جس میں دس آدمی شریک ہیں۔ زید نے بھی دس ہزار روپئے جمع کیا اور دس ہزار روپئے کے بقدر کمپنی کا مالک ہوگیا۔ ایک سال کے بعد زید کو ایک ہزار روپئے نفع ملے۔ اب کمپنی میں زید کی مالیت گیارہ ہزار روپئے ہوگئی۔ اور اسی شیئر کی قیمت بازار میں مثلاً بارہ ہزار روپئے ہے۔ تو زکوٰۃ ان تینوں میں سے کس مالیت کے اعتبار سے واجب ہوگی؟

فقہی تصریحات اور اصول کے اعتبار سے زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت اصل رقم اور منافع کی جو مالیت ہے یعنی گیارہ ہزار روپئے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لئے کہ تجارتی اموال میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس میں بازار کی قیمت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ البتہ اگر کوئی شخص شیئرز کی خرید و فروخت کا کاروبار ہی کرتا ہے تو ایسی صورت میں زکوٰۃ کی ادائیگی کے وقت بازار میں اس شیئرز کی جو قیمت ہوگی اس قیمت کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

بونڈس کی زکوٰۃ

بونڈس جو درحقیقت قرض ہے جس کی ادائیگی کی مدت کمپنی یا حکومت کی جانب سے ۵ سال یا دس سال کی مقرر ہوتی ہے اس کی حیثیت "دین قوی" کی ہے۔ لہٰذا "دین قوی" کی طرح ہر سال اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ البتہ اس کی ادائیگی اس وقت لازم ہوگی جب کہ کم از کم نصاب زکوٰۃ کے ⅕ کے بقدر رقم وصول ہو جائے۔ قبضہ کے بعد گذشتہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

جوابات بابت سوالات زکوٰۃ

از: مولانا محمد رضوان القاسمی ناظم دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد

محور اول

۱ ——— جس تجارتی سامان کی قیمت پیشگی ادا کی جاچکی ہے مال خریدار کے قبضہ میں نہیں آیا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ علامہ حصکفی نے ایسے سامان تجارت پر زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی تصریح کی ہے فرماتے ہیں:

"لا فی ما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ" (۱)

۲ ——— کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی اس لیے کہ اس کو اس مال پر ملک تام حاصل ہو چکا ہے، ملک تام کے لیے فقہاء نے ملکیت رقبہ اور قبضہ کی شرط لگائی ہے، اور یہ دونوں باتیں یہاں مالک مکان کو حاصل ہیں ——— البتہ جو رقم مالک مکان کو بطور ڈپازٹ دی گئی ہے اور مدت کرایہ مکمل ہونے پر یہ رقم واپس ہوتی ہے اس کی حیثیت اگر کرایہ دار کی طرف سے امانت مانی جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے مالک مکان پر، چوں کہ اس کی حیثیت دین کی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے لیکن امانت اور اس زر ضمانت میں فرق یہ ہے کہ امانت کبھی بھی واپس لینا ممکن ہوتا ہے جب کہ یہاں کرایہ دار ہوتے ہوئے اس بات

---

(۱) درمختار علی ھامش رد ۲/۸

کا اختیار نہیں رکھتا کہ کرایہ کی رقم واپس لے، اس لیے رقم کی حیثیت "رہن" کی سی ہے، جیسے مال مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر واجب ہوتی ہے نہ مرتہن پر یہی اس کا بھی ہونا چاہیے، کیوں کہ رہن کی طرح اس زر ضمانت کی حیثیت بھی ایک ایسی رقم کی ہے جو وثیقہ کی حیثیت سے اس کے پاس رہتی ہے۔ علامہ شامی نے مال مرہون کے متعلق لکھا ہے:

"ولا في مرهون، أي لا على المرتهن لعدم الملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد" (۱)

۳۔۔۔۔ زکوٰۃ کا مخاطب شریعت نے افراد کو بنایا ہے نہ کہ اداروں کو، اس لیے دوسری عبادت کی طرح زکوٰۃ کا تعلق بھی افراد سے ہے، دوسرے زکوٰۃ کے لیے شریعت نے ملک بلکہ ملک تام کی شرط لگائی ہے اور دینی مدارس اور ایسے دوسرے خیراتی ادارے اپنے فنڈ کے مالک نہیں ہوتے بلکہ واقفین اور معاونین کی طرف سے محض وکیل ہوتے ہیں، اس لیے مدارس وغیرہ کے پاس جو مال ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

۴۔۔۔۔ مال حرام میں بنیادی طور پر زکوٰۃ واجب نہیں لیکن وہ مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ حرام و حلال مال کے درمیان شناخت ممکن نہ رہے تو دونوں کے مجموعہ پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، یہ فقہاء کا معروف و مسلم اصول ہے، اسی قاعدہ کا اطلاق مال رشوت اور بینک کے سود وغیرہ پر بھی ہوگا۔ شامی میں ہے:

"ولا زكوٰة في المغصوب والمملوك شراء فاسد والمراد بالمغصوب مالم يخلطه بغيره لعدم الملك" (۲)

۵۔۔۔۔ دین کی تین قسمیں کی گئی ہیں۔ دین قوی، دین وسط اور دین ضعیف۔

قرض کی رقوم اور سامان تجارت کا عوض جو باقی ہو دین قوی کہلاتا ہے، تجارتی سامان کے علاوہ کسی اور مال کی قیمت باقی ہو تو اس کو دین وسط کہتے ہیں، جو مال کسی مال کے بدلے میں باقی نہ ہو بلکہ کسی اور شئی کے عوض باقی ہو، جیسے مہر، بدل خلع، دیت وغیرہ تو اس کو دین ضعیف

---

(۱) ردالمحتار ۲/۷ (۲) ایضاً ۲/۸

کہتے ہیں ـــــــ فقہاء کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ دین قوی اور دین وسط میں تو زکوۃ واجب ہوتی ہے لیکن دین ضعیف میں اس وقت زکوۃ واجب ہوتی ہے جب کہ وہ قبضہ میں آجائے اور پھر اس پر سال گذر جائے دین قوی اور دین وسط میں قبضہ سے پہلے بھی زکوۃ واجب ہوتی ہے، فرق یہ ہے کہ دین وسط میں تمام رقم اکٹھی وصول ہونے کے بعد زکوۃ ادا کرے گا، اور دین قوی میں نصاب کا ایک خمس وصول ہونے پر"[1]

یہ زکوۃ واجب ہونے کے سلسلہ میں بنیادی اصول ہیں، ان کو سامنے رکھ کر دیون کے سلسلہ میں زکوۃ کے وجوب اور عدم وجوب کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ

پراویڈنٹ فنڈ کی حیثیت اجرت کی ہے اس پر زکوۃ واجب ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں ماضی قریب کے اکابر علماء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ سے دو متضاد رائیں منقول ہیں، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے حضرت تھانویؒ ہی کی ایماء پر اس مسئلہ میں مزید تحقیق فرمائی اور جس نتیجے پر پہونچے وہ انہیں حضرات کے الفاظ میں یوں ہے:

"الغرض پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ تو دین قوی میں داخل نہیں ہو سکتا، اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے، جب تک کہ فقہاء کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی امام ابو حنیفہؒ دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر امام ابو حنیفہؒ زکوۃ واجب نہیں ہے۔" [2]

راقم سطور کو اس تحقیق سے اتفاق ہے اور یہی رائے راجح معلوم ہوتی ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ میں وصول و قبضہ سے پہلے زکوۃ واجب نہیں۔

حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ ان اشیاء کو کہا جاتا ہے جو انسان کی شخصی ضروریات کی ہوں، علامہ طحطاوی

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۵ (۲) امداد الفتاوی ۲/۱۴۸

نے حاجت اصلیہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے :

" کثیاب المحتاج إلیہا لدفع الحر والبرد وکالنفقة و دور السکنی وآلات الحرب والحرفة واساس المنزل و دواب الرکوب وکتب العلم لأھلہا " (۱)

ظاہر ہے جب " حاجت اصلیہ " کا تعلق انسانی ضروریات سے ہے تو مختلف افراد، مختلف احوال اور مختلف طبقوں اور پیشوں کے اعتبار سے حاجت اصلیہ کا تعین عمل میں آئے گا۔

دین سے محفوظ ہونا

دین احنفیہ کے یہاں زکوٰۃ واجب ہونے میں مانع ہے اور اس کا مقصد مدیون کو حرج و تنگی سے بچانا ہے، لیکن آج کل جو ترقیاتی طویل الاجل قرض دیے جاتے ہیں، ان سے مدیون زبردست معاشی فائدہ اٹھاتا ہے اور اسے ہر سال ایک معمولی قسط ہی ادا کرنی پڑتی ہے اس طرح اگر پورا دین اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جاتا ہے تو فقراء حق سے محروم ہوتے ہیں، حالاں کہ ان کی زکوٰۃ ادا کرنے میں مدیون کے لیے ایسا حرج نہیں ہے جس کو شریعت دفع کرنا چاہتی ہے اس لیے یہ درمیانی رائے بہت مناسب ہے کہ ہر سال اس کو جو قسط ادا کرنی ہے اتنا حصہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور باقی دین مستثنیٰ کیے بغیر اس کے مال میں زکوٰۃ واجب قرار دی جائے۔

کمپنی پر زکوٰۃ

حنفیہ کے یہاں اموال میں شرکت اور خلط کا کوئی اثر نہیں، یہ متفق علیہ قاعدہ ہے، دوسرے فقہاء کے یہاں حیوانات میں شرکت زکوٰۃ کے واجب ہونے اور نہ ہونے میں مؤثر ہوتا ہے، لہٰذا کمپنی کے مجموعی حصص پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، بلکہ کمپنی کے حصہ داروں میں جو مالک نصاب ہوں وہ اپنی شخصی اور ذاتی حیثیت سے زکوٰۃ ادا کریں گے۔

---

(۱) طحطاوی /۳۸۹

ہیرے اور جواہرات میں زکوٰۃ

شریعت میں اموال زکوٰۃ منصوص ہیں اس میں قیاس و اجتہاد کو دخل نہیں، اس لیے ہیرے اور جواہرات جس قدر بھی ہوں اور جس نیت سے رکھے جائیں ان میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

فتاویٰ عالمگیری میں ہے،

" الیواقیت واللآلی والجواھر فلا زکوٰۃ فیہا وان کانت حلیاً إلا ان تکون للتجارۃ " (۱۸۰/۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

مال تجارت میں کس قیمت کا اعتبار کیا جائے گا؟ اس میں امام ابوحنیفہ رح اور صاحبین رح کے درمیان اختلاف ہے۔ صاحبین رح کے نزدیک زکوٰۃ کی ادائے گی کے دن کا امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک اس دن کا جس دن کہ زکوٰۃ واجب ہوئی اور نصاب پر سال مکمل ہوا، اسی پر فتویٰ ہے۔ عالمگیری میں ہے،

" ان أدی القیمۃ یعتبر قیمتہا یوم الوجوب " (۱۸۰/۱)

لہٰذا جس تاریخ کو نصاب پر حولان حول ہوتا ہے تمام سامان تجارت میں بہ شمول پلاٹس اراضی اسی دن کی قیمت معتبر ہوگی نہ مستقبل میں متوقع قیمت فروخت کا اعتبار ہوگا۔

شیر اور بانڈس کی زکوٰۃ

تجارتی فنڈس کے شیرز بھی مال تجارت کے حکم میں ہیں، لہٰذا اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور زکوٰۃ میں اس کی قیمت کا اعتبار ہوگا، بلکہ حولان حول کے وقت مارکیٹ میں اس کی جو قیمت رہی وہی معتبر ہوگی اور اسی لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہوگی ——— باؤنڈز کی حیثیت قرض کے سند کی ہے لہٰذا جو رقم اس کے عوض ادا کی گئی ہے اس کا دین ہونا ظاہر ہے اور فقہا کی اصطلاح میں یہ دین قوی کے زمرہ میں آتا ہے، اس لیے اس پر ضرور ہی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

———— ۞ ————

زکوٰۃ

از:- مولانا اعجاز احمد اعظمی، مدرسہ شیخ الاسلام شیخوپور
اعظم گڈھ

زکوٰۃ اسلام کے پانچ بنیادی فرائض میں سے ایک ہے جو صاحب نصاب مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے، اس کے احکام و مسائل ——— جو قرآن و سنت سے ثابت ہیں ——— کو مدنظر رکھتے ہوئے فقہاء نے اس کی درج ذیل تعریف کی ہے:

"تملیک جزء مال عینہ الشارع من مسلم فقیر غیر ہاشمی ولا مولاہ لله تعالیٰ" (۱)

کسی مسلمان فقیر کو جو ہاشمی نہ ہو، نہ اس کے موالی میں سے ہو، مال کے ایک حصہ کا جسے شریعت نے متعین کیا ہے اللہ کے واسطے مالک بنانا۔

اور اس کا سبب فرضیت یہ تحریر کیا ہے کہ

"ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین لہ مطالب من جہۃ العباد وعن حاجتہ الاصلیۃ نام ولو تقدیرا" (۲)

ایسے نصاب کی ملکیت تامہ جس پر سال پورا ہو چکا ہو اور اس پر کوئی ایسا دین نہ ہو جس کا مطالبہ بندوں کی جانب سے ہو، نیز اس کی حاجت اصلیہ سے فارغ ہو اور وہ نامی ہو، اگرچہ حکماً ہی ہو۔

---

(۱) درمختار مع رد المحتار ۲/۲۵۶ مطبوعہ کراچی (۲) حوالۂ سابق ۲/۲۵۹

سوال نامے کے دونوں محور کا جواب اسی سبب کی تفصیل میں مضمر ہے، اس میں چند باتیں قابل غور ہیں:

(۱) ملک تام (۲) نصاب حولی (۳) فراغت عن الدین (۴) فراغت عن الحاجۃ الاصلیۃ (۵) نما۔

یہی پانچ نکتے ہیں، جن پر اس مجلس میں غور کرنا ہے۔

سوال:۔ ملک تام سے کیا مراد ہے؟

"ان المراد بالملك التام المملوكة يدا ورقبة"(۱)

ملک تام سے مراد یہ ہے کہ شیٔ کا مالک ہو اور قبضہ بھی اسی کا ہو، اگر قبضہ نہ ہو تو ملکیت ناقص ہے، یا قبضہ ہو لیکن شیٔ کا مالک نہ ہو تو یہ بھی ناقص ہے، لیکن بعض اوقات ملکیتِ ناقصہ، ملکِ تام کے حکم میں ہوتی ہے، اس کی تفصیل دین کے اقسام کے سلسلے میں آرہی ہے۔

سوالات کے جواب

(۱) مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کردی گئی ہو، اور مال ابھی وصول نہ ہوا ہو، بحرالرائق میں محیط کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس میں زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی، لیکن ادائیگی کا وجوب قبضہ کے بعد ہوگا اور سالہائے ماضی کی بھی دینی ہوگی۔

"ذكر في المحيط في بيان اقسام الدين ان المبيع قبل القبض لايكون نصابا لان الملك فيه ناقص لافتقاد اليد والصحيح انه يكون نصابا لانه عوض عن مال كانت يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء اليه على العوض فتعتبر يده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعا اه. فعلى هذا القول لاتجب الزكوة معنا قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زكوته فيما مضى كالدين القوي"(۲)

---

(۱) درمختار مع ردالمحتار ۲/۲۵۹ (۲) بحرالرائق ۲/۲۰۸، ۲۰۹

محیط میں مذکور ہے ـــــ اقسامِ دین کے بیان میں ـــــ کہ مبیع، قبضہ سے پہلے نصاب نہیں ہوتا۔ کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے اور صحیح یہ ہے کہ وہ نصاب ہو جاتا ہے، اس لیے وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت تھا اور اسے عوض پر قبضہ کرنا ممکن ہے۔ پس اس کا قبضہ نصاب پر معتبر مانا جائے گا، کیوں کہ شرعاً وہ قبضہ پر قدرت رکھتا ہے اس بنیاد پر فقہاء نے یہ جو لکھا ہے کہ زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قبضہ سے پہلے زکوٰۃ کی ادائے گی واجب نہ ہوگی، لیکن قبضہ کے بعد ماضی کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی جیسا کہ دینِ قوی[1] میں ہوتا ہے۔

اور قیمت جو پیشگی ادا کر دی گئی، اس پر بائع کی ملک تام ہو گئی، اس لیے اس کی زکوٰۃ بائع کے ذمے ہوگی، آگے ایک مسئلہ اجارہ کا آرہا ہے اسی میں اس مسئلہ کی دلیل بھی موجود ہے۔ فانتظر۔

(۲) کرایہ کی مد میں دی گئی رقم جو پیشگی ادا کر دی گئی ہو، اس کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی جس نے رقم وصول کی ہے، کیوں کہ وہ اس پر ملکیتِ تام رکھتا ہے۔

"وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارة الطویلة التی تعارفها اهل البخاری ان الزکاة فی الاجرة المعجلة تجب علی الآجر لانه ملکه قبل الفسخ" (۲)

امام ابوبکر محمد بن الفضل بخاری نے ذکر کیا ہے کہ اجارہ طویلہ جس کا تعارف اہلِ بخاری میں ہے، اس میں پیشگی دی ہوئی اجرت کی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی، کیوں کہ جب تک اجارہ فسخ نہ ہو، اس رقم کا مالک وہی ہے۔

اور جو رقم ڈپوزٹ ہوتی ہے اور بعد میں واپس کر دی جاتی ہے وہ، بحکم رہن ہے[*]۔ اور رہن کے

---

(۱) دینِ قوی کی تعریف آگے آرہی ہے۔ (۲) بدائع الصنائع ۶/۲

* ولو استأجر دارا او شیئا واعطی بالاجر رهنا جاز۔ (فتاوی هندیه ۴۳۶/۵)

اگر کسی نے مکان کرایہ پر لیا یا کوئی اور چیز اور اجرت کے عوض کوئی چیز بطور رہن کے دی تو جائز ہے۔
ظاہر یہی ہے کہ ڈپوزٹ رقم جو بعد میں واپسی کے ساتھ مشروط ہوتی ہے وہ رہن اجرت ہی بنے گی۔ خود شئی مستاجر کے عوض تو رہن رکھنا درست نہیں ہے کیوں کہ وہ امانت ہے پس وہ اجرت ہی کے عوض تسلیم کیا جائے گا۔

متعلق تصریح ہے کہ اس میں زکوٰۃ سرے سے واجب ہی نہیں ہوتی، نہ راہن پر نہ مرتہن پر۔

"ولا في مرهون بعد قبضه. قال الشامي: اي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد واذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضية." (1)

اور نہ مال مرہون میں قبضے کے بعد، اس پر علامہ شامی تحریر فرماتے ہیں: یعنی نہ مرتہن پر ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے اور نہ راہن پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور جب راہن اس شئی مرہون کو واپس لے لیگا، جب بھی سالہائے گذشتہ کی زکوٰۃ نہیں ادا کرے گا۔

(۲) جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو، جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔

"فلا زكوة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك" (2)

وقف کے جانوروں اور فی سبیل اللہ چھوڑے ہوئے گھوڑوں میں زکوٰۃ نہیں ہے، کیونکہ ان پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

(۳) وہ مال جو کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آتا ہے، مثلاً رشوت کا مال، بینک کا سود وغیرہ، اگر یہ حرام مال علیحدہ ہے، حلال مال کے ساتھ شامل نہیں ہوا ہے تو اس پر اس کی ملکیت نہیں، اگرچہ قبضہ ہے، اس لیے اگر مالک معلوم ہے تو اسے واپس کرنا واجب ہے اور اگر مالک نامعلوم ہے تو پورے کو فقراء و مستحقین میں تقسیم کردینا واجب ہے، پس اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اور اگر اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کر دیا ہے تو اس خلط کی وجہ سے وہ اس کا مالک قرار دیا جائے گا، لیکن چونکہ دوسرے کا مال اس کی ملکیت میں غلط طور سے شامل ہو گیا ہے، اس لیے اس مقدار کا وہ ضامن ہوگا، گویا وہ اتنے کا مدیون ہے، اگر بقدر دین اور بقدر ضمان علیحدہ کرنے کے بعد نصاب کے برابر مال موجود ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور بقدر نصاب نہیں بچتا تو چونکہ یہ مدیون ہے اس لیے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

---

(۱) فتاوی شامی ۲/۲۶۳

(۲) حوالہ سابق ۲/۲۵۹

"وفي القنية: لو كان الخبيث نصابا لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه ومثله في البزازية .... وفي الفصل العاشر من التاترخانية عن فتاوى الحجة من ملك اموالا غير طيبة او غصب اموالا وخلطها ملكها بالخلط ويصير ضامنا وان لم يكن له سواها نصاب فلا زكوة عليه فيها وان بلغت نصابا لانه مديون ومال المديون لا ينعقد سببا لوجوب الزكوة عندنا" (۱)

قنیہ میں ہے کہ اگر مال خبیث بقدر نصاب ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیونکہ وہ کل واجب التصدق ہے پھر جب کہ وہ کل معلوم نہ ہو، اس لیے اس کے کچھ حصے کے صدقہ کا کوئی فائدہ نہیں، اور اسی طرح بزازیہ میں بھی ہے .... اور فتاوی تاتارخانیہ کی دسویں فصل میں فتاوی الحجہ سے نقل کیا ہے کہ جو شخص مال کا مالک ہو یا اس نے کوئی مال غصب کیا اور اسے اپنے مال کے ساتھ مخلوط کر دیا تو خلط کی وجہ سے وہ مالک ہو گیا لیکن اس کا ضمان دینا ہوگا اور اگر اس کے سوا اس کے پاس بقدر نصاب مال نہیں ہے تب تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اگرچہ یہ مال بقدر نصاب ہو کیونکہ وہ مدیون ہے اور مدیون کا مال ہمارے نزدیک وجوب زکوٰۃ کا سبب نہیں ہوتا۔

(۵) دین کی زکوٰۃ مدیون پر نہیں واجب ہوتی، ہاں اگر مدیون کے پاس دین سے فاضل نصاب موجود ہے تو اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ دین کے ادا کرنے کی قدرت کے باوجود اگر کوئی شخص ٹال مٹول کر رہا ہے تو ظلم ہے اس کے خلاف دنیا میں عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے اور آخرت میں خدا کے حضور ... کرنا چاہیے لیکن اس کی وجہ سے زکوٰۃ کے مسئلہ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، زکوٰۃ کوئی سزا نہیں ہے کہ اس کے اس جرم کے بدلے نافذ کی جائے، یہ تو ایک عبادت ہے جو خلوص دل اور انشراح صدر کے ساتھ ادا کی جانی چاہیے۔

دین کی اقسام:

وصولیابی کی امید اور ناامیدی کے اعتبار سے دین کی تین قسمیں ہیں:

---

(۱) شامی ۲/۲۶

دین قوی۔ دین متوسط۔ دین ضعیف۔

دین قوی: وہ دین جو قرض یا مال تجارت کے عوض میں لازم ہوا ہو۔

دین متوسط: وہ دین جو قرض اور مال تجارت کے علاوہ کسی اور مال کے عوض لازم ہوا ہو، جیسے استعمالی کپڑوں، خدمت کے غلاموں اور رہائشی مکان کی قیمت۔

دین ضعیف: ایسا دین جو کسی مال کے عوض نہ لازم ہوا ہو، جیسے مہر، وصیت اور بدل خلع وغیرہ۔

"قسم ابوحنیفة الدین علی ثلثة اقسام قوی وھو بدل القرض ومال التجارة ومتوسط وھو بدل مالیس للتجارة کثمن ثیاب البذلة وعبد الخدمة ودار السکنی وضعیف وھو بدل مالیس بمال کالمھر والوصیة وبدل الخلع والصلح عن دم العمد والدیة وبدل الکتابة والسعایة۔"[1]

امام ابوحنیفہؒ نے دین کی تین قسمیں قرار دی ہیں۔ قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت ہے۔ اور متوسط وہ ایسے مال کا بدل ہے جو تجارت کے لیے نہ ہو، جیسے استعمال کے کپڑے، خدمتگار غلاموں اور رہائشی مکانات کی قیمت۔ اور ضعیف اور وہ ایسی چیز کا بدل ہے جو مال نہ ہو، جیسے مہر، وصیت، بدل خلع، صلح عن دم العمد، دیت، بدل کتابت اور سعایت۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ جب اس پر سال تمام ہوگا تو زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اس کی ادائے گی کا وجوب اس وقت مؤخر ہوگا، جب تک اس میں چالیس درہم کے بقدر دین وصول نہ ہو جائے، جب اتنی رقم مل جائے گی تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنی ضروری ہوگی، اور اس کے بعد جتنی وصول ہوتی جائے گی، اسی کے حساب چالیسواں حصہ واجب ہوگا۔

اور دین متوسط میں اس وقت تک وجوب ادا نہ ہوگا جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ ہو جائے لیکن جب اتنا وصول ہو جائے گا تو سالہائے گزشتہ کی بھی زکوٰۃ دینی ہوگی، اور دین ضعیف میں زکوٰۃ اس وقت تک واجب نہ ہوگی، جب تک بقدر نصاب دین وصول ہو کر اس پر سال نہ گزر جائے۔

---

[1] بحر الرائق ۲/۲۰۷

"فغی القوی تجب الزکوٰۃ اذا حال الحول ویتراخی القضاء إلی أن یقبض اربعین ففیها درھم وکذا فیما زاد بحسابہ وفی المتوسط لاتجب مالم یقبض نصابا ویعتبر لما مضی من الحول فی صحیح الروایۃ وفی الضعیف لاتجب مالم یقبض نصابا ویحول الحول بعد القبض علیہ"(۱)

پس دین قوی میں جب سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ واجب ہوگی اور ادائے گی چالیس درہم وصول ہونے تک مؤخر رہے گی، جب اتنا وصول ہو جائے گا تو ایک درہم واجب ہوگا، اور اسی طرح زائد میں اس کے حساب سے اور دین متوسط میں اس وقت تک واجب نہ ہوگی جب تک نصاب نہ وصول کرلے اور اس میں سال گزشتہ کا بھی اعتبار ہے یہی صحیح روایت ہے اور دین ضعیف میں جب تک نصاب کے بقدر وصول نہ کرلے، اور اس پر قبضہ کے بعد سال نہ گزر جائے، اس وقت تک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

(۶) سرکاری محکموں اور بعض پرائیوٹ کمپنیوں کے ملازمین کی تنخواہوں میں سے ایک حصہ وضع کرکے ان کے محفوظ کھاتے میں جمع کردیا جاتا ہے اور کچھ فی صد سرکار اس میں اضافہ کرتی ہے جس کو پراویڈنٹ فنڈ کہتے ہیں، اس رقم کے دو حصے ہیں ایک حصہ اصل تنخواہ والا، دوسرا جو اس پر اضافہ ہوا ہے۔

اضافہ کی زکوٰۃ کا تو کوئی سوال ہی نہیں، اس لیے کہ اس پر نہ اس ملازم کی ملکیت وارد ہے اور نہ وہ بحکم دین ہے۔ بحکم دین اگر کوئی چیز ہے تو وہ اصل تنخواہ والا حصہ ہے، اس لیے اس حصہ اضافی کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب کہ اس پر قبضہ ہو جائے اور اس پر سال گزر جائے۔

البتہ اصل تنخواہ میں وضع شدہ رقم کے بارے میں غور کرنا چاہیے کہ آیا وہ دین ہے؟ اگر ہے تو دین کی تین قسموں میں سے کس میں داخل ہے۔ امام سرخسیؒ نے مبسوط میں اجرت کی حیثیت تفصیل کے ساتھ لکھی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

(۱) بحر الرائق ۲/۲۰۷

وفي الاجرة ثلث روايات عن ابي حنيفة، في رواية جعلها كالمهر لانها ليست ببدل من المال لانها بدل من المنفعة وفي رواية جعلها كبدل ثياب البذلة لان المنافع مال من وجه لكنه ليس بمحل لوجوب الزكوة فيه والاصح ان اجرة دار التجارة او عبد التجارة بمنزلة ثمن متاع التجارة كلما قبض منها اربعين تلزمه الزكوة اعتبار البدل المنفعة ببدل العين۔(۱)

اجرت کے سلسلے میں امام ابوحنیفہ سے تین روایتیں ہیں۔ ایک روایت میں اس کو مثل مہر کے قرار دیا ہے، اس لیے کہ یہ مال کا بدل نہیں ہے کیوں کہ منفعت کا بدل ہے اور ایک روایت میں اسے استعمالی کپڑوں کی قیمت کے مانند ٹھہرایا ہے، کیوں کہ منافع ایک طرح کے مال ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کے محل نہیں ہیں، اور اصح یہ ہے کہ گھر یا غلام جو برائے تجارت ہو اس کی اجرت اور کرایہ سامان تجارت کی قیمت کی طرح ہے جب چالیس درہم وصول ہوں گے ان کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اس میں بدل منفعت کو بدل عین کے مشابہ قرار دیا گیا ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ کرایہ اور اجرت دین میں داخل ہیں، اور اصح روایت کے مطابق جو حکم اس شئی کا ہے جس کی اجرت حاصل ہوئی ہے وہی اجرت کی بھی ہے، اگر مال تجارت کی اجرت حاصل ہوئی تو اس میں اسی طرح زکوٰۃ واجب ہے جس طرح مال تجارت میں واجب ہوتی۔ گویا یہ دین قوی ہے اور اگر استعمالی سامانوں کی اجرت حاصل ہوئی تو اس کا قیاس انھیں پر ہے۔

حوالہ بالا میں جو دوسری روایت ہے، منحۃ الخالق حاشیہ بحرالرائق میں محیط کے حوالے سے اسے ظاہر روایت قرار دیا ہے۔ غرض پہلی روایت کی بنیاد پر اجرت دین ضعیف میں داخل ہے اور دوسری روایت کی روشنی میں وہ دین متوسط میں شامل ہے، اور صحیح روایت کے پیش نظر وہ اصل مال مستاجر کے تابع ہے، لیکن واضح ہو کہ یہ تینوں روایتیں ایسی چیزوں کے کرایہ اور اجرت کے احکام بتاتی ہیں، جو خود مال ہیں۔ مثلاً مکان، غلام وغیرہ، لیکن یہاں جو اجرت اور تنخواہ زیر بحث ہے وہ کسی مال کی نہیں ہے بلکہ یہ بدل ہے

---

(۱) مبسوط ۱۹۶-۱۹۵/۲

خدمت حر کی، اور حر بہ تصریح فقہا، مال نہیں ہے، لہٰذا اس کی خدمت بھی مال نہیں ہو سکتی، پس یہ تنخواہ غیر مال کی بدل ہے اس لیے یہ دین ضعیف ہے، اور دین ضعیف کا حکم معلوم ہے کہ اس میں قبضہ کے بعد سال گزرنے کے بعد زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، پس پراویڈنٹ فنڈ میں خواہ اصل تنخواہ کی وضع شدہ رقم ہو یا اضافی رقم زکوٰۃ اسی وقت واجب ہوگی جب وہ بہ قدر نصاب قبضہ میں آجائے اور اس پر سال گزر جائے یا اگر اس کے علاوہ نصاب موجود تھا تو یہ رقم اس میں شامل ہو کر اصل نصاب پر سال پورا ہونے کے بعد اسی کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ نکل جائے گی۔ واللہ اعلم۔

دوسری شرط "نماء"

نماء، کے لغوی معنی بڑھنے کے ہیں۔ علامہ شامیؒ فرماتے ہیں:

النماء فی اللغۃ بالمد الزیادۃ والقصر بالھمزۃ خطأ یقال نمی ینمی نماء وینمو نموا وانماہ اللہ تعالیٰ کذا فی المغرب۔ (۱)

نماء، بالمد لغت میں بڑھوتری کے معنی میں ہے اور بغیر مد کے ہمزہ کے ساتھ غلط ہے، کہا جاتا ہے، نمی ینمی نماءً (مد) وینمو نموا (ن) اور انماہ اللہ تعالیٰ۔ کذا فی المغرب۔

اور شریعت کی اصطلاح میں بھی نماء کا وہی معنی ہے جو لغت میں ہے، البتہ یہاں اس کی دو قسمیں کردی گئی ہیں، اول یہ کہ حقیقۃً اضافہ ہو، جیسے جانوروں میں توالد و تناسل کے ذریعے بڑھوتری ہوتی رہتی ہے، اسی طرح تجارت کے واسطے سے مال میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ اضافہ تقدیراً اور حکماً ہو جیسے سونا اور چاندی کہ جب یہ اپنی ملک اور قبضہ میں ہے تو شریعت کی نگاہ میں اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے کیوں کہ اس پر قدرت حاصل ہے، یہ مال نامی تقدیراً ہے، یعنی ظاہراً بڑھتا ہوا نظر نہیں آتا مگر اسے نامی تسلیم کیا گیا ہے۔

وفی الشرع ھو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات والتقدیری تمکنہ من الزیادۃ بکون المال

---

(۱) شامی: ۲/۲۶۳

فی یدہ او ید نائبہ۔(۱)

شریعت میں نما کی دو قسمیں ہیں، حقیقی اور تقدیری۔ حقیقی وہ نما ہے جو توالد و تناسل اور تجارتوں کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ نما پر قدرت ہو، اس طرح کہ مال خود مالک کے قبضہ میں ہو یا اس کے نائب کے۔

زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے مال نامی کا نصاب ہونا شرط ہے، اگر کسی کے پاس نما کی دونوں قسموں کے اعتبار سے کوئی مال نامی نہیں ہے، اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ مثلاً کسی کے پاس زمینیں بہت ہیں یا مکانات ہیں یا کارخانہ ہے، جس میں مشینیں قیمتی قیمتی ہیں، تو گو اس کے پاس مالیت بہت زیادہ ہے لیکن ان میں سے کوئی چیز مال نامی نہیں ہے اس لیے ان کا حساب نصاب زکوٰۃ میں نہ ہوگا۔

تیسری شرط حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجتِ اصلیہ کے دائرہ میں وہ چیزیں آتی ہیں جن کا تعلق انسان کے جان و مال کی حفاظت اور بچاؤ سے ہے، مثلاً نفقہ، رہائشی مکان، لڑائی کے اوزار، گرمی اور سردی کی ضرورت کے کپڑے، آلاتِ حرفت، گھر کے سامان، سواریاں اور ان کی حفاظت کے گھر مثلاً اصطبل، گیراج وغیرہ اور اہل علم کے واسطے کتابیں۔

الحاجة الأصلية هي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد او تقديرا كالدين وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها۔(۲)

حاجتِ اصلیہ وہ چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دفع کرتی ہیں، حقیقتاً جیسے نفقہ، رہائشی مکانات، آلاتِ حرب اور گرمی و سردی کے لباس، یا تقدیراً جیسے آلاتِ حرفت، گھریلو سامان سواری کے جانور اور اہل علم کے لیے کتابیں۔

حاجتِ اصلیہ میں مزید کچھ اور تفصیلات ہیں، جنھیں فقہا اپنی کتابوں میں ذکر کرتے ہیں، مثلاً

---

(۱) شامی ۲/۲۶۳ (۲) شامی ۲/۲۶۲

استعمالی کپڑے کتنی تعداد میں ہوں، رہائشی مکان کس مقدار کا ہو، سواری کے جانور کتنے ہوں کتابوں کے کتنے نسخے ہوں، تو حاجت اصلیہ میں داخل ہوں گے اور کتنے اس سے زائد ہوں گے، لیکن زکوٰۃ کی بحث میں ان تفصیلات کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ یہاں سرے سے حاجتِ اصلیہ سے فراغ کی قید وجوب میں مؤثر نہیں ہے، کیوں کہ زکوٰۃ کے لیے نصاب نامی شرط ہے اور نصاب نامی بہرحال حاجتِ اصلیہ سے فاضل ہوگا، تو یہ قید درحقیقت کسی احتراز کے لیے نہیں ہے، محض بیان واقعہ یا اہتمام ذکر کے لیے ہے چنانچہ علامہ شامی رح نے لکھا ہے کہ:

فان الحوائج الاصلیة اعم من الدین والنامی اعم منها۔ (۱)

یعنی حوائج اصلیہ دین سے عام ہیں اور نامی ہونا حوائج اصلیہ سے عام ہے، تو جب ایک عام قید اور شرط کسی حکم میں لگا دی گئی تو اس کے ضمن میں خاص خود بخود آگیا، اب اس کے ذکر کی ضرورت احتراز کے لیے نہیں ہوتی، ہاں کسی خصوصیت کے اہتمام کی وجہ سے ہو تو اور بات ہے، پس ثابت ہوگیا کہ مال کا نامی ہونا بنیادی شرط ہے، حاجت اصلیہ سے فراغ کی شرط صرف اظہار واقعہ کے لیے ہے چنانچہ علامہ شامی اس کی مثال میں ذکر کرتے ہیں:

لانہ یخرج منہا کتب العلم لغیر اهلها ولیس من الحوائج الاصلیة۔ (۲)

دیکھیے غیر اہل علم کے پاس کتابیں حوائج اصلیہ میں سے نہیں ہیں، لیکن چوں کہ مال نامی نہیں ہے، اس لیے ان پر زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

دین سے محفوظ ہونے میں فقہاء نے طویل الاجل اور قصیر الاجل کی کوئی تفصیل نہیں بیان کی ہے، اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ دین مطلقاً خواہ وہ طویل الاجل ہو یا قصیر الاجل، نصاب میں سے پورا وضع کیا جائے گا، دیکھیے مہر مؤجل کتنی طویل المیعاد ہوتی ہے، مگر فقہاء نے اسے بھی موانع

---

(۱) شامی ۲/۲۶۳ (۲) بدائع الصنائع ۲/۶

زکوٰۃ میں سے شمار کیا ہے، بعض بدائع الصنائع میں بعض مشائخ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ مہر موجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

قال بعض مشائخنا ان الموجل لایمنع لانہ غیر مطالب بہ عادۃ۔[1]

ہمارے بعض مشائخ نے فرمایا کہ مہر موجل مانع زکوٰۃ نہیں ہے کیوں کہ عرفاً اس کا مطالبہ نہیں ہوتا۔

اس کی علت لانہ غیر مطالب بہ عادۃ پر نظر کی جائے تو بظاہر اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ سالاً واجب الاداء قسط کے بقدر ہی ہر سال دین وضع کیا جائے، کیوں کہ عادۃً اس سے زائد کا مطالبہ اس سال نہیں ہوتا، نیز یہ کہ امام شافعیؒ کے نزدیک کوئی بھی دین مانع زکوٰۃ نہیں ہوتا۔ اس خیال سے اگر احتیاطاً صرف قسط واجب الاداء کے بقدر وضع کر کے باقی کی زکوٰۃ ادا کی جائے تو مستحسن معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

کسی تجارت میں اگر متعدد شرکاء ہوں تو مجموعی سرمایہ پر مجموعی طور سے زکوٰۃ کا وجوب نہ ہوگا بلکہ انفراداً ہر ایک پر علیحدہ زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، جب کہ اس کا حصہ بقدر نصاب ہو یا اگر کمپنی میں تو بقدر نصاب نہ ہو، لیکن اس کے پاس اس کے علاوہ مال زکوٰۃ موجود ہو، تو اس کے ساتھ شامل کر دیا جائے گا۔

فاذا کانت مشترکۃ بین اثنین فقد اختلف فیہ قال اصحابنا انہ یعتبر فی حال الشرکۃ مایعتبر حال الانفراد وھو کمال النصاب فی حق کل واحد منھما فان کان نصیب کل واحد منھما یبلغ نصابا تجب الزکوٰۃ والا فلا۔[2]

بہر حال جب تجارت مشترک ہو تو اس میں اختلاف ہے، ہمارے اصحاب نے فرمایا کہ شرکت کی حالت میں بھی وہی چیز معتبر ہے جو انفراد کی حالت میں ہے اور وہ نصاب تام ہے ہر ایک کے حق میں، پس اگر ہر ایک کا حصہ نصاب کے بقدر ہے تب تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔

---

(۱) شامی ۲/۲۶۲ (۲) شامی ۲/۲۶۲

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات اموال نامیہ میں سے نہیں ہیں۔ اگر بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔

لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواھر وان ساوت الفا اتفاقا الا ان تکون للتجارۃ (۱)

(موتیوں اور جواہرات میں بالاتفاق زکوٰۃ نہیں ہے گو وہ ہزار کے برابر ہوں مگر یہ کہ تجارت کے لیے ہوں تب زکوٰۃ واجب ہوگی)۔

تاہم جو لوگ انکم ٹیکس اور دیگر سرکاری قوانین سے بچنے کے لیے نقد روپیوں یا سونے چاندی کی صورت میں اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے بجائے ہیرے جواہرات لاکھوں روپے کے خرید کر محفوظ کر دیتے ہیں اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ یہ نیت کس زمرے میں آئے گی؟ حقیر کا خیال ہے کہ یہ نیت درحقیقت تجارت ہی کی نیت ہے کہ ضرورت کے موقع پر اسے فروخت کر کے پھر سے روپیہ بنائیں گے اور نفع بھی ہاتھ آئے گا۔ آج کا ایک لاکھ کا ہیرا عین ممکن ہے کہ دس سال کے بعد ڈیڑھ دو لاکھ کا ہو جائے۔ اس لیے ایسے ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

البتہ جو خواتین محض زینت و آرائش کے لیے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائیگی میں اصل یہ ہے کہ وہ نصاب کے جزء سے ہو یعنی جس مال کا نصاب ہو، زکوٰۃ اسی میں ادا کی جائے، البتہ اونٹوں میں شریعت نے ایک خاص حد تک بکریاں متعین کی ہیں، پھر اس کے بعد اونٹ کا وجوب ہوتا ہے، اس کے علاوہ تمام اموال میں قاعدہ یہی ہے کہ جس مال کی زکوٰۃ ادا کرنی ہے اسی مال میں سے بہ قدر زکوٰۃ کے علیحدہ کیا جائے۔ صاحب بدائع تحریر فرماتے ہیں،

---

(۱) درمختار مع شامی ۲/۲۷۳

وأما صفته فهو حتى في أموال التجارة فالواجب فيها ربع عشر العين وهو النصاب في قول أصحابنا (۱)

بہرحال اموال تجارت میں واجب کی صفت یہ ہے کہ ان میں عین نصاب کا چالیسواں حصہ واجب ہے۔
لیکن علماء احناف کے نزدیک بجائے عین مال کے اس کی قیمت کو زکوٰۃ میں دینا درست ہے، امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے قول میں تو عین یا قیمت ہر دو میں سے ایک واجب ہے اور صاحبین کے بقول اصل واجب تو عین مال سے ہے، مگر اس کے عوض میں قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔ اس قاعدہ کے پیش نظر مسئلہ کا جواب یہ ہوگا کہ جب سال پورا ہو تو اس وقت مال کا جو نرخ ہو اسی حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے۔

ثم اختلف أصحابنا فيما بينهم فعند أبي حنيفة الواجب في الدراهم والدنانير وأموال التجارة جزء من النصاب من حيث المعنى لا من حيث الصورة وعند أبي يوسف ومحمد الواجب هو الجزء منه صورة ومعنى لكن يجوز إقامة غيره مقامه من حيث المعنى ويبطل اعتبار الصورة بإذن صاحب الحق وهو الله تعالى ...... ويبنى على الأصل مسائل الجامع إذا كان لرجل مائتا قفيز حنطة للتجارة تساوي مائتي درهم ولا مال له غيرها وحال عليها الحول فإن أدى من عينها يؤدي خمسة أقفزة بلا خلاف لأنها هي ربع عشر النصاب وهو الواجب على ما مر وإن أراد أن يؤدي القيمة جاز عندنا لكن عند أبي حنيفة في الزيادة والنقصان يؤدي قيمتها يوم الحول وهي خمسة دراهم وعندهما في الفصلين جميعا يؤدي قيمتها يوم الأداء (۲)

وتعتبر القيمة عند حولان الحول بعد أن تكون قيمتها في ابتدائه مائتي درهم من الدراهم الغالبة عليها الفضة كذا في المضمرات (۳)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۲۰ (۲) ایضا ۲/۲۲ (۳) فتاوی ہندیہ ۱/۱۷۹

پھر ہمارے اصحاب کے درمیان اختلاف ہے۔ امام صاحبؒ کے نزدیک دراہم ودنانیر اور اموال تجارت میں نصاب کا جز معنوی حیثیت سے واجب ہے، صورۃً نہیں۔ اور صاحبینؒ کے نزدیک واجب اس کا جز صورت اور معنی کے لحاظ سے ہے، لیکن اس کے علاوہ کو معنوی حیثیت سے اس کی جگہ رکھ سکتے ہیں اور صورت کا اعتبار صاحب حق یعنی اللہ تعالیٰ کے اذن سے ختم ہو جائے گا۔ اسی قاعدہ پر جامع صغیر کا یہ مسئلہ مبنی ہے کہ کسی شخص کے پاس دو سو گز قفیز گیہوں تجارت کے لیے ہے اور اس کی قیمت دو سو درہم ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی مال نہیں ہے اور اس پر سال گزر گیا، تو اگر گیہوں ادا کرنا چاہے تو بغیر اختلاف کے پانچ قفیز ادا کرے گا، اور اگر قیمت ادا کرنا چاہے تو یہ بھی جائز ہے علی الاطلاق الشافعی۔ لیکن امام صاحب کے نزدیک کمی اور زیادتی ہر صورت میں سال پورا ہونے کے دن کی قیمت ادا کرے گا اور وہ پانچ درہم ہے، اور صاحبین کے نزدیک دونوں صورتوں میں ادا کے دن کی قیمت دے گا۔

تھوک اور پھٹکر تجارت میں زکوٰۃ کے لیے اس کے طریقہ تجارت کا اعتبار ہوگا، یعنی اگر تھوک کا تاجر ہے تو مال کی قیمت تھوک کے حساب سے لگائی جائے گی، ورنہ پھٹکر۔

زمین کی تجارت کے متعلق مسئلہ یہ ہے کہ اگر عشری یا خراجی زمین بغرض تجارت خریدی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، کیوں کہ اس کا فریضہ عشر یا خراج ہے، لیکن امام محمدؒ سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر اس میں کھیتی کرے گا تو عشر یا خراج بھی واجب ہوگا۔

ولو اشترى ارض عشر او خراج للتجارة لاتجب فيها الزكوٰة .... و عند محمد اذا اشترى للتجارة ارض عشر تجب الزكوٰة مع العشر ان زرع۔[1]

اگر عشری یا خراجی زمین تجارت کی نیت سے خریدی تو اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور امام محمد علیہ الرحمہ سے روایت ہے کہ اگر عشری زمین بغرض تجارت خریدی تو زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر کھیتی کرے گا تو عشر بھی واجب ہوگا۔

اور اگر غیر عشری وخراجی زمین بغرض تجارت لی گئی ہو تو سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اس قیمت

---

(۱) فتاویٰ قاضی خاں علی ھامش الہندیہ ۱/۲۵۳

کے نرخ کے حساب سے ہوگی۔

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

شیئرز پر مال تجارت ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ فرض ہوگی، ان کی مالیت کا تعین نہ ان کی بنیادی قیمت سے ہوگا اور نہ مارکیٹ کے نرخ سے بلکہ وہ شیئر جس مالیت پر مشتمل ہوگا اس کا اعتبار ہوگا، مثلاً شیئر کا مالک ابتدا سال میں بقدر نصاب ملکیت رکھتا تھا اور پھر درمیان میں بذریعہ تجارت اس میں اضافہ ہوتا رہا، تو سال کے آخر میں جس قدر مالیت فراہم ہوگئی ہے اسی سے زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

اب رہا یہ سوال کہ اس مالیت کا پتہ کیسے چلے گا تو موجودہ کاروباری نظام میں اس کے معلوم کرنے کا طریقہ واقعی دشوار ہے، ایسی صورت میں آسان راہ یہ ہے کہ مارکیٹ کا نرخ دیکھ لیا جائے یقینی طور پر تو نہیں لیکن گمان یہ ہوتا ہے کہ بازار کا نرخ اس کی مالیت سے کچھ زائد یا کم از کم برابر ہوتا ہوگا تو احتیاطاً اسی نرخ سے زکوٰۃ ادا کی جائے، تاکہ زکوٰۃ میں کمی کا احتمال نہ رہے کہ خدا کے یہاں مواخذہ ہو، اگر کچھ زیادہ دے دی جائے گی تو مستحسن ہے۔

محور ثانی، نصاب زکوٰۃ

سونے اور چاندی دونوں کا نصاب اصل ہے، دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے تابع نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ مال تجارت کی قیمت کا تعین دونوں سے ہو سکتا ہے، لیکن اگر ایک سے نصاب پورا ہوتا ہو اور دوسرے سے نہیں تو جس سے نصاب پورا ہوتا ہو اسی کا اعتبار ہوگا۔ وجوب زکوٰۃ کے اندر بھی اور اسی پر قیاس کر کے حرمت اخذ زکوٰۃ کے اندر بھی، اس لحاظ سے موجودہ دور میں چاندی کا اعتبار ہوگا۔

ثم فی تقویم عروض التجارة التخییر یقوم بایهما شاء من الدراهم والدنانیر الا اذا کانت لاتبلغ باحدهما نصابا فحینئذ تعین التقویم بما یبلغ نصابا۔ هکذا فی البحر الرائق۔ (۱)

---

(۱) فتاوی هندیه ۱/۱۷۹

پھر سامان تجارت کی تقویم میں اختیار ہے، درہم و دینار میں سے جس سے چاہے قیمت لگائے، البتہ اگر کسی ایک سے نصاب دپورا ہوتا ہو تو وہ متعین ہے جس سے نصاب پورا ہو۔

محور ثالث ، مصارف زکوٰۃ

(۱) سوال میں مذکور پہلی صورت زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے بہ کر درست ہے بلکہ مستحسن ہے جسے اہل مدارس کو اختیار کرنا چاہیے، مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان تو ظاہر ہے کہ وکیل ہے کہ انھوں نے زکوٰۃ کی رقم اسی لیے حوالے کی ہے مدارس میں جو مستحق طلبہ ہیں ان پر خرچ کی جائے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ طلبہ کا نائب بھی ہے حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی علیہ الرحمۃ تحریر فرماتے ہیں:

مہتمم مدرسہ کا، قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے، جیسا امیر جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبض ہے، اس کے قبض سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا، اگرچہ وہ مجہول الکیت والذوات ہوں، مگر نائب معین ہے اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے۔[۱]

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ طلبہ کے نائب اور قیم ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے وہ زکوٰۃ کی رقم قبضہ کرنے کے بعد آزاد ہے کہ جہاں چاہے خرچ کرے، بلکہ وہ ان کا نائب ہے اور ان کی نیابت میں اس نے زکوٰۃ وصول کی ہے، انھیں پر خرچ کرنا متعین ہے، اگر وہ صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو حسب تصریح فقہا زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، انھیں دوبارہ زکوٰۃ دینی ہوگی اور اس کا وبال مہتمم مدرسہ پر پڑے گا اگر کوئی مہتمم ایسا کرتا ہے تو اسے زکوٰۃ کی رقم دینی جائز نہیں ہے، یہ تو مدرسہ کے مہتمم کا مسئلہ ہے، جس کو زکوٰۃ دہندگان پر کوئی ولایت حاصل نہیں ہے، خود صاحب امر اور سلطان زکوٰۃ وصول کرتا ہے، اور صحیح مصرف میں خرچ نہیں کرتا تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، چنانچہ مبسوط میں ہے:

فاما ما یاخذہ سلاطین زماننا ھؤلاء الظلمۃ من الصدقات والعشور والخراج والجزیۃ فلم یتعرض لہ محمد رحمہ اللہ فی الکتاب وکثیر من ائمۃ بلخ یفتون باداء ثانیا فیما بینہ وبین اللہ کما فی حق البغی

---

(۱) تذکرۃ الرشید ص ۲۲۳

لعلمنا انهم لا يصرفون المأخوذ مصارف الصدقة ۔(۱)

رہے وہ صدقات اور عشور و خراج اور جزیہ جسے ہمارے زمانے کے ظالم حکام وصول کرتے ہیں تو اس سے امام محمد علیہ الرحمہ نے کوئی تعرض نہیں کیا اور بہت سے ائمۂ فتویٰ دیتے ہیں کہ دوبارہ ادا کیا جائے فیما بینہ وبین اللہ جب کہ باغیوں کے متعلق فتویٰ ہے کیوں کہ ہم جانتے ہیں کہ وہ صحیح مصارف صدقہ پر خرچ نہیں کرتے۔

یہاں ایک اور صورت بتائی گئی ہے کہ اگر زکوٰۃ دینے والا خود انھیں ظالم سلاطین کو دینے کی نیت کرے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ کیوں کہ انھوں نے ظلم کر کے اور ناجائز اموال جمع کر کے اپنے اوپر دوسروں کے اتنے حقوق جمع کر لیے ہیں کہ سارا مال دے کر بھی ان حقوق سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں وہ زبردست مدیون ہیں اور اس کی وجہ سے افلاس کے انتہائی مرتبہ پر ہیں، پس انھیں کو مال زکوٰۃ کا مالک بنا دیا جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔ چنانچہ علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

والاصح انه يسقط ذلك عن جميع ارباب الاموال اذا نووا بالدفع التصدق عليهم لان ما في ايديهم من اموال المسلمين وما عليهم من التبعات فوق مالهم فلو ردوا ما عليهم لم يبق في ايديهم شيء فهم بمنزلة الفقراء ۔(۲)

اور اصح یہ ہے کہ سب مال والوں سے زکوٰۃ ساقط ہو جائے گی، جب کہ وہ دیتے وقت خود انھیں کو زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت کریں، کیوں کہ اتنے اموال مسلمانوں کے غلط طور پر ان کے پاس ہیں اور اتنے تاوان ان پر مسلط ہیں جو ان کے مال سے زیادہ ہیں، اگر وہ سب لوٹا دیں تو ان کے ہاتھ میں کچھ نہ بچے گا وہ بمنزلہ فقراء کے ہیں۔

اس عبارت سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ہر قسم کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی، لیکن بحر الرائق میں اس سلسلے میں تھوڑی تفصیل درج ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وظاهر ما صححه السرخسي انه لا فرق بين الاموال الظاهرة والباطنة

---

(۱) مبسوط ۲/۱۸۰ (۲) حوالہ سابق۔

وصحح الولوالجي عدم الجواز في الاموال الباطنة قال وبه يفتى لانه ليس للسلطان ولاية الزكوة في الاموال الباطنة فلم يصح الاخذ۔ (۱)

امام سرخسی نے جس کی تصحیح کی ہے بظاہر اس سے معلوم ہوتا ہے اموال ظاہرہ و باطنہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ مگر ولوالجی نے اموال باطنہ میں عدم جواز کو صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اسی پر فتویٰ ہے کیوں کہ سلطان کو اموال باطنہ کی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں ہے پس اس کا لینا صحیح نہیں ہے۔

یہی بات علامہ ابن ہمام نے بھی حاکم شہید کے حوالے سے نقل کی ہے۔[۲] انھوں نے بھی اسی کو صحیح قرار دیا ہے، بہر حال یہ ایک الگ مسئلہ ہے جس کا تعلق ہمارے موضوع زیر بحث سے نہیں ہے، لیکن اس سے اشتباہ ہو سکتا تھا، اس لیے وضاحت کر دی گئی۔

غرض جب صاحب امر غلط مصرف میں زکوٰۃ خرچ کرے گا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، تو مدرسہ کا مہتمم جو صاحب امر اور صاحب ولایت بھی نہیں، وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے کیسے خرچ کر سکتا ہے؟ اس مسئلے میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

(۲) زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے مدارس میں جو سفراء و محصلین مقرر کیے جاتے ہیں یہ لوگ زکوٰۃ پر عامل نہیں ہیں، قرآن نے جن لوگوں کو العاملین علیہا کہا ہے وہ دوسرے لوگ ہیں، چنانچہ فقہاء ان کی تعریف کرتے ہیں،

فهم الذين نصبهم الامام لجباية الصدقات۔ (۳)

یہ وہ لوگ ہیں جن کو امام صدقات کی وصول کے لیے مقرر کیا ہے۔

امام کو جبایت صدقات کا حق اس کی ولایت عامہ کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اور عاملین اس کے کارکن ہوتے ہیں، مدارس کے مہتممین کو اہل اسلام پر کون سی ولایت عامہ حاصل ہے، صرف کام کی ظاہری مشابہت دیکھ کر حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ مہتمم مدرسہ کا صرف منتظم ہے، زیادہ سے زیادہ جن لوگوں سے اسے چندہ دستیاب ہوتا ہے ان کا وکیل ہے، اس کے کارکنوں پر شریعت کی مخصوص اصطلاح

---

(۱) بحر الرائق ۲/۲۲۳ (۲) فتح القدیر ۲/۱۵۲ (۳) بدائع الصنائع ۲/۴۴

کو منسلک کرنا مناسب نہیں ہے۔

پھر ان سفرا کو زکوٰۃ کی رقم سے کمیشن دینے کا مسئلہ بڑا نازک ہے، اور یہ عاملین بھی اور زکوٰۃ نہیں ہیں کہ انہیں زکوٰۃ لینے کا اس بنیاد پر استحقاق ہو، دوسرے کمیشن کے طور پر زکوٰۃ دینا خود محل نظر ہے بلکہ فقہا کی تصریحات اور تعامل کے خلاف ہے۔

قال العینی اتفق العلماء علی ان العاملین علی الصدقات هم السعاة المتولون قبض الصدقات وانهم لا یستحقون علی قبضها جزءا معلوما سبعا او ثمنا وانما له اجر عمله علی حسب اجتهاد الامام (عمدۃ القاری)

امام عینی نے فرمایا کہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ عاملین الصدقات وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولی کرنے والے ہیں، یہ لوگ زکوٰۃ وصول کرنے کے عوض میں کسی متعین جزء یعنی ساتویں یا آٹھویں حصے کے مستحق نہ ہوں گے اور ان کے لئے عمل کا معاوضہ امام کے اجتہاد کے مطابق ہوگا۔

عاملین کو جو وظیفہ زکوٰۃ کی رقم سے دیا جاتا ہے وہ بقدر کفایت ہوتا ہے، یہی تمام فقہا لکھتے ہیں اور اسی پر تعامل رہا ہے، اس کی شرح یہ ہے کہ اس کی وصول کردہ زکوٰۃ سے اسے اتنی رقم دے دی جائے کہ اس کے کام کے زمانے کے اخراجات اس کے اور اس کے گھر والوں کے بسہولت پورے ہو جائیں، اس میں اجرت کی مشابہت تو ضرور ہے مگر اجرت نہیں ہے، اسی لئے اس کو اجرت کے بجائے عمالہ کا نام دیا جاتا ہے[2]، اس کے برخلاف کمیشن اول سے آخر تک اجرت کا معاملہ ہے، اسی واسطے فقہا نے اس

---

(۲) قال القاری فی شرح النقایه: فلیس ما یاخذه اجرة لانه لا یکون الا علی عمل معلوم بمدة معینة ولا صدقة لانه یاخذه ولو کان غنیا ویحل به العمالة بالاجماع ولکن فیه شبهة الصدقة فلم یجوز اخذها العامل الهاشمی صیانة لقرابته صلی الله علیه وسلم عن اوساخ الناس۔ اوجز المسالک ۱/۲۰۲

ملا علی قاری نے شرح نقایہ میں لکھا ہے کہ عامل جو کچھ لیتا ہے وہ خالص اجرت نہیں ہے کیونکہ اجرت متعین عمل اور متعین اجرت پر ہوتی ہے اور نہ خالص صدقہ ہے اس لئے کہ غنی ہونے کے باوجود عامل لیتا ہے اور عمالہ اس کے لئے جائز ہے لیکن اس میں صدقہ کا شبہ ہے اس لئے عامل ہاشمی اسے نہیں لے سکتا کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت کو اوساخ الناس سے محفوظ رکھنا مطلوب ہے۔

طرح کے کمیشن کو ناجائز قرار دیا ہے کہ اجرت بالکل مجہول ہوتی ہے اور یہ قاعدہ مسلمہ ہے کہ اجرت کی جہالت معاملہ کو فاسد کر دیتی ہے۔ اگر اس اجرت کے فساد سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو بھی بہ طور کمیشن کے زکوٰۃ کی رقم دینا کسی طرح جائز نہیں کیوں کہ زکوٰۃ کو کسی مال یا خدمت کے عوض دینا درست نہیں ہے۔

البتہ اگر کمیشن زکوٰۃ یا واجب التملیک کے علاوہ کسی مال سے طے کیا جائے تو اس میں عرف کی جہالت کا خطرہ باقی رہے گا۔ اگر یہ دور ہو جائے تو معاملہ صحیح ہوگا۔

زکوٰۃ کی رقم سے تنخواہ دینا درست نہیں ہے کہ زکوٰۃ صدقہ ہے جو کسی چیز کا عوض نہیں ہوتا اور تنخواہ اجرت ہے۔ اجرتوں میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کرنا خلاف موضوع ہے۔

خلاصۂ جوابات

پہلی شرط ملک تام

۱ — مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی نہیں ہوئی ہے قیمت پر زکوٰۃ واجب ہوگی بائع کے اوپر۔ اور مال جو وصول نہیں ہوا ہے اس کی زکوٰۃ بھی واجب ہوگی مشتری کے اوپر لیکن چالیس درہم کے بقدر وصول ہونے کے بعد ادا کرنا واجب ہوگا۔

۲ — کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ مالک مکان پر ہوگی۔

ب: ڈپوزٹ جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے وہ رہن کے حکم میں ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، نہ مالک مکان پر نہ کرایہ دار پر۔

۳ — جس مال کا کوئی مالک متعین نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

۴ — حرام مال اگر غیر مخلوط اور ممتاز ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور اگر مخلوط و غیر ممتاز ہو گیا ہے تو اس کی مقدار جدا کر کے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۵ — دین قوی کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہے، مگر وجوب ادا چالیس درہم کے بقدر وصول پانے کے بعد ہے، دین متوسط کی زکوٰۃ بھی دائن پر واجب ہے مگر بقدر نصاب وصول ہونے کے بعد ادا

دین ضعیف کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد جب کہ بقدر نصاب ہو، سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۲ ــــــ پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

چوتھی شرط، دین سے محفوظ ہونا

(۱) دین کے مانع زکوٰۃ ہونے میں طویل الاجل اور قصیر الاجل کی تفصیل نہیں ہے۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

- ایک تجارت میں کئی افراد شریک ہوں تو انفرادًا زکوٰۃ کا وجوب ہوگا، اجتماعًا نہیں۔
- ہیرے جواہرات بغرض تجارت ہوں تو زکوٰۃ واجب ہوگی، سرمایہ محفوظ رکھنے کے لیے اس کو ہیرے جواہرات کی شکل میں رکھ لینے سے اس میں زکوٰۃ کا وجوب ہوگا۔ محض تزئین و آرائش کے لیے ہوں تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔
- اموال تجارت میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نرخ کا تعین وجوب زکوٰۃ کے دن کے لحاظ سے ہوگا۔
عشری اور خراجی زمین جو بغرض تجارت لی گئی ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی زمین یا گھر برائے تجارت لیا گیا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔
- کمپنیوں کی شیئرز تجارتی مال ہیں اس کے لیے ان کی زکوٰۃ واجب ہے اور قیمت کا تعین ان کی مالیت سے کیا جائے گا۔

محور ثانی: نصاب زکوٰۃ

- چاندی اور سونا دونوں نصاب میں اصل ہیں، تجارتی اموال میں جس کے حساب سے نصاب پورا ہوتا ہو، اس کا اعتبار ہوگا۔

محورِ ثالث، مصارفِ زکوٰۃ

۱۔۔۔۔۔ طالب علموں کے سلسلے میں ادائیگی زکوٰۃ کی جو صورت سوالنامہ میں درج ہے وہ مستحسن ہے۔

۲۔۔۔۔۔ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے اور طلبہ کا نائب اور قیم۔

۳۔۔۔۔۔ مدرسہ کے سفراء عاملین شرعی نہیں ہیں، اس لیے مد زکوٰۃ سے نہ ان کو تنخواہ دی جا سکتی ہے اور نہ کمیشن، ہاں اگر فقر کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہوں تو زکوٰۃ دی جا سکتی ہے۔

۴۔۔۔۔۔ فی سبیل اللہ کے مصداق اصالۃً مجاہد فی سبیل اللہ ہیں، اگر ان کے ذیل میں منقطع الحاج کو داخل کیا جائے تو گنجائش ہے۔

۵۔۔۔۔۔ فی سبیل اللہ کے جو لوگ مصداق ہیں ان میں فقر بنیادی شرط ہے۔

۶۔۔۔۔۔ مصارف زکوٰۃ آٹھ اصناف میں منحصر ہیں، ان پر قیاس کر کے دوسروں کو مصارف کے دائرہ میں نہیں لایا جا سکتا۔

۷۔۔۔۔۔ فی سبیل اللہ یا کسی بھی مصرف زکوٰۃ کے دائرے میں ایسی کوئی صورت نہیں آسکتی جس میں زکوٰۃ کی تملیک نہ ہوتی ہو۔

واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب

اسلام میں زکوٰۃ کا مصرف

از: مولانا شبیر احمد قاسمی، دارالقضاء مدرسہ شاہی مرادآباد

ملک تام کی تعریف

جس شئی میں مالک کو ملکیت اور قبضہ دونوں حاصل ہو جائے اس پر ملک تام کا اطلاق کیا جاتا ہے اور اگر صرف ملکیت حاصل ہو جائے لیکن قبضہ حاصل نہ ہو جیسا کہ قبضہ سے قبل طے شدہ مہر کی عورت مالک ہو جاتی ہے لیکن مہر پر قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت تامہ عورت کو حاصل نہیں ہوتی ہے اسی طرح اگر مال پر قبضہ تو ہو جائے لیکن ملکیت درحقیقت اپنی نہ ہو بلکہ کسی اور کی ہو تو ایسی صورت میں بھی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے جیسا کہ قرضدار شخص جو مال کمانا کر قبضہ کرتا ہے یا ہبہ وغیرہ کے توسط سے اس کے قبضہ میں آتا ہے تو ایسی صورت میں قرضدار کے قبضہ میں تو مال آگیا ہے لیکن اس کے ساتھ قرض خواہ کا بھی حق لاحق ہو جاتا ہے اور اس کے ذریعہ سے قرض ادا کرنا اس پر واجب ہو جاتا ہے لہٰذا اس مال کا مالک درحقیقت قرض خواہ ہی ہوا کرتا ہے اس لیے مقروض کے حق میں اس مال میں ملکیت تامہ حاصل نہیں ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے مقروض پر اس مال کی زکوٰۃ بھی واجب نہیں ہوتی ہے۔

"ومنها الملك التام وهو ما اجتمع فيه الملك واليد وأما إذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة" (۱)

---

(۱) عالمگیری مکتبہ ۱۷۲/۱، ومثلہ فی الجوہرۃ ۱۲۶/۱

ملک تام وہ ہے کہ جس میں قبضہ و ملکیت دونوں جمع ہو جائے اور بہر حال جب صرف ملکیت حاصل ہو اور قبضہ نہ ہو جیسا کہ قبل القبض عورت کا مہر یا قبضہ حاصل ہو لیکن ملکیت نہ ہو جیسا کہ مکاتب اور مدیون کی ملکیت تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

قیمت ادا کر کے قبضہ نہیں کیا اس کی زکوٰۃ

جس مال تجارت کی مشتری نے قیمت ادا کر دی ہے لیکن ابھی قبضہ نہیں کیا ہے اس کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہیں ہے۔ (۱)

" ولا فیما اشتراہ لتجارۃ قبل قبضہ " (۲)

یعنی جو مال تجارت کی غرض سے خریدا ہے اس پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

" المبیع قبل القبض لا تجب فیہ الزکوٰۃ " (۳)

یعنی قبضہ سے قبل مبیع میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

اور قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ مشتری پر واجب ہوگی یا نہیں؟ تو اس میں حضرات فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔ قاضی خاں کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

"رجل لہ سائمۃ اشتراھا رجل للسائمۃ ولم یقبضھا حتی حال الحول ثم قبضھا لا زکوٰۃ علی المشتری فیما مضی لانھا کانت مضمونۃ علی البائع بالثمن" (۴)

کسی شخص کے پاس چر کر گزارا کرنے والے جانور ہیں ان کو دوسرے شخص نے نسل بڑھانے اور چرا کر پلنے کی نیت سے خرید کر قبضہ نہیں کیا ہے حتی کہ سال گزر گیا تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ مشتری پر واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ بائع کی ضمانت میں ہے۔

لیکن راجح اور مفتی بہ قول یہی ہے کہ مال تجارت میں قبضہ کے بعد مشتری پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ لازم ہو

---

(۱) عزیز الفتاویٰ ۳۴۱/۱ (۲) الدر المختار کراچی ۲۶۳/۲ (۳) حاشیہ چلپی علی هامش التبیین ۲۵۶/۱ (۴) شامی کراچی ۲۶۳/۲ وهکذا قاضی خاں علی هامش الهندیۃ ۲۴۶/۱

واجب اور ضروری ہے اس لیے کہ قبضہ سے قبل جو ملکیت ناقص تھی اس پر قبضہ کے بعد استصحاب حال کے قاعدے سے ملکیت تامہ کا حکم لاگو ہو جاتا ہے۔

"واما بعده (ای بعد القبض) فیزکیه عما مضی" (۱)

یعنی مال تجارت میں قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے۔

"لاتجب الزکوٰۃ معنا، قبل قبضه واما بعد قبضه فتجب زکوٰته فیما مضی الدین القوی الخ" (۲)

یعنی قبضہ سے قبل مشتری پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے لیکن قبضہ کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ بھی واجب ہے جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے۔

اور مشتری نے مبیع کی جو قیمت بائع کو ادا کر دی ہے اس پر بائع کی ملکیت اور قبضہ دونوں جمع ہو کر ملکیت تامہ کے دائرہ میں داخل ہو چکی ہے اس لیے اس کی زکوٰۃ ادا کرنا بائع پر لازم ہوگا، مشتری پر نہیں ہوگا۔

"رجل اشتری عبدا للتجارة یساوی مأتی درهم ونقد الثمن ولم یقبض العبد حتی حال الحول فمات العبد عند البائع کان علی بائع العبد زکوٰة المأتین لانه ملك الثمن (والی قوله) لازکوٰة علی المشتری لان الثمن زال عن ملکه الی البائع" (۳)

یعنی کسی شخص نے بغرض تجارت ایسا غلام خریدا جس کی قیمت دو سو درہم ہے اور ثمن ادا کر دیا لیکن قبضہ نہیں کیا حتیٰ کہ سال گزر گیا اور غلام بائع کے یہاں ہلاک ہو جائے تو دو سو درہم کی زکوٰۃ بائع پر لازم ہے اس لیے کہ وہ اس ثمن کا مالک ہو چکا ہے اور مشتری پر زکوٰۃ نہیں ہے اس لیے کہ اس کی ملکیت سے نکل کر بائع کی ملکیت میں داخل ہو کر سال گزر چکا ہے۔

کرایہ کی پیشگی رقم اور پگڑی کی زکوٰۃ

کرایہ دار پیشگی رقم جو یکمشت مالک مکان اور مالک دکان کو ادا کرتا ہے، مالک مکان اس کا مالک

---

(۱) شامی کراچی ۲/۲۶۳ (۲) البحر الرائق ۲/۲۰۹ (۳) البحر الرائق ۲/۲۰۳، ۲۰۴، قاضی خان ۱/۲۵۹

ہوجاتا ہے اس کی زکوٰۃ بھی مالک مکان ہی پر لازم ہوا کرتی ہے کرایہ دار پر اس کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے اس لیے کہ اس رقم پر کرایہ دار کی ملکیت تامہ حاصل نہیں ہے۔

" اذا عجل الاجرة لایملک الاسترداد " (۱)

یعنی اگر کرایہ دار پیشگی اجرت اور کرایہ ادا کر دیتا ہے تو مالک مکان اس کا مالک ہوجاتا ہے، لہٰذا واپسی کا حق نہیں ہوگا۔

ڈپوزٹ اور بیع الوفا کی رقم کی زکوٰۃ

اگر اس طرح مکان یا دکان یا زمین وغیرہ خرید و فروخت کی جائے کہ مشتری جو قیمت ادا کرتا ہے وہ بائع کے پاس مثل امانت کے ہے اور جب بائع اتنی رقم مشتری کو ادا کر دے گا تو بیع واپس مل جائے یا عقد کے لیے مدت متعین کی جائے اور مدت پوری ہونے یا عقد فسخ ہونے پر مشتری اور مستاجر کو اپنی دی ہوئی پوری رقم واپس مل جائے تو ایسے معاملہ کو بیع الوفا، الامانت اور الرہن وغیرہ سے بھی تعبیر کرتے ہیں تو ایسی صورت میں ادا شدہ رقم کی زکوٰۃ کس پر واجب ہوگی؟ تو اس میں حضرات فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام ابوبکر محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ اگر اجرت رقم کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ صرف بائع پر واجب ہوتی ہے۔

" حکی عن الشیخ الامام ابی بکر محمد بن فضل قال ان کانت الاجرة من الدراهم او من الدنانیر کان زکوتها علی الآجر لانه ملکها بالقبض وعند انفساخ الاجارة لایلزمه رد عین مقبوض وانما یلزمه رد غیرها فکان بمنزلة دین یحقه بعد الحول الخ " (۲)

شیخ ابوبکر محمد بن فضل فرماتے ہیں کہ اگر اجرت درہم و دینار کی شکل میں ہے تو اس کی زکوٰۃ بائع پر لازم ہے اس لیے کہ قبضہ کی وجہ سے اس کو ملک تام حاصل ہوچکا ہے اور فسخ اجارہ کے وقت عین مقبوض کی واپسی لازم نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ ادا کرنا لازم ہے تو یہ بمنزلہ اس دین کے ہوگا جو بعد حولان حول اس پر لازم ہوا ہے۔

---

(۱) شامی کراچی ۲/۱۰ (۲) قاضی خان ۱/۲۵۳

اور امام زاہد علی بن محمد بزدویؒ اور مجد الائمہ سرخکیؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ بائع اور مشتری دونوں پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بائع کے اوپر اس لیے لازم ہے کہ اس کو ملک تام حاصل ہے اور مشتری پر اس لیے لازم ہے کہ وہ بمنزلہ ثمن رہن ہے لیکن علامہ ابن عابدین شامیؒ نے بحث کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر واجب ہوگی اور اسی کو انھوں نے ینبغی کے لفظ سے راجح قرار دیا ہے۔

"وقال الشيخ الإمام الزاهد علي بن محمد البزدوي ومجد الائمة السرخكي: ان زكوتها تجب على المستاجر ايضا لان الناس يعدون مال الاجارة دينا على الأجير وفي بيع الوفاء المعهود بسمرقند تجب زكوة الثمرة على البائع وعلى قول الشيخ الإمام الزاهد علي بن محمد البزدوي ومجد الائمة السرخكي تجب على المشتري ايضا الخ" (۱)

حضرت امام الزاہد علی ابن محمد البزدوی اور مجد الائمہ سرخکی فرماتے ہیں کہ اس کی زکوٰۃ مستاجر پر بھی لازم ہے اس لیے کہ لوگ مال اجارہ کو موجر پر قرض اور دین شمار کرتے ہیں اور وہ بیع وفا جو سمرقند میں معروف ومشہور ہے اس میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہے اور امام بزدوی اور سرخکیؒ کے نزدیک مشتری پر بھی اس کی زکوٰۃ واجب ہے۔

اور علامہ شامیؒ مشتری پر وجوب ثابت کرنے کے لیے یوں عبارت نقل فرماتے ہیں:

"ينبغي لزومها على المشتري فقط على القول الذي عليه العمل الآن من ان بيع الوفاء منزلة الرهن وعليه فيكون ثمن دينا على البائع" (۲)

فرماتے ہیں کہ مناسب اور اولیٰ یہی ہے کہ اس کی زکوٰۃ صرف مشتری پر لازم ہو اس قول کے مطابق جس پر اس زمانے میں عمل ہے اور اس لیے کہ بیع الوفاء کو بمنزلہ رہن قرار دی جاتی ہے لہٰذا ثمن بائع کے اوپر بطور قرض لازم ہے۔

---

(۱) قاضی خان ۱/۲۵۳ (۲) شامی کراچی ۲/۲۶۱

حاصل یہ نکلتا ہے کہ قول راجح کے مطابق صرف مشتری پر واجب ہے لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ بائع و مشتری دونوں ایسی رقم کی زکوٰۃ ادا کر دیا کریں۔ بیع الوفا کے جواز کے لیے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے یہ قید لگائی ہے کہ دستاویز کے وقت بیع کو مطلق عن الشرط رکھا جائے بیع مع الشرط کی عبارت اور قید نہ لگائی جائے۔ (۱)

مدارس، مساجد، قومی ورفاہی فنڈ کے مال پر زکوٰۃ

مدارس اسلامیہ اور مساجد اور دیگر قومی اور رفاہی فنڈ بیت المال وغیرہ شخص حقیقی نہیں ہے بلکہ یہ سب اشیاء اشخاص حکمی میں شامل ہیں اور اسلامی شریعت نے زکوٰۃ کا فریضہ شخص حقیقی کی ملکیت تامہ پر واجب کیا ہے اور شخص حکمی کی ملکیت پر واجب نہیں کیا ہے اس لیے مساجد، مدارس، قومی فنڈ اور بیت المال وغیرہ کی ملکیت پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف و الخیل المسبلة لعدم الملک و هذا لان فی الزکوٰۃ تملیکاً والتملیک فی غیر الملک لا یتصور الخ۔ (۲)

وقف کے جانور اور رفاہی گھوڑے میں شخص حقیقی کی ملکیت نہ ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے کسی شخص کو مالک بنا دینا شرط ہے اور غیر کی ملکیت میں تملیک متصور نہیں ہے۔

رشوت اور مال حرام کی زکوٰۃ

سود اور مال رشوت اور مال حرام کا قابض شرعی طور پر مالک نہیں ہوتا ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اس لیے ایسے مال پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ (۳)

---

(۱) فتاویٰ مظاہر علوم ۱/۳۹۵ (۲) بدائع الصنائع ۲/۹، شامی کراچی ۲/۲۵۹، حاشیہ چلپی علی الفاسی ضمنی ۱/۲۵۲ (۳) امداد الفتاویٰ ۲/۱۰، کفایت المفتی ۴/۲۴۲، عزیز الفتاویٰ کراچی ۱/۳۶۲

وفی القنیۃ لوکان الخبیث نصاباً لایلزمہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیہ فلایفید ایجاب التصدق ببعضہ الخ۔ (۱)

یعنی مال حرام اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ نادار فقیر پر پورا کا پورا صدقہ کردینا واجب ہے اور اس کے بعض حصہ کا تصدق کافی نہیں ہے۔

اور ایسے مال کے بارے میں حکم شرعی اور واجب یہی ہے کہ پورا مال اصل مالک کو واپس کردیا جائے اور اگر اصل مالک تک رسائی ممکن نہ ہو تو بلا نیت ثواب نادار فقیر کو صدقہ کردینا واجب ہے۔ صاحب بذل نقل فرماتے ہیں:

"صرح الفقہاء بان من اکتسب مالاً بغیر حق فاما ان یکون کسبہ بعقد فاسد کالبیوع الفاسدۃ والاستئجار علی المعاصی والطاعات او بغیر عقد کالسرقۃ والغصب والخیانۃ والغلول ففی جمیع الاحوال المال الحاصل لہ حرام علیہ ولکن ان اخذہ من غیر عقد لم یملکہ ویجب علیہ ان یردہ علی مالکہ ان وجد المالک والا ففی جمیع الصور یجب علیہ ان یتصدق بمثل تلک الاموال علی الفقراء الخ" (۲)

یعنی حضرات فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے کہ جو شخص بغیر حق کے کوئی مال حاصل کرے جیسا کہ بیوع فاسدہ، اجارہ فاسدہ اور معصیت اور ممنوع الاجارہ طاعات سے حاصل کرتا ہے یا چوری غصب، خیانت وغیرہ سے حاصل کرتا ہے تو تمام صورتوں میں حاصل شدہ مال اس پر حرام ہے وہ اس کا مالک نہیں ہوتا ہے اگر مالک مل جائے تو مالک کو واپس کرنا واجب ہے ورنہ فقراء کو صدقہ کردینا واجب ہے۔

اور اگر حاصل شدہ مال حرام کے بارے میں قابض اصل مالک کو تاوان وغیرہ دے کر بری ہو جاتا ہے یا اس سے صلح کرکے اس کو راضی کرلیتا ہے تو ایسی صورت میں علامہ ابن عابدین شامیؒ لکھتے

(۱) شامی کراچی ۲/۲۹۱، بزازیہ ۴/۷۰ (۲) امداد المفتیین کراچی ۷۵۵، بذل المجہود ۱/۳۷ ومعطوفہ فی الشامی کراچی ۵/۹۹ ومثلہ فی مجمع الانہر ۱/۱۹۳۔

ہیں کہ قابض مقبوضہ مال کا مالک ہوجاتا ہے اور اس پر زکوٰۃ بھی واجب ہوجاتی ہے ۔

" لكن علمت انه لا تجب زكوته إلا إذا استبرأ من صاحبه أو صالح عنه فيزول خبثه الخ " (۱)

یعنی لیکن آپ کو معلوم ہوچکا ہے کہ مال حرام پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے مگر جب قابض صاحب مال کو عوض وغیرہ دے کر برأت حاصل کرتا ہے یا اس سے صلح کرلیتا ہے تو خبث اور حرمت ختم ہوجاتی ہے ۔

اور اگر مال حرام کو قابض نے اپنے حلال مال کے ساتھ مخلوط کردیا ہے تو اس کی دو شکلیں ہیں :۔

شکل نمبر ایک ، قابض کے پاس مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب یا اس سے زائد موجود ہو تو مال حرام کو مستثنیٰ کرکے بقیہ مال کی زکوٰۃ ادا کرنا اس پر واجب ہے ۔

شکل نمبر دو ، قابض کی ملکیت میں مال حرام کے علاوہ حلال مال بقدر نصاب موجود نہیں ہے تو ایسی صورت میں قابض پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اس لیے کہ اس کے پاس ملکیت تام کے طور پر کوئی نصاب موجود نہیں ہے ۔

" وإذا لم تتميز الأموال المغصوبة عن النصاب مملوكة له لا تجب عليه بقدر المغصوب وتجب في الزائد " (۲)

جب مال حرام اور مغصوب مملوکہ نصاب سے مخلوط ہونے کی وجہ سے امتیاز نہ کرسکے تو مقدار مغصوب کو مستثنیٰ کرکے بقیہ پر زکوٰۃ واجب ہے ۔

دین اور قرض کی زکوٰۃ کس پر لازم

دیون کی زکوٰۃ سے متعلق اہم ترین تین شکلیں علی الترتیب یہاں پر درج کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔

(۱) وہ دین جو تجارتی مال یا قرض کے طور پر لازم ہے اور مدیون اس دین کا اقرار بھی کرتا ہے اور مدیون ادائے گی پر قدرت بھی رکھتا ہے اور دائن بآسانی اس کو وصول بھی کرسکتا ہے تو ایسے دین کو

---

(۱) شامی کراچی ۲/۲۹۱ (۲) تقریرات رافعی ۱۳۲/ تحت عبارۃ الشامی ۲/۲۹۱

دین قوی کہا جاتا ہے اور اس کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوا کرتی ہے البتہ اس میں شریعت نے یہ رعایت دی ہے کہ وصول ہونے سے قبل ادا کرنا واجب نہیں ہے بلکہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک جب نصاب کے پانچواں حصہ کے بقدر وصول ہو جائے تو اس وصول شدہ کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں ادا کرنا جائے گا، اور حضرت امام ابو یوسفؒ و امام محمدؒ کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوتا رہے گا اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ کے حساب سے نکالنا واجب ہوگا، اور حضرت امام ابو حنیفہؒ کا راجح اور مفتیٰ بہ ہے۔

"الدین القوی وھو الذی وجب بدلا عن مال التجارۃ کثمن عرض التجارۃ من ثیاب التجارۃ وعبید التجارۃ او غلۃ مال التجارۃ ولا خلاف فی وجوب الزکوٰۃ فیہ الا انہ لا یخاطب باداء شیٔ من زکوٰۃ ما مضی ما لم یقبض اربعین درھما فکلما قبض اربعین درھما ادی درھما واحدا، وعند ابی یوسف ومحمد کلما قبض شیئا یودی زکوتہ قل المقبوض او کثر الخ"[1]

دین قوی وہ ہے جو مال تجارت وغیرہ کا بدل ہو جیسا کہ تجارتی کپڑے اور غلام وغیرہ سامان تجارت کا ثمن یا مال تجارت کی آمدنی اور اس میں وجوب زکوٰۃ میں کسی کا اختلاف نہیں ہے لیکن سنین ماضیہ کی زکوٰۃ چالیس درہم یعنی نصاب کے پانچویں حصہ کے بقدر قبضہ ہونے سے پہلے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور چالیس درہم وصول ہونے پر ایک درہم زکوٰۃ میں ادا کرنا لازم ہوگا، اور حضرات صاحبین کے نزدیک جو کچھ بھی وصول ہوگا اس کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا مقبوض کی مقدار کم ہو یا زیادہ۔

(۲) اگر مدیون دین کا اقرار کرتا ہے مگر مفلس ہونے کی وجہ سے قرض ادا کرنے سے قاصر ہے تو ایسی صورت میں اگر حاکم نے اس کو مفلس تصور کر کے اس پر افلاس کا حکم نہیں لگایا ہے تو دین متوسط کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا بھی دائن پر لازم ہوگا اور اگر حاکم نے افلاس کا حکم لگا دیا ہے تو مال ضمار اور دین ضعیف کے حکم میں ہونے کی وجہ سے قبضہ کرنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا حضرت امام محمدؒ کے نزدیک دائن پر واجب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ قبضہ

---

[1] بدائع ۲/۱۰، مشتمل رسائل الارکان ص/۱۶۵، مجمع الانہر ۱/۱۹۴، قاضی خان ۱/۲۵۱، البحر الرائق ۲/۲۰۷، قاضی خان ۱/۲۵۳۔

سے قبل اس کے وصول پر دائن کو قدرت حاصل نہیں ہے۔

اور حضرات شیخین کے نزدیک سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہے اس لیے کہ اس میں جانب فقراء کی رعایت پائی جاتی ہے۔ اور صاحب درمختار، صاحب تحفہ اور قاضی خان وغیرہ نے حضرت امام محمدؒ کے قول کو صحیح اور راجح قرار دیا ہے اور باقانی نے کافی سے نقل کر کے شیخین کے قول کو راجح قرار دیا ہے۔

ولو كان الدين (إلى قوله) على معسر أو مفلس أي محكوم بإفلاسه أو على جاحد عليه بينة وعن محمد لا زكوٰة وهو الصحيح (وتحته في الشامية) ولو لم يفلسه القاضي وجبت الزكوٰة بالاتفاق (إلى قوله) (وهو الصحيح) صححه في التحفة كما في غاية البيان وصححه في الخانية أيضا (إلى قوله) ونقل الباقاني تصحيح الوجوب عن الكافي.[1]

اگر تنگ دست اور مفلس پر قرض ہے اور حاکم اس پر مفلس ہونے کا حکم لگا دے یا منکر پر دین ہے جس پر گواہ موجود ہے تو حضرت امام محمدؒ کے نزدیک قبضہ ہونے پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ نہیں ہے۔ (اور شیخین کے نزدیک واجب ہے) اور اگر قاضی نے مفلس قرار نہیں دیا ہے تو بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہے۔ اور امام محمدؒ کے قول کو تحفہ، غایۃ البیان، خانیہ نے صحیح قرار دیا ہے اور باقانی نے کافی سے وجوب کے قول کی تصحیح نقل کی ہے۔

(۳) دین کا اقرار کر رہا ہے اور اس کے پاس ادا کرنے کے لیے مال بھی ہے لیکن ٹال مٹول کر رہا ہے اور امروز و فردا میں کئی سال گزر گئے اور دائن کو اس کے حاصل کرنے پر قدرت بھی نہیں ہے تو ایسی صورت میں قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ ادا کرنا دائن پر واجب نہیں ہوگا صرف مستقبل کی زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔ (۲)

" يقر المديون بالدين ويماطله ولا يقدر الدائن على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم "۔ (۳)

---

(۱) الدر المختار مع الشامی کراچی ۲/۲۶۶، ومثله في مجمع الأنهر ۱/۱۹۳، عنایہ ۱/۱۲۳، بدائع ۲/۹

(۲) امداد الفتاویٰ ۲/۴۹ (۳) شامی کراچی ۲/۳۳۳۔

مدیون دین کا اور مال داری کا اقرار کرتا ہے اور دائن اس کے چھڑانے پر قدرت نہیں رکھتا ہے تو وہ بمنزلہ عدم کے ہے اور عدم پر شرعی حکم لاگو ہو کر زکوٰۃ وغیرہ واجب نہیں ہوا کرتی ہے۔

اور اس کی زکوٰۃ مدیون پر اس لیے واجب نہیں کہ وہ اتنی مقدار مال کا درحقیقت مالک نہیں ہے اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک تام شرط ہے اور وہ یہاں مفقود ہے۔ حاصل یہ نکلتا ہے کہ ایسا مال وجوب زکوٰۃ کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتا۔ اور دین کی زکوٰۃ مدیون پر کسی حال میں بھی لازم نہیں ہوتی اور دائن پر ہی دین کی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے۔

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

سرکاری محکموں اور دیگر پرائیویٹ اداروں کے ملازمین کی تنخواہ میں سے جو حصہ فنڈ کے نام کاٹ کر جمع کر لیا جاتا ہے اور اس پر مزید اضافہ کے ساتھ محفوظ کر لیا جاتا ہے اور ریٹائرمنٹ کے وقت اصل رقم اور اضافہ دونوں ملازم کو مل جاتے ہیں تو ایسی صورت میں فنڈ کی زکوٰۃ ملازم پر واجب ہوگی یا نہیں؟۔

تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ فنڈ کی مذکورہ رقم بالاتفاق دین قوی کے دائرہ میں داخل نہیں ہوتی، اور دین ضعیف کے دائرہ میں داخل ہونا زیادہ راجح ہے، اس لیے کہ ملازم کا اس رقم پر کبھی قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملازم کی ملکیت میں داخل نہیں ہوتی ہے، اسی وجہ سے اضافہ شدہ رقم کو سود کے دائرہ میں داخل نہیں کیا جاتا ہے اور دین ضعیف میں قبضہ کے بعد بالاتفاق سنین ماضیہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی ہے، اور اس رقم کا دین متوسط کے دائرہ میں داخل ہونا امر متردد فیہ ہے لیکن اگر دین متوسط میں داخل کر لیا جائے تو بھی صحیح اور راجح اور مفتی بہ قول کے مطابق اس پر سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے، اس لیے پراویڈنٹ فنڈ پر ماضی کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۱)

" اما دین الوسط فما وجب لہ بہ لا عن مال لیس للتجارۃ (الیٰ قولہ)

وفیہ روایتان عنہ وروی بن سماعۃ عن ابی یوسف عن ابی حنیفۃ "

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۲۹، فتاویٰ محمودیہ ۳/۵۱، کفایۃ المفتی ۴/۲۸۶ و ۲۴۶، جواھر الفقہ ۱/۳۱۵، فتاویٰ رحیمیہ ۵/۱۳۶، عزیز الفتاویٰ کراچی /۳۰۸۔

انہ لا زکوٰۃ فیہ حتی یقبض المأتین ویحول علیہ الحول من وقت القبض وھو اصح الروایتین عنہ الخ۔ (۱)

بہر حال دین متوسط وہ ہے جو اس کے ایسے مال سے واجب ہے جو مال تجارت نہیں ہے اور اس کے وجوب میں امام ابوحنیفہؒ سے دو روایتیں ہیں اور ابن سماعہ امام ابو یوسف سے اور وہ حضرت امام ابو حنیفہؒ سے نقل فرماتے ہیں کہ اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے حتی کہ دوسو درہم قبضہ کرے اور اس پر قبضہ کے بعد سال گزر جائے اور یہی امام صاحب کی دونوں روایتوں میں سے صحیح اور راجح روایت ہے۔

نمو کی تعریف اور وجوب زکوٰۃ کی شرط

نمو کے معنی بڑھوتری کے ہیں اور باب زکوٰۃ میں اس کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) نمو حقیقی:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مال توالد و تناسل اور تجارت کی شکل میں بڑھتا رہے۔

(۲) نمو تقدیری:۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از خود یا اپنے نائب وغیرہ کے ذریعے مال کو بڑھانے اور ترقی کرنے پر قدرت رکھتا ہو اور وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی کا ہونا شرط ہے چاہے نمو حقیقی ہو یا تقدیری۔

" وفی الشرع ھو نوعان حقیقی وتقدیری فالحقیقی الزیادۃ بالتوالد والتناسل والتجارات والتقدیری تمکنہ من الزیادۃ بکون المال فی یدہ أو ید نائبہ الخ۔ (۱)

اور اصطلاح شرع میں نمو کی دو قسمیں ہیں، نمو حقیقی، نمو تقدیری، اور حقیقی کا مطلب یہ ہے کہ توالد و تناسل اور تجارت وغیرہ کے ذریعہ اضافہ ہو، اور تقدیری کا مطلب یہ ہے کہ صاحب مال از

---

(۱) بدائع ۲/۱۰، منحۃ الخالق ۲/۲۰۷، ومثلہ فی الشامی کراچی ۲/۳۰۶ ومثلہ فی مجمع الانھر ۱/۱۹۵۔ (۲) شامی کراچی ۲/۲۶۲۔

(۱) شامی کراچی ۲/۲۶۳ ومثلہ فی البحرالرائق ۲/۲۰۶، تبیین الحقائق ۱/۲۵۴۔

خود یا اپنے نائب کے ذریعہ مال کو بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو۔

حوائج اصلیہ کی شرط

حوائج اصلیہ میں وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں جن کے بغیر انسانی زندگی بسر کرنا دشوار ہوجائے اور آج کل کے دور میں بہت سی غیر ضروری اشیا کو لوگوں نے اپنے لیے یوں ہی ضروری کرلیا ہے جو در حقیقت حوائج اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتی ہیں۔ اور حوائج اصلیہ دو قسموں پر ہے ۔

(۱) حاجت اصلیہ حقیقیہ اس کے اندر وہ اشیا شامل ہوتی ہیں جس کے بغیر انسان کو ہلاکت کا خطرہ ہے، مثلاً ضروری نفقہ اور اخراجات اور رہائشی مکانات اور آلات جنگ اور سردی اور گرمی کے وہ کپڑے جن کی اپنے موسم کے اعتبار سے ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔

(۲) حاجت اصلیہ تقدیریہ، اس کے اندر وہ اشیاء داخل ہوتی ہیں انسان جن کے بارے میں ہر وقت صحیح معنی میں متفکر رہتا ہے، مثلاً واجب الادا قرضہ پیشہ اور کاریگری کے اوزار و آلات اور گھر کے ضروری اثاث و سامان اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں یہ سب حوائج اصلیہ میں شامل ہیں، لہٰذا اگر کسی کے پاس نقد رقم موجود ہے، لیکن اس پر قرض بھی ہے یا کسی عالم نے ضروری کتابیں خریدنے کے لیے کچھ رقم الگ کر رکھا ہے یا کسی کاریگر نے اوزار کے لیے کسی کو رقم دے رکھا ہے یا گھر کے سامان اور سواری کے لیے کچھ پیسے دے رکھا ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

" وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد او تقديراً كالدين فان المديون محتاج إلى قضاء وبما فى يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذى هو كالهلاك وكالآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها فان الجهل عندهم كالهلاك فاذا كان له دراهم مستحقة يصرفها إلى تلك الحوائج صارت كالمعدومة كما ان الماء المستحق بصرفه إلى العطش كان

كالمعدوم ۔ (شامی ۲/۲۶۲، کراچی)

حوائج اصلیہ میں ہر وہ شئی شامل ہوتی ہے جو انسان سے حقیقی معنی میں اسباب ہلاکت کو دور کرتی ہے جیسا کہ نفقہ، رہائشی مکان، جنگی آلات، گرمی سردی کے ضروری کپڑے یا تقدیرًا اور باطنًا ہلاکت کو دور کرتی ہے، جیسے کہ واجب الادا قرض جو اس کے قبضہ میں بقدر نصاب مال ہے اس کے ذریعہ ادا کیا جائے گا اپنے سے قید وغیرہ کو دور کرنے کے لیے اور قید بھی ہلاکت کے درجہ میں، صناعت کے اوزار اور گھر کے اثاث اور سواری کے جانور اور علماء کے لیے دینی کتابیں اس لیے کہ جہالت ان کے نزدیک ہلاکت ہے، لہٰذا ان ضروریات میں خرچ کے لیے جو رقم موجود ہے وہ کالعدم ہوگی، جیسا کہ پیاسے کے حق میں پینے کے پانی کو کالعدم قرار دے کر اس پر وضو واجب نہیں ہوتا ہے۔

شامی کی مذکورہ عبارت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انسان کی حقیقت اور علاقہ ہر دور کے اعتبار سے حاجات اصلیہ میں تفاوت ہو سکتا ہے، مثلاً عوام کے لیے کتب حدیث، کتب فقہ وغیرہ حاجات اصلیہ کے دائرہ میں نہیں آتیں اور علماء کے لیے حاجات اصلیہ میں سے ہیں۔ اور ایسی جگہ جہاں جانوروں کو سواری کے کام میں لایا جاتا ہے اور وہاں اسکوٹر، سائیکل وغیرہ چلانے کے لیے کوئی راستہ بھی نہیں ہے وہاں سواری کے جانور حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گے اور گاڑی اسکوٹر وغیرہ شامل نہیں ہوں گی۔ اور شہر والوں کے لیے یہ سب اشیاء حوائج اصلیہ میں شامل ہوں گی نیز اگر ایسی جگہ جہاں گاڑی وغیرہ چلانے کا راستہ نہیں ہے وہاں کے لوگ اگر گاڑی وغیرہ رکھ لیں تو وہ اشیاء حوائج اصلیہ سے اگرچہ زائد ہیں لیکن مال نامی نہ ہونے کی وجہ سے ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

طویل الاجل قرض اور کون سا دین مانع زکوٰۃ ؟

وہ تمام دیون جو مدیون پر واجب الادا ہوتے ہیں وہ سب وجوب زکوٰۃ کو مانع ہیں اس لیے موجودہ دور میں تجارت کو فروغ دینے کے لیے اور فیکٹری اور فرم وغیرہ قائم کرنے کے لیے پبلک حکومت سے جو قرض لیتی ہے اور ادائے گی کے لیے سالانہ ماہانہ قسط مقرر کیا جاتا ہے اور طویل الاجل قرض کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ مقدار قرض کو منہا کرنے کے بعد ما بقیہ مال اگر نصاب کو پہونچ جاتا ہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب

ہوگا، اور اگر نصاب کو نہیں پہونچتا ہے تو زکوٰۃ ہی اس مدیون پر واجب نہ ہوگی۔

نیز اگر ایک کروڑ روپیہ قرض میں لے رکھا ہے اور سالانہ پانچ لاکھ کے حساب سے بیس سال میں ادا کرتا ہے تو سالانہ قسط کے لحاظ سے تجزی نہ ہوگا بلکہ پورے ایک کروڑ کو منہا کیا کرے گا۔

" فارغ عن الدين والمراد دين له مطالب من جهة العباد سواء كان الدين لهم او لله تعالى وسواء كان المطالبة بالفعل او بعد زمان فينتظم الدين المؤجل " (۱)

مال نصاب قرض سے بری ہو اور قرض سے ایسا قرض مراد ہے کہ منجانب العباد اس کا مطالبہ ہو چاہے وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا اور مطالبہ فی الحال اور بالفعل ہو یا مدت اور زمانے کے بعد، لہٰذا دین موجل بھی مانع زکوٰۃ میں شامل ہوگا۔

کمپنی اور مشترک کاروبار کے حصہ داروں کی زکوٰۃ

مشترکہ تجارت اور کمپنی فیکٹری وغیرہ کے حصہ داروں کی زکوٰۃ مجموعہ رقم اور مال پر واجب نہیں ہوتی ہے بلکہ ہر حصہ دار کی زکوٰۃ اس کے حصہ کے حساب سے ادا کرنا واجب ہوگی، لہٰذا جس کا حصہ نصاب کو پہونچے گا، اس پر اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی اور جس کا حصہ نصاب کو نہیں پہونچتا ہے اور اس کے پاس اس کے علاوہ اتنا مال نہیں ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہو سکتا ہو تو ایسے حصہ دار پر زکوٰۃ ہی واجب نہیں ہے اور جس کے پاس شرکت کے حصہ کے علاوہ اتنا مال ہے جس کو ملا کر نصاب مکمل ہو جاتا ہے اس پر زکوٰۃ تو واجب ہو جاتی ہے لیکن وہ اپنے حصہ کی زکوٰۃ اپنے طور پر نکالا کرے گا۔ (۲)

" ولا تجب الزكوٰة عندنا في نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة (الى قوله) وان تعدد النصاب تجب اجماعاً ويتراجعان بالحصص فان بلغ نصيب احدهما نصابا زكاه "

---

(۱) مجمع الأنهر ۱/۱۹۳، ومثله عناية على هامش الفتح ۲/۱۶۰، خانية ۱/۲۵۵، هندية ۱/۱۷۳، الدر المختار ۲/۲۶۰، البحر الرائق ۲/۲۰۲۔ (۲) مستفاد فتاوىٰ دار العلوم ۶/۶۶۔

دون الآخر الخ" (۱)

ہمارے نزدیک جانوروں اور مال تجارت کے ایک مشترک نصاب پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگر اس میں اختلاط و اشتراک صحیح ہو چکا ہے اور اگر نصاب متعدد ہو جائے تو ان نصابوں کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا، اور حصہ دار حضرات اپنے اپنے حصوں کے حساب سے ایک دوسرے سے مراجعت کریں گے، اور اگر کسی کا حصہ نصاب کو پہونچتا ہے اور کسی کا نہیں پہونچتا ہے تو جس کا حصہ نصاب کو پہونچتا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، دوسرے پر نہیں۔

ہیرے جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے، جواہرات اگر تجارت کے لیے ہیں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہے اور اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں بلکہ گھروں میں برائے زینت یا کسی اور مقصد سے جمع کر رکھا ہے تو ہیرے و جواہرات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اس لیے کہ ہیرے جواہرات اگرچہ حوائج اصلیہ سے زائد ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی ہونا بھی شرط ہے اور ان میں نمو اور بڑھوتری کی شرط نہیں پائی جاتی ہے، اس لیے ہیرے جواہرات چاہے کتنے ہی مقدار میں ہوں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے۔

"أما اليواقيت واللآلي والجواهر فلا زكوٰة فيها وإن كانت حليا إلا أن تكون للتجارة" (۲)

یاقوت، موتی، جواہرات اگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ زیور کی شکل میں کیوں نہ ہوں۔

"والجواهر واليواقيت فلا شيء فيها.[۳] فإن الحوائج الأصلية أعم من الدين والنامي أعم منها لأنه يخرج به كتب العلم لغير أهلها وليس من الحوائج الأصلية الخ" (۴)

---

(۱) الدر المختار کراچی ۲/۳۰۳، (۲) عالمگیری ۱/۱۸۰ (۳) عالمگیری ۱/۱۸۴ وسلسلہ کتاب الفقہ ۱/۵۹۳ الدر المختار کراچی ۲/۲۲۱ (۴) شامی کراچی ۲/۲۶۲۔

یاقوت وجواہرات میں کوئی زکوٰۃ نہیں ہے، اس لیے کہ حوائج اصلیہ میں دین بھی شامل ہے اور نمو بھی دین کو شامل ہے اور اسی نمو کی قید کی وجہ سے غیر اہل کے لیے کتب بھی نصاب کے دائرہ سے خارج ہوجاتی ہے حالاں کہ وہ غیر اہل کے لیے حوائج اصلیہ میں سے نہیں ہیں۔

غیر نامی اشیاء اگر بقدر نصاب یا نصاب سے زیادہ حوائج اصلیہ سے زائد ہو تو مالک پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی ہے اس کی وجہ سے صرف مستحق زکوٰۃ بننے سے محروم ہوتا ہے اس لیے ہیرے وجواہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"وكذا الكتب وان لم تكن لأهلها اذا لم تنو للتجارة غير ان الاهل له أخذ الزكوة وان ساوت نصبا وتحته في الشامي واما غير الاهل فانهم يحرمون بالكتب من أخذ الزكوة لتعلق الحرمان بملك قدر نصاب غير محتاج اليه وان لم يكن ناميا." (1)

ایسے ہی کتابیں اگرچہ نااہل کے لیے ہوں اور تجارت کی غرض اس میں نہ ہو تو اس میں زکوٰۃ نہیں ہے، لیکن اگر اہل علم کی کتابیں ہیں تو اس کے لیے زکوٰۃ لینا بھی جائز ہوگا، کتابیں چاہے کئی نصاب کے بقدر کیوں نہ ہوں، اور غیر اہل ان کتابوں کی وجہ سے مستحق زکوٰۃ ہونے سے محروم ہوجائے گا جب کہ نامی اور تجارتی نہ ہوں۔

تجارتی پلاٹ اور اموال تجارت میں کس نرخ پر زکوٰۃ

اموال تجارت میں ادائے زکوٰۃ کے لیے چار قسم کے نرخ سامنے آتے ہیں:

(1) حضرت امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک جس دن سال ختم ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا ہے اگر اسی روز زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور پھر بھاؤ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوجائے تو حولان حول کے دن جو بھاؤ عمومی طور پر پایا جاتا تھا اسی بھاؤ کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا۔

"عند ابي حنيفة رح في الزيادة والنقصان جميعا يؤدي قيمتها

---

(1) الدر المختار مع الشامي، کراچی ۲/۲۶۵۔

یوم الحول۔ الخ" (۱)

حضرت امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک حولان حول کے بعد اگر زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے اور مال کے بھاؤ میں گھٹا ؤ بڑھاؤ ہو جائے تو جب بھی ادا کرے گا حولان حول کے دن کے بھاؤ کا اعتبار کر کے ادا کرے گا۔

(۲) حضرت امام ابو یوسف و محمد رح کے نزدیک اگر یوم الحول میں زکوٰۃ ادا نہیں کی ہے تو وقت گزر جانے کے بعد جس دن بھی اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی اسی دن کی قوت خرید کے نرخ کا اعتبار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا لازم ہوگا، لہٰذا اگر بھاؤ گھٹ جائے تو گھٹے ہوئے کی قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی اور اگر بڑھ جائے تو بڑھے ہوئے کی قیمت لگا کر ادا کرنا لازم ہوگا۔

" وعندهما في الفصلين جميعا يؤدي قيمتها يوم الاداء في النقصان (وقوله) وفي الزيادة الخ " (۲)

اور حضرات صاحبین کے نزدیک عین شئی میں سے ادا کرے دونوں صورتوں میں یوم الاداء کے نرخ کا اعتبار ہے چاہے مال کی قیمت کم ہو گئی ہو یا زیادہ۔

(۳) متوقع قیمت فروخت کا اعتبار کرتے ہوئے زکوٰۃ ادا کی جائے لیکن یہ ایک امر متردد فیہ ہے، اور زکوٰۃ مال متعین اور مال یقینی اور ملکیت یقینیہ پر ہی واجب ہوا کرتی ہے، اس لیے متوقع نرخ کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

(۴) راس المال اور لاگت کی قیمت کے حساب سے زکوٰۃ ادا کی جائے یہ ایک امر یقینی اور متعین ہے اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو ملکیت تامہ اور ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ ادا کرنا پایا جاتا ہے اور شریعت اسلامی نے ملکیت لازمہ پر زکوٰۃ واجب کی ہے ملکیت متردد فیہ پر زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے، اس وجہ سے اس شکل کا اعتبار کرنے میں اگرچہ عبارات فقہیہ زیادہ ساتھ نہیں دیتی ہیں لیکن وجوب زکوٰۃ کی اصل علت اور بنیاد پر غور کرنے سے اس شکل کی قوت نظر آتی ہے اس لیے اس صورت کو اگر جائز کہا جائے تو گنجائش معلوم ہوتی ہے اور کتب فقہ کی عبارات اول الذکر دونوں

---

(۱) بدائع الصنائع ۲۳/۲ ومثلہ فی الھندیہ ۱۸۰/۱ (۲) بدائع الصنائع ۲۴/۲

شکلوں کی مؤید ہیں، لہٰذا حاصل یہ نکلے گا کہ تیسری شکل کے جواز کے دائرہ میں آنے کے لیے کسی قسم کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور چوتھی شکل اصل بنیاد و علت کے لحاظ سے جواز کے دائرہ میں آسکتی ہے، اور اول و دوم کے لیے کتب فقہ کی صریح عبارات موجود ہیں۔ اس لیے ان تینوں شکلوں میں سے کسی بھی ایک کو معمول بہ بنائی جاسکتی ہے، مگر حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق یوم الحول کے نرخ کا اعتبار کرنا زیادہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ اور تجارتی پلاٹ پر بھی مذکورہ تفصیل اور احکام لاگو ہوں گے۔ اگر پلاٹ پھٹکر فروختگی کا مال ہے تو زکوٰۃ میں پھٹکر بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا، اور تھوک فروختگی کا مال ہے تو تھوک بھاؤ کی قیمت لگانا ہوگا۔

کمپنی کے حصص اور شیئرز کی زکوٰۃ

کمپنی کے حصص اور شیئرز میں تجارتی سرمایہ ہونے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوا کرے گی اور اس کی زکوٰۃ کی ادائے گی میں لاگت اور منافع دونوں کا اعتبار کرکے دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے اور اس کے سرمایہ میں سے جتنی مقدار کمپنی کے غیر نامی اثاثوں میں خرچ ہوا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور جو مقدار نامی اثاثوں میں لگا ہے اس کی اس کے منافع کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے اور اگر اس کا پورا حصہ نامی اثاثہ میں لگایا گیا ہے تو پورے حصہ راس المال اور منافع دونوں کی زکوٰۃ نکالنا واجب ہے۔

اور اگر شیئرز مارکیٹ میں شیئرز کو خرید کر فروخت کیا کرتا ہے اور فروختگی کی غرض سے حصص خریدا کرتا ہے تو کل لاگت مال تجارت کے دائرہ میں آکر کل پر زکوٰۃ واجب ہوا کرے گی۔ (۱)

بونڈس اور حکومت کو بطور قرض دی گئی رقم کی زکوٰۃ

حکومت اور کمپنی وغیرہ کو طے شدہ مدت اور معاہدہ کے تحت جو رقم بطور قرض دی جاتی ہے، وہ شرعی طور پر دین قوی کے حکم میں ہوتی ہے، اس لیے قبضہ ہونے کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوا کرتی ہے، جیسا کہ علامہ ابن نجیم مصریؒ کی البحر الرائق کی عبارت سے واضح ہوتا ہے۔

---

(۱) مستفاد فتاویٰ رحیمیہ ۲/۱۶، جدید فقہی مسائل ۱/۲۳۶، اسلامی فقہ ۱/۳۲۲، جواہر الفقہ ۱/۳۸۵، امداد الفتاویٰ ۲/۹، فتاویٰ دارالعلوم ۶/۲، ایضاح المسائل ۷۶۔

"الدين على ثلثة اقسام قوى وهو بدل القرض ومال التجارة (قوله) ففي القوى تجب الزكوٰة اذا حال الحول ويتراخى القضاء إلى ان يقبض اربعين درهما ففيها درهم وكذا فيما زاد بحسابه الخ"[1]

قرض اور دین تین قسموں پر ہے۔ دین قوی اور وہ بدل قرض اور مال تجارت ہے تو دین قوی کے اندر حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوجاتی ہے لیکن ادائیگی چالیس درہم کے قبضہ کرنے تک موقوف رہے گی اس کے بعد جتنا وصول ہوتا رہے گا اس کا حساب لگا کر زکوٰۃ ادا کیا کرے گا۔

مصارف زکوٰۃ

مد زکوٰۃ سے طلبہ کی فیس ادا کرنا

اگر طلبہ کے اخراجات کا حساب لگا کر فی کس جتنا بنتا ہے اتنے کا چیک بنا کر مہتمم مدرسہ کے قبضہ میں دے دیا کرے اور طلبا اپنے قیام وطعام کی چیز کے نام سے مدرسہ کو دے دیا کریں تو بلاشبہ جائز و درست ہوگا اور یہ مدارس اسلامیہ میں مال زکوٰۃ کی تملیک کے لیے بہت بہترین اور مناسب شکل ہے اور یہ حیلہ تملیک نہیں بلکہ تملیک کے دائرہ میں داخل ہوجائے گی اور اگر مال دار اور مستطیع طلبہ سے فی کس کے تناسب سے فیس لیا کرے تو یہ بھی جائز اور درست ہے البتہ وہ غنی طالب علم جس کی ملکیت میں نصاب سے زائد مال اور رقم ہے، راجح قول کے مطابق اس کو زکوٰۃ کی رقم دینا یا مد زکوٰۃ سے اس پر خرچ کرنا جائز نہیں ہے۔[2] اور صاحب در مختار نے جو غنی طالب علم کے لیے اخذ زکوٰۃ کو جائز لکھا ہے اس کو علامہ شامی نے یہ کہہ کر مسترد کردیا ہے کہ یہ اس قول کے خلاف ہے جس میں مطلقاً غنی کے لیے حرمت زکوٰۃ کو ثابت کیا گیا ہے اور جواز کے قول کا کسی نے اعتبار نہیں کیا۔

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۰۷، ومثله في الخانية ۱/۲۵۳

(۲) امداد الفتاوی ۲/۱۹، احسن الفتاوی ۴/۲۵۲۔

" وهذا الفرع مخالف لاطلاقهم الحرمة فی الغنی ولم یعتمده احد " (۱)

اور یہ جزئیہ فقہاء کے غنی کے حق میں علی الاطلاق حرمت زکوۃ کے قول کے مخالف ہے اور (اس جواز کے قول) کا کسی نے اعتبار نہیں کیا ہے۔

اور اگر فقیر طلبہ کو مہتمم اور ذمہ داران مدرسہ چیک یا رقم پر قبضہ نہ دیں اور خود مہتمم یا دیگر ذمہ دار طلبہ کے نام سے اپنے طور پر جمع کرلیں پھر اس رقم کو تنخواہ وغیرہ میں صرف کیا جائے تو یہ جائز نہ ہوگا بلکہ اس کے جواز کے لیے یہ شرط ہے طلبہ صراحتاً ذمہ دار کو اس کام کے لیے وکیل بنادیں، اس کے بغیر جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔

ادا زکوۃ میں ضم نصاب کا حکم

وجوب زکوۃ کے لیے شریعت اسلامی نے مال نامی ہونے اور حوائج اصلیہ سے فارغ ہونے کے ساتھ ساتھ نصاب مال کے مالک ہونے کی شرط بھی لگائی ہے تاکہ لاضرر ولاضرار کے قانون کے تحت کسی کو کوئی نقصان نہ ہو اور اسلامی شریعت نے سونا اور چاندی کو الگ الگ معیار قرار دیا ہے اسی وجہ سے دونوں اپنی اپنی جگہ مستقل اصلیت کا حکم رکھتے ہیں اس لیے بلاوجہ کسی ایک کو ہی اصل ٹھہرانا بے اصل اور بے دلیل بات ہوگی، اس لیے جب دونوں الگ الگ اپنے نصاب کو پہونچ جائے تو الگ الگ زکوۃ نکالنا بھی واجب ہوتا ہے اور جب تفاوت ہو جائے اور ایک کا نصاب مکمل ہو جائے اور دوسرے کا مکمل نہ ہو یا کسی کا نصاب کامل نہ ہو تو شریعت نے انفع للفقراء کو پیش نظر رکھ کر ایک کو دوسرے کے ساتھ ملا کر دونوں کو ایک کے حکم میں قرار دے کر نصاب مکمل کر کے زکوۃ ادا کرنے کا حکم فرمایا ہے اور اس طرح ضم نصاب کی صورت میں انفع للفقراء کو ملحوظ رکھنے کا حکم فرمایا ہے اور انفع للفقراء اسی میں ہے کہ سونے کو چاندی کے ساتھ ملا کر پورے کو چاندی کا نصاب بنادیا جائے۔ (۲)

---

(۱) شامی کراچی ۲/۳۴۴ (۲) مستفاد فتاوی محمودیہ ۹/۴۹ ۔ کفایت المفتی ۴/۲۵۳ ۔ امداد الفتاوی ۲/۴۹ ۔ فتاوی رحیمیہ ۱۵۸/۹ ۔

" وجوب الضم اذا لم یکن کل واحد منهما نصابا بان کان اقل فلو کان کل منهما نصابا تاما بدون زیادة لا یجب الضم بل ینبغی ان یؤدی من کل واحد زکوته فلو ضم حتی یؤدی کله من الذهب او الفضة فلا بأس به عندنا ولکن یجب ان یکون التقویم بما هو انفع للفقراء"[1]

سونا چاندی میں سے ایک کو دوسرے کے ساتھ ضم کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے کہ جب دونوں کا نصاب مکمل نہ ہو اور نصاب سے کم ہو اور اگر دونوں کا نصاب مکمل ہو تو انضمام لازم وواجب نہیں ہے بلکہ ایسی صورت میں بہتر اور اولیٰ یہی ہے کہ دونوں کی زکوٰۃ الگ الگ ادا کی جائے اور اگر ملاکر ادا کی جائے تو بھی حنفیہ کے نزدیک کوئی حرج نہیں ہے لیکن واجب یہی ہے کہ اس کے ساتھ قیمت لگائی جائے جس میں فقراء کا زیادہ فائدہ اور نفع ہو۔

مہتمم معطین و طلبہ دونوں کا وکیل

مہتمم اور سفراء بالاتفاق معطین کے وکیل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ طلبہ اور فقراء کے بھی وکیل ہیں یا نہیں؟ تو اگر ان کو صرف زکوٰۃ دہندگان کی طرف سے وکیل تسلیم کیا جائے اور طلبہ کی طرف سے وکیل تسلیم نہ کیا جائے تو زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہ ہوگی جب تک یہ لوگ مصرف میں خرچ نہ کردیں، لہٰذا اگر مصرف میں خرچ ہونے سے قبل ضائع ہوجائے تو معطین کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اس پر فریضۂ زکوٰۃ بدستور باقی رہے گا، لیکن اگر مہتمم اور سفراء کی طرف سے کوئی تعدی نہیں ہوئی ہے تو ان پر تاوان بھی لاگو نہ ہوگا، نیز ایسی صورت میں جن مدارس میں زکوٰۃ کی رقم کئی کئی سال خرچ ہوئے بغیر جمع رہتی ہے اگر بقدر نصاب ہو تو ان کے معطین پر ان سالوں کی زکوٰۃ بھی دوبارہ ادا کرنا واجب ہوگا۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں اس کو خوب وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔[2] لیکن ہمارے اکثر اکابر اہل فتاویٰ نے مہتمم کو طلبہ اور معطین دونوں کا وکیل تسلیم کیا ہے اور طلبہ کے

---

(۱) شامی، کراچی ۲/۳۰۳ ومثلہ فی الہندیۃ ۱/۱۷۹۔

(۲) معارف القرآن ۴/۱۹۹ تحت سورۂ توبہ، آیت ۶۰۔

وکیل ہونے کی وجہ سے مہتمم اور اس کے ماتحت لوگوں کے قبضہ کرنے پر زکوٰۃ دہندگان کی زکوٰۃ اسی وقت ادا ہوجاتی ہے، لہٰذا اگر طلبہ پر خرچ ہونے سے قبل بلا تعدی ہلاک ہوجائے تو معطین کے وکیل اور امین ہونے کی وجہ سے ان پر کوئی تاوان لازم نہ ہوگا اور طلبہ کے وکیل ہونے کی وجہ سے معطین کی زکوٰۃ ادا ہوجاتی ہے، نیز کئی سال سے جمع شدہ رقم پر کسی شخص حقیقی کی ملکیت تامہ نہ ہونے کی وجہ سے ان سالوں کی زکوٰۃ بھی ادا کرنا لازم نہ ہوگا، حضرت اقدس مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارن پوری قدس سرہ فرماتے ہیں کہ معطین کے حق میں اہل مدرسہ بیت المال کے عمال کے مثل ہیں اور طلبہ اور آخذین کی طرف سے وکلاء ہیں، لہٰذا نہ اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ ہی معطین زکوٰۃ واپس لے سکتے ہیں۔ (۱)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے اس فتویٰ سے رجوع کرلیا ہے جس میں طلبہ کی طرف سے وکیل ہونے کا انکار کیا ہے، اور رجوع کا تفصیلی فتویٰ جواہر الفقہ ۲/۳۸۶ میں امین اشرف متعلم درجہ تخصص فی الفقہ والافتاء، دارالعلوم کراچی کے ۲۳ ذیقعدہ ۱۳۸۵ھ کے سوال کے جواب کے تحت موجود ہے۔ (۲)

اور یہی مضمون حضرت مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی دامت برکاتہم نے فتاویٰ محمودیہ میں نقل فرمایا ہے کہ جب طلبہ نے مہتمم کے اہتمام اور انتظام اور قوانین تسلیم کرکے داخلہ لیا ہے تو گویا کہہ دیا کہ آپ ہمارے وکیل ہیں۔ (۳)

اور قطب عالم مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے بھی صاف اور واضح الفاظ میں مہتمم کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے۔ (۴) اور قوت دلائل کی روشنی میں اگرچہ مہتمم کو طلبہ کا وکیل نہیں قرار دیا جا سکتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے معارف القرآن میں نقل فرمایا ہے لیکن اساطین امت اور اہل فتاویٰ کی ایک بڑی جماعت نے مہتمم اور اہل مدرسہ کو طلبہ کا وکیل قرار دیا ہے، اس لیے یہی مسلم ہوگا کہ مہتمم اور اہل مدرسہ اور سفراء معطین اور طلبہ دونوں کی طرف سے وکیل ہوں گے۔ نیز حضرت تھانویؒ نے بھی امداد الفتاویٰ ترتیب قدیم مطبوعہ رحیمیہ میں حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے مذکورہ جواب کو تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ اور تردد بالکل رفع ہوجاتا ہے۔ (۵)

---

(۱) مستفاد فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۱۹ (۲) جواہر الفقہ ۲/۳۸۶ (۳) فتاویٰ محمودیہ ۹/۲۱۵، مطبوعہ فتاویٰ محمودیہ ۳/۲۶ (۴) مستفاد تذکرۃ الرشید ۱/۱۲۳، حاشیہ فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۲

(۵) امداد الفتاویٰ ترتیب قدیم ۲/۲۱۵۔

مدز کوٰۃ سے سفراء کی تنخواہ

مدارس کے سفراء کو العاملین علیہا کے حکم میں قرار دے کر ان کو زکوٰۃ کی رقم میں سے بلا تملیک تنخواہ دینا درست ہوگا یا نہیں؟ تو اس سلسلہ میں ہمارے اکابر میں سے حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے سفراء کو العاملین علیہا کے دائرہ میں داخل کر کے مدز کوٰۃ سے ان کو تنخواہ دینا جائز قرار دیا ہے اور صرف یہ قید لگائی ہے کہ ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زائد تنخواہ دینا جائز نہیں ہے۔[1] نیز حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس سرہ نے امداد المفتیین میں بڑی تفصیل کے ساتھ یہی نقل فرمایا ہے کہ سفراء کو عاملین کے حکم میں قرار دے کر ان کو مدز کوٰۃ سے تنخواہ دی جاسکتی ہے۔[2] لیکن حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے معارف القرآن میں کافی تفصیل کے ساتھ مختلف دلائل سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مدارس کے سفراء کو عاملین کے حکم میں قرار نہیں دیا جاسکتا اور ان کو عاملین کے حکم میں قرار دے کر مدز کوٰۃ میں سے ان کو زکوٰۃ دینا ہرگز درست نہیں ہوسکتا۔[3]

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت مفتی صاحبؒ موصوف نے جواز کے فتویٰ سے رجوع کر کے عدم جواز کو اختیار فرمالیا ہے اس لیے کہ یہ مسلم بات ہے کہ امداد المفتیین بہت پہلے مرتب ہوگئی تھی اور اس کے طویل عرصہ کے بعد معارف القرآن تحریر فرمائی ہے، تو اب اکابر میں سے جواز کے قائل صرف حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب قدس سرہ تنہا رہ جاتے ہیں اور قریب قریب تمام اکابر اہل فتاویٰ اس پر متفق ہیں کہ سفراء کو امیر کی طرف سے مقرر کردہ عاملین کے حکم میں قرار دے کر ان کو مدز کوٰۃ سے بلا تملیک تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہے۔ امداد الفتاویٰ، عزیز الفتاویٰ، احسن الفتاویٰ وغیرہ سب میں عدم جواز کا حکم موجود ہے[4] اور یہی حکم محاسبی اور دفتر کے ملازمین کی تنخواہ کے بارے میں بھی ہوگا خصوصاً جب وہ لوگ حساب زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے کام بھی انجام دیتے ہوں، لہٰذا مدز کوٰۃ سے سفراء و دیگر ملازمین کو تنخواہ دینا ہرگز جائز نہیں ہوسکتا۔

---

۱) کفایۃ المفتی ۴/۲۶۹

۲) امداد المفتیین، کراچی ۲/۳۵۴

۳) معارف القرآن ۴/۳۹۹، سورہ توبہ آیت: ۶۰۔

۴) امداد الفتاویٰ دیوبند، عزیز الفتاویٰ کراچی ۱/۳۲۰، احسن الفتاویٰ ۴/۲۹۳۔

اگر بانتخواہ ملازمین کو حسن کارکردگی پر کچھ شرح فی صد متعین کر کے بطور انعام طے شدہ تنخواہ سے زائد دینا شرعاً جائز اور درست ہے لیکن یہ انعام وصول شدہ چندہ کے نصف سے کم ہی ہونا شرط ہے اور نصف سے کم میں کوئی بھی مقدار حسب صواب دید متعین کی جاسکتی ہے اس لیے کہ نصف یا اس سے زائد امیر کی طرف سے مقرر کردہ عاملین کو دینا بھی جائز نہیں ہے۔ اس کو حضرات فقہاء نے ان الفاظ میں واضح کر دیا ہے۔

لکن لایزاد علی نصف مایقبضہ ؂ (۱) لیکن وصول شدہ کے نصف سے زائد ان کو نہ دیا جائے۔

اور اس کا لحاظ بھی لازم ہوگا کہ سفراء زکوۃ کی رقم وصول کر کے تملیک سے قبل اس میں سے خرچ نہ کریں بلکہ خرچ کے لیے مدرسہ سے علی الحساب پیشگی رقم لے لیا کریں اور زکوۃ کی وصول شدہ رقم کو اولاً مکمل مدرسہ میں جمع کریں پھر مدرسہ کے فنڈ سے اپنا حساب صاف کرلیا کریں ورنہ تملیک فقراء کی شرط فوت ہو جاتی ہے اور تملیک اداء زکوۃ کے لیے شرط ہے۔

ویشترط ان یکون الصرف تملیکاً ؂ (۲)

اداء زکوۃ کے لیے تملیک فقراء شرط ہے۔

اور اگر بانتخواہ ملازم نہیں ہے تو اجارہ فاسدہ ہونے کی وجہ سے شرح فی صد متعین کر کے صرف کمیشن کو اجرت قرار دینا جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ صحت اجارہ کے لیے اجرت کا تعین شرط ہے۔ لہٰذا کمیشن کا یہ طریقہ جواز کے دائرہ میں نہیں آسکتا۔ (۳)

" وشرطھا کون الاجرۃ والمنفعۃ معلومتین الخ ؂ (۴)

یعنی صحت اجارہ کے لیے منفعت اور اجرت دونوں کا متعین ہونا شرط ہے۔

ولا یصح حتی تکون المنافع معلومۃ والاجرۃ معلومۃ ؂ (۵)

یعنی اجارہ اس وقت تک صحیح نہیں ہو سکتا جب تک منفعت اور اجرت متعین نہ ہو۔

لہٰذا حاصل یہ نکلتا ہے کہ بانتخواہ ملازم کے لیے بطور انعام کمیشن متعین کرنا جائز ہے اور بے تنخواہ کے لیے جائز نہیں ہے۔

---

(۱) شامی کراچی ۲/۳۴۱ (۲) درمختار کراچی ۲/۳۴۴ (۳) فتاوی احیاء العلوم ۱/۳۳۶، فتاوی محمودیہ ۲/۲۲۴، فتاوی محمودیہ ۱/۵۲۳ (۴) درمختار کراچی ۶/۵ (۵) ھدایہ ۳/۲۹۱

از: مولانا عبید اللہ قاسمیؔ، استاذ جامعہ اسلامیہ، بنارس

زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں پر ایک محکم فریضہ ہے جو ہر بالدار مسلمان پر چند شرائط و حدود کے ساتھ عائد کیا گیا ہے، جن میں سے کچھ شرائط کا تعلق اس شخص سے ہے جس پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے، کچھ کا اس مال سے جس میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اور کچھ کا اس مصرف سے جہاں زکوٰۃ کی مفروضہ مقدار خرچ کی جاتی ہے۔

فقہاء مجتہدین نے قرآن و حدیث کی نصوص، اجماع اور ان کی روشنی میں قیاس صحیح کے ذریعہ اصولی و فروعی اعتبار سے ان شرائط و حدود کی تشریح کر دی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اختلاف زمانہ اور احوال و ظروف کے تجدد کے ساتھ ہر دور کے جزئی مسائل بھی مختلف ہوا کرتے ہیں، لہٰذا ان کا حل بھی اصول شریعت کی روشنی میں زمانہ و حال کی رعایت کرتے ہوئے ڈھونڈنا وقت کے فقہاء کی ذمہ داری ہوتی ہے، موجودہ زمانے میں ملکی و عالمی تجارتوں کی کچھ ایسی نئی شکلیں رونما ہوئی ہیں جن کا اثر معاملات کے علاوہ باب زکوٰۃ پر بھی پڑا ہے خصوصاً ان شرائط اور اوصاف پر جن کا تعلق مال سے ہے، بسا اوقات یہ فیصلہ مشکل ہو جاتا ہے کہ اس مال کی زکوٰۃ واجب بھی ہوتی یا نہیں، پیش نظر مقالہ میں سوالنامہ کے اسی جزء کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، جب کہ محور ثالث "مصارف زکوٰۃ" کے بعض پہلوؤں پر بھی کچھ گفتگو کی کوشش کی گئی ہے۔

پہلی شرط ملکِ تام (محور اول)

ملکِ تام کا مطلب: کسی بھی مال میں زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے اس کا مملوک ہونا ضروری ہے، چنانچہ جس مال

کا کوئی شخص حقیقی[1] مالک نہ ہو، اس میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی، پھر علاوہ امام زفر بھی ائمہ احناف کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ اس مال پر شخص حقیقی کو ملکیت کامل طور سے حاصل ہو۔ کامل کا مطلب ان کے نزدیک یہ ہے کہ اسباب تملک میں سے کسی سبب کے ذریعہ شئی کی ذات پر ملکیت قائم ہونے کے ساتھ ساتھ قبضہ و تصرف میں بھی وہ شئی آجائے۔ شیخ الاسلام ابوبکر بن علی الحداد (متوفی ۸۰۰ھ) الجوہرۃ النیرہ میں فرماتے ہیں:

"قوله ملكا تاما يحترز من ملك المكاتب والمديون والمبيع قبل القبض لأن الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك واليد واما اذا وجد الملك دون اليد كملك المبيع قبل القبض والصداق قبل القبض او وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لاتجب فيه الزكاة"[2]

ملک تام کی قید سے مکاتب اور مدیون کا مال خارج ہوجائے گا نیز وہ فروخت شدہ سامان جس پر قبضہ نہ ہوا ہو، کیوں کہ ملک تام اسے کہتے ہیں جس میں ملکیت اور قبضہ دونوں اکٹھا ہوں، چنانچہ اگر ملکیت تو ہو لیکن قبضہ نہ ہو جیسے کہ مبیع قبل القبض اور عورت کا وہ دین مہر جس پر اسے قبضہ حاصل نہیں ہے یا قبضہ ہو اور ملکیت نہ ہو مثلاً مکاتب کا مال اور مدیون کا دین جو کسی کا اس کے ذمہ ہے، ان سب میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔

قبضہ و تصرف میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مال مقدور الانتفاع ہو بایں معنی کہ اس شئی پر بالفعل قبضہ و تصرف ہونا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اگر کوئی چیز بالفعل قبضہ میں نہ ہونے کے باوجود بھی مالک کے لیے اس سے فائدہ اٹھانا ممکن ہو تب بھی کہا جائے گا کہ اسے ملکیت تام حاصل ہے۔

ملک العلماء علاء الدین ابوبکر بن مسعود کاسانی (متوفی ۵۸۷ھ) فرماتے ہیں:

ومنها الملك المطلق وهو أن يكون مملوكا له رقبة ويدا وهذا قول اصحابنا الثلاثة وقال زفر والشافعي اليد ليست بشرط فلاتجب الزكاة في مال الضمار عندنا خلافا لهما .... ثم قال تعليلا

---

(۱) شخص حقیقی اور شخص اعتباری کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

(۲) الجوهرة النيرة: ۱۴۲/۱

لهذا الحكم ولأن المال إذا لم يكن مقدور الانتفاع به في حق
المالك لا يكون المالك به غنيا ولا زكاة على غير الغني.......
ومال ابن السبيل مقدور الانتفاع به في حقه بيد نائبه.....
وكذا الدين المقر به إذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول إليه"[1]
مجموعہ شرائط ملک تام ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات اور قبضہ ہر دو اعتبار سے اس کا
مملوک ہو۔ یہی ہمارے تینوں ائمہ کا مذہب ہے۔ امام زفر و شافعی کے نزدیک قبضہ شرط نہیں
چنانچہ مال ضمار میں ہمارے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوگی برخلاف ان کے۔ آگے اس حکم کی علت
بتاتے ہیں کہ مال جب مالک کے حق میں مقدور الانتفاع نہ ہوگا تو اس کی وجہ سے وہ غنی نہ
ہوگا اور غیر غنی پر زکوٰۃ نہیں ہوتی۔ آگے فرماتے ہیں، مسافر کا مال جو اس کے گھر ہے اس کے
حق میں مقدور الانتفاع ہے بایں طور کہ اس کا قائم مقام اس پر قابض ہے۔ آگے فرماتے ہیں
اسی طرح وہ دین جس کا اقرار کر لیا گیا ہو اور اقرار کرنے والا مال مشغول کرتا ہو وہ بھی مقدور
الانتفاع ہے کہ اس تک پہونچنا ممکن ہے۔

اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ مبیع قبل القبض (وہ مبیع جو بیع مکمل ہو کر خریدار کی ملک بن چکی ہے لیکن
ابھی تک بائع کے قبضہ میں ہے) اور جملہ دیون جو کسی کے ذمہ واجب الادا ہوں خواہ قرض ہو یا عورت کا مہر یا تلف
کی ہوئی شئی کا ضمان یا زخم کا تاوان سب کی زکوٰۃ مالک پر عائد ہونی چاہیے۔ اگرچہ ادائیگی فی الحال واجب
نہ بھی لیکن قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی۔ صاحبین کا یہی مسلک ہے۔

صاحب بدائع فرماتے ہیں:

"وقال ابو يوسف ومحمد الديون كلها سواء وكلها قوية تجب
الزكاة فيها قبل القبض إلا الدية على العاقلة ومال الكتابة فإنه لا تجب
الزكاة فيها أصلا ما لم تقبض ويحول عليها الحول وجه قولهما أن
ما سوى بدل الكتابة والدية على العاقلة ملك صاحب الدين ملكا

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۹، مطبوعہ مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ، پاکستان

مطلقا رقبۃ ویدا لتمکنہ من القبض بقبض بدلہ وھو العین فتجب فیہ الزکاۃ کسائر الأعیان المملوکۃ ملکا مطلقا إلا أنہ لا یخاطب بالأداء للحال لأنہ لیس فی یدہ حقیقۃ فإذا حصل فی یدہ یخاطب بأداء الزکاۃ قدر المقبوض کما ھو مذھبھما فی العین فیما زاد علی النصاب بخلاف الدیۃ وبدل الکتابۃ لأن ذلک لیس بملک مطلق بل ھو ملک ناقص علی ما بینا ۔ واللہ اعلم ۔ (۱)

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دیون کے سلسلہ میں اتنا عموم نہیں ہے جو صاحبین کے نزدیک ہے۔ بلکہ آپ دیون کی تین قسمیں قرار دے کر صرف ایک قسم میں قبضہ سے پہلے وجوب زکوٰۃ کی تصریح فرماتے ہیں اور وہ دین قوی ہے جس کی ادائے گی کم از کم خمس نصاب (نصاب کا پانچواں حصہ) پر قبضہ کرنے کے بعد عمل میں آئے گی بقیہ دو قسمیں دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے مطابق دین وسط میں قبضہ کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوگی اور قبضہ سے پہلے ان پر گزرے ہوئے ایام کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، دین قوی آدمی کا وہ بقایا ہے جو کسی نے قرض کے طور پر لیا ہو یا کسی سامان تجارت کے عوض کسی شخص پر لازم الادا ہو، اور دین وسط وہ بقایا ہے جو سامان تجارت کے علاوہ اشیاء ضروریہ کے عوض پر لازم ہو، مثلاً اپنا خدمت کا غلام بیچا جس کی قیمت وصول نہ ہوئی یا استعمالی کپڑوں اور رہائش کے گھر کی قیمت جو وصول نہ ہو سکی۔ اور دین ضعیف وہ بقایا جو سرے سے کسی شئی کے عوض میں نہ ہو، مثلاً وہ دین جو وراثت یا اس کے حق میں وصیت کی وجہ سے اس کی ملک بن جائے یا ایسی شئی کا عوض جو از قبیل اموال نہیں ہے جیسے عورت کا دین مہر اور مرد کا دین خلع وغیرہ۔ (۲) دیون کے سلسلہ میں آج بھی فتویٰ امام صاحبؒ ہی کے قول پر دیا جاتا ہے کیوں کہ اسی میں لوگوں کی سہولت ہے۔

اب آیئے اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جائزہ لیتے ہیں۔

خرید کردہ مال تجارت پر قبضہ سے قبل زکوٰۃ

مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہو سکی ہے تو کیا قیمت

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۰ (۲) بدائع الصنائع ۲/۱۰، الدر المختار مع الحاشیۃ رد المحتار ۲/۲۰۵، مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ دیوبند

جس پر بائع قبضہ کر چکا ہے اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب ہوگی؟ اسی طرح مال جس پر عقد تام ہو چکا ہے لیکن قبضہ نہیں ہوا آیا اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی اگر ہوگی تو کس پر؟۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک تام کی جو حقیقت اوپر ذکر کی گئی ہے اس کی روشنی میں ثمن بائع کی ملک تام ہوگیا، لہٰذا سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ کا واجب الاداء ہونا یقینی ہے۔ البتہ مبیع قبل القبض کا مسئلہ قدرے پیچیدہ ہے۔ اگر صرف اس قدر دیکھا جائے کہ اس پر خریدار کو بالفعل ید اور تصرف حاصل نہیں ہے تو گویا اس پر خریدار کی ملکیت تام نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہونی چاہیے جیسا کہ صاحب جوہرہ کی عبارت سے ظاہر ہے لیکن اس سے آگے بڑھ کر اگر یہ دیکھا جائے کہ حقیقت میں یہ مفقود الانتفاع ہے یا یں طور کہ اس کے عوض پر اسے قبضہ حاصل تھا اور عوض دے کر معوض پر قبضہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو چکا ہے تو پھر یہ اس کا مملوک تام ہے جس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم الاداء ہونی چاہیے۔ فقہاء متاخرین کی عبارتیں اس سلسلہ میں مختلف ہیں۔ محقق ابن نجیم کی رائے وہی ہے جو دوسرے نمبر پر ذکر کی گئی ہے۔ فرماتے ہیں:

"وقدمنا أن المبيع قبل القبض لاتجب زكاته على المشتري، وذكر في المحيط في بيان اقسام الدين أن المبيع قبل القبض لايكون نصابا لأن الملك فيه ناقص بافتقاد اليد والصحيح أنه يكون نصابا لأنه عوض عن مال كانت يده ثابتة عليه وقد امكنه احتواء اليد على العوض فتعتبر يده باقية على النصاب باعتبار التمكن شرعا فعلى هذا قولهم لاتجب الزكاة معناه قبل قبضه وأما بعد قبضه فتجب زكاته فيما مضى كالدين القوي" (۱)

ہم بیان کر آئے ہیں کہ مبیع جس پر خریدار کا قبضہ نہ ہوا ہو اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم نہیں محیط میں اقسام دین کے ضمن میں لکھا ہے کہ مبیع قبل القبض کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ نہیں ہے، کیوں کہ قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملکیت ناقص ہے، جب کہ صحیح قول یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے مال کا عوض ہے جس پر اس کا قبضہ ثابت

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۰۲، ۲۰۹، ۲۰۳۔ مطبوعہ ایچ ایم سعید کمپنی، پاکستان۔

تھا اور ثمن دینے کے بعد عوض پر قبضہ کرنا اس کے لیے ممکن ہو چکا ہے ۔ لہٰذا تمکن شرعی
کے اعتبار سے اس نصاب زکوٰۃ پر اس کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے گا ۔ محیط کے اس بیان کی
روشنی میں اب یہ تاویل ہو سکتی ہے کہ فقہاء جو کہتے ہیں کہ زکوٰۃ واجب نہ ہوگی ۔ اس کا مطلب
یہ ہے کہ قبضہ سے پہلے ادائے گی واجب نہیں ۔ ہاں قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب
الاداء ہو جائے گی جیسا کہ دین قوی کا حکم ہے ۔

علامہ ابن نجیم کے اس بیان سے تقریباً یہ متعین ہو چکا تھا کہ مبیع قبل القبض مقدور الاستفاع ہونے کی
وجہ سے خریدار کی ملک تام ہے اور فقہاء کی عبارت "لا تجب فیہ الزکوٰۃ" وغیرہ کی تاویل بھی کچھ گنجائش ہو گئی تھی
لیکن علامہ ابن عابدین شامی نے اس مسئلے کی ایک ایسی نظیر پیش فرما کر مسئلے کو مزید غور طلب بنا دیا اور ثابت
کیا کہ واقعتاً اس کی زکوٰۃ خریدار کے ذمہ نہیں ہونی چاہیے ۔ درمختار کی عبارت "فلا زکوٰۃ علی مکاتب لعدم
الملک التام ولا فی کسب مأذون ولا فی مرهون بعد قبضه ولا فیما اشتراه للتجارة قبل قبضه"[1]
کے تحت فرماتے ہیں :

"أما بعده فيزكيه عما مضى كما نبه في البحر عن عبارة المحيط
فراجعه لكن في الخانية رجل له سائمة اشتراها رجل للسائمة
ولم يقبضها حتى حال الحول ثم قبضها لا زكاة على المشتري فيما
مضى لأنها كانت مضمونة على البائع بالثمن ومقتضى التعليل عدم
الفرق بين ما اشتراها للسائمة أو للتجارة فتأمل."[2]

بہر حال قبضہ کے بعد تو سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ دینے کا حکم جیسا کہ بحر میں محیط کی عبارت سے کہا
ہے لیکن فتاوی خانیہ میں یہ جزئیہ ہے کہ ایک شخص کے کچھ مویشی تھے جنہیں کسی شخص نے سیامت
(سائمہ) کی غرض سے خرید لیا اور قبضہ نہ کیا یہاں تک کہ بائع کے پاس ان پر سال گزر گیا تو خریدار
پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیونکہ وہ بائع کے پاس مضمون بالثمن تھے اس تعلیل کا
تقاضا ہے کہ تجارت کے مال اور سیامت کے مویشیوں میں کوئی فرق نہیں ہے غور کرو۔

(۱-۲) الدر المختار و تعلیقات - رد المحتار شامی ۲/۶

علامہ شامی نے جس طرف توجہ مبذول فرمائی ہے وہ واقعی قابل غور ہے اور یہ بات سمجھ میں آنے والی ہے کہ جب مبیع بائع کے پاس مضمون بالثمن ہے تو وہ خریدار کی ملک تام نہیں، یہی وجہ ہے کہ اگر سامان ہلاک ہوجاتا ہے تو خریدار کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، اگر ملکیت تام ہوتی تو بلا تعدی اس کے ہلاک ہونے سے خریدار کا مال ضائع ماناجاتا، جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کی نظیر مسئلہ مرہون بھی بن سکتا ہے جسے علامہ شامی نے "ولا في مرهون بعد قبضه" کے ذیل میں تحریر فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں:

"قلت لكن أرجع شيخ مشائخنا السائحاني الضمير في قول الشارح بعد قبضه إلى المرتهن ويؤيده أن عبارة البحر هكذا ومن موانع الوجوب الرهن إذا كان في يد المرتهن لعدم ملك اليد وليس فيها ما يدل على أنه لا يزكيه بعد الاسترداد لكن قال في الخانية: امرأة إذا غصبها ومنعها عن المالك وهو مقر ثم ردها عليه لا زكوة على المالك فيما مضى" (رد المختار ۲/۶)

ہماری نظر میں صاحب بحر کی تعلیل پر علامہ شامی کی تعلیل راجح معلوم ہوتی ہے کیوں کہ محض تمکن شرعی کی وجہ سے اگر اس نصاب پر خریدار کا قبضہ باقی تسلیم کیا جائے تو پھر اس کا مملوک تام ہونا لازم آئے گا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ بلا تعدی ہلاک ہونے کی صورت میں ملک مشتری پر ہلاک ہو، جب کہ ایسا نہیں ہے، باقی اگر یہ کہا جائے کہ جب بائع کی ملکیت سے نکل گیا تو لازماً خریدار کی ملک تام ہوجانا چاہیے تو یہ کوئی ضروری نہیں کیونکہ مطلق ملکیت بائع سے ہٹ کر معلق رہ سکتی ہے تو تام ملکیت بدرجہ اولیٰ معلق رہ سکتی ہے، جیسا کہ خیار شرط میں جب کہ خیار مشتری نے لیا ہو، مبیع بائع کی ملک سے نکل کر خریدار کی ملک میں داخل نہیں ہوتی۔

الحاصل یہ کہ اس مسئلہ میں ثمن کی زکوٰۃ بائع پر واجب ہوگی جب کہ مبیع کی زکوٰۃ کسی کے ذمہ نہیں بلکہ خریدار کے ذمہ اس وقت ہوگی جب اس پر قبضہ کرے اور اس پر سال گزر جائے، سابقہ سالوں کی زکوٰۃ نہ ہوگی۔

کرائے کی مد میں پیشگی رقم کی زکوٰۃ

کرائے کی مد میں جو پیشگی رقم دی جاتی ہے اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ محض زر ضمانت ہے

تاکہ کرایہ دار اگر کرایہ کی ادائیگی میں نادہندہ واقع ہو، تو اس رقم میں سے کرایہ کی رقم وضع کرلی جائے گی ورنہ اجارے کے فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے پر یہ رقم کرایہ دار کو واپس کردی جائے گی تو اس صورت میں یہ کرایہ دار کا مالک مکان پر دین ہوگا اور اس کی ادائے گی زکوٰۃ کرایہ دار پر اس وقت لازم ہوگی جب اس رقم میں سے کم از کم خمس نصاب کے بقدر اسے واپس مل جائے اس وقت سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرے گا۔

لیکن اگر پیشگی رقم بطور اجرت معجلہ کے ہے تو مالک مکان کی ملک ہوگی اور سال پورا ہونے پر اس کی زکوٰۃ مالک کو دینی ہوگی۔ بدائع الصنائع میں ہے:

"ذكر الشيخ الامام أبوبكر محمد بن الفضل البخاري في الاجارة الطويلة التي تعارفها أهل بخارى ان الزكاة في الاجرة المعجلة تجب على الآجر لأنه ملكه قبل الفسخ وان كان يلحقه دين بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا أنه يجب على المستاجر ايضا لانه يعد ذلك مالا موضوعا عند الآجر."(۱)

اس عبارت کی روشنی میں مذکورالصدر دونوں صورتوں کا حل ہو سکتا ہے کیوں کہ اول الذکر کرایہ دار کا مالک کے پاس رکھا ہوا مال ہے اور ثانی مالک کی ملکیت ہے۔

مدارس وغیرہ کے سرمایہ میں زکوٰۃ

جس مال کا کوئی مالک معین نہ ہو جیسے مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقمیں ان پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی کیوں کہ یہ رقم اگر وقف ہے تو ملکیت کا نہ ہونا ظاہر ہے اور اگر یہ وقف نہیں تو کسی شخص حقیقی کی ملک بھی قرار نہیں دی جاسکتی، بلکہ منتظم ادارہ کے اس پر قبضہ کرلینے کے بعد وہ معطی کی ملکیت سے نکل تو جاتی ہے مگر جب تک کسی مصرف پر خرچ نہیں ہوجاتی اس کی ملکیت موقوف رہتی ہے اور وجوب زکوٰۃ کی بابت وقف کا حکم رکھتی ہے۔

"ولا زكاة في المال الموقوف لعدم الملك."(۲)

---

(۱) بدائع الصنائع ۲/۱۰ (۲) الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۵۹۲

"واما الشرائط التي ترجع إلى المال فمنها الملك فلا تجب الزكاة في سوائم الوقف والخيل المسبلة لعدم الملك وهذا لأن في الزكاة تمليكا والتمليك في غير الملك لا يتصور" (۱)

البتہ یہ بات قابل غور ہے کہ جیسا کہ بعض صورتوں میں فقہاء بربنائے ضرورت شخص اعتباری یا شخص قانونی کا اعتبار کر کے اس پر وہ احکام جاری کرتے ہیں جو اصلاً شخص حقیقی پر ہونے چاہئیں، تو کیا یہ ممکن ہے کہ مدارس اور اداروں کو شخص اعتباری مان کر یہ رقمیں ان کی ملک قرار دی جائیں اور پھر ان پر وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے؟

اس سلسلہ میں ہمارے ناقص خیال میں جو بات آتی ہے وہ یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مدارس اور اداروں کو بعض حالات میں شخص اعتباری قرار دینا ناگزیر ہو جاتا ہے، مثلاً یہی کہ اگر مہتمم سے بلا تعدی مذکورہ رقوم ضائع ہو جائیں یا ادارے کی مصالح میں کسی عقد و معاملہ کے دوران کوئی نقصان ہو جائے تو اس کا ضمان مہتمم پر نہیں ہوتا بلکہ اس شخص اعتباری ادارے پر ہوتا ہے، جس کی مصلحت کی رعایت میں نقصان ہوا ہے، اس کے بغیر چارہ کار نہیں۔

لیکن شخص اعتباری مان لینے کے باوجود مسئلہ وجوب زکوٰۃ کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لئے کہ زکوٰۃ ایک خالص عبادت ہے اور محض حق اللہ جو ہر عاقل بالغ مسلم پر بہ چند شرائط فرض عین ہے، جو حقوق العباد اس سے وابستہ نہیں ہیں اور ظاہر ہے کہ حقوق العباد کی ادائے گی کی حد تک تو شخص قانونی کو معتبر ماننے کی ضرورت داعی ہے تاکہ اس سے متعلق کسی بندے کا حق ضائع نہ ہو اور کما حقہ اس کا حق مل سکے اور قاعدہ ہے "الضرورات تتقدر بقدرها"

البتہ وقت کے بعض فقہاء کے خیال میں وقف زمین کی زرعی پیداوار پر حنفیہ کے نزدیک جو عشر واجب ہے اس کو زکوٰۃ کے معاملہ میں شخص قانونی کی ایک مثال کہا جا سکتا ہے (۲) لیکن یہ خیال اس لئے صحیح نہیں ہے کہ فقہاء اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ عشر و خراج کے وجوب کا تعلق مالک سے سرے سے ہی نہیں بلکہ یہ زرعی زمین کا محصول اور لگان ہے جو فقیر بندوں کا حق ہے چاہے زمین کسی کی ملک ہو یا نہ ہو

---

(۱) بدائع ۲/۹ (۲) مولانا محمد تقی عثمانی، درس ترمذی ۲/۳۶۴

حتیٰ کہ ایسا مالک جس میں شرائط وجوب نہ پائی جائیں اس کی زمین پر بھی عشر واجب ہوتا ہے جیسا کہ فقہ کی کتابوں میں تصریح ملتی ہے۔

"ولا یمنع الدین وجوب عشر وخراج لأنها مؤونة الأرض النامیة وقال الشامی حتی یجب فی الأرض الموقوفة والمکاتب۔" (۱)

"وفیه إشارة إلی أنه لا یلتفت إلی المالك سواء کان بالغا أو صبیا أو مجنونا أو عبدا أو کانت الارض وقفا علی الرباطات أو المساجد أو المدارس۔" (۲)

شیخ عبدالرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب الاربعۃ میں فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ بچوں اور پاگلوں کے مال میں صرف اس وجہ سے واجب نہیں کہ یہ ایک خالص عبادت ہے برخلاف عشر اور صدقۃ الفطر کے کہ یہ حقوق العباد ہیں۔

"الحنفیة قالوا لا تجب الزکاة فی مال الصبی والمجنون ولا یطالب ولیهما باخراجها من مالهما لأنها عبادة محضة والصبی والمجنون لا یخاطبان بها وانما وجب فی مالهما الغرامات والنفقات لانهما من حقوق العباد ووجب فی مالهما العشر وصدقة الفطر لان فیهما معنی المؤنة فالتحقا بحقوق العباد۔" (۳)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقف کی زرعی پیداوار میں عشر "مؤنۃ ارض" ہونے کے باعث واجب ہوتا ہے اور اس کی ادائیگی ناظر و متولی اس شخص اعتباری (وقف) کا قائم مقام ہو کر ادا کرتا ہے، گویا وجوب عشر اور اس کی ادائیگی چونکہ حق العبد ہے اس لیے اس میں شخص اعتباری کا نظریہ مجبوری ہے، برخلاف زکوٰۃ کے جو خالص عبادت ہے۔

---

(۱) الدر المختار ورد المحتار ۹/۲

(۲) الجوہرۃ ۱/۱۵۳

(۳) الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۱/۱۹۱

مالِ حرام کی زکوٰۃ

حرام طریقے سے جو مال کسی شخص کے قبضہ میں آتا ہے اس پر تمام ملک کا تحقق نہیں ہوتا بلکہ اس کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کا مالک معلوم ہو تو اس تک واپسی لازم ہے ورنہ بلا نیت ثواب واجب التصدق ہے۔ محض قبضہ تمام ملک کے لیے کافی نہیں، اس لیے ایسے مال میں خواہ قابض کے پاس سال بھر رہ جائے اور بقدر نصاب بھی ہو زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔

لو کان الخبیث نصابًا لا یلزمه الزکاة لأن الکل واجب التصدق علیه .... إلی قوله ویجب علیه تفریغ ذمته بردہ إلی أربابه إن علموا وإلا إلی الفقراء۔[1]

لیکن اگر حرام مال حلال میں اس طرح مخلوط ہو جائے کہ باہم تمیز مشکل ہو تو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک یہ استہلاک کی وجہ سے وہ اس کا مالک ہو جائے گا، البتہ جس قدر مال حرام تھا تب تک اس کے مالکین کے لیے مدیون ہو جائے گا۔ اس میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے دو شرطوں میں سے ایک کا ہونا ضروری ہے یا تو اس کے پاس اس مخلوط مال سے علیحدہ کوئی نصاب مالی جس میں زکوٰۃ فرض ہو موجود ہو تاکہ اس سے دین کی ادائے گی ہو سکے یا ان اموال حرام کے مالکین معاف کر دیں۔ ثانی الذکر صورت میں جس قدر اس کے پاس مال موجود ہے سب کی زکوٰۃ اس کے ذمہ لازم ہو گی اور اول الذکر میں حرام مال کی مقدار جو اس کے ذمہ دین ہے وضع کرنے کے بعد باقی ماندہ اگر بقدر نصاب ہو تو زکوٰۃ فرض ہو گی ورنہ نہیں۔ محقق ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

"وبالجملة فوجوب الزکاة علیه مقید بما إذا أبرأه الغرماء أو بما إذا کان له مال یوفی دینه وإلا فلا وبه یندفع الإشکال لکن لا بد أن یکون معه نصاب زائد علی ما یوفی دینه لأن ما کان مشغولا بالدین لا زکاة فیه وإنما یزکی ما زاد علیه إذا بلغ نصابا کما تفیده عبارة السعدیة۔"[2]

در مختار میں بھی نہر کے حوالے سے نقل کیا ہے:

---

(۱) منحة الخالق علی هامش البحر الرائق ۲/۲۰۵ (۲) أیضا تحت قوله "وهو قید حسن"۔

وهذا إذا كان له مال غيرما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه وإلا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا كما في النهر عن الحواشي السعدية"[1]

دین کی زکوٰۃ

دین السابقایا جو ذمہ پر ہوتا ہے) کی زکوٰۃ مدیون پر واجب نہ ہونا تو ظاہر ہے کیوں کہ محض قبضہ مفید ملک نہیں ہوتا۔

"أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة"[2]

رہا دائن (جس کا بقایا ہے) کے ذمہ واجب ہونا تو ملک تام کی تشریح کے ذیل میں آچکا ہے کہ امام اعظم رحمہ اللہ کے نزدیک جس قسم کا دین ہے اسی کے مطابق حکم ہوگا، گویا دین ضعیف اور صحیح ترین روایت کے بموجب دین وسط میں وجوب زکوٰۃ قبضہ کے بعد حولان حول پر متعلق ہوگا الایہ کہ اس کے پاس پہلے سے اسی جنس کا نصاب موجود ہو جس کے ساتھ مل کر اس کی بھی زکوٰۃ حولان حول سے قبل دینی پڑے گی۔

دین قوی (مال تجارت کا بدل جو مدیون کے ذمہ اس کے اقرار یا بینہ سے ثابت ہو) میں زکوٰۃ کا وجوب فی الحال (قبضہ سے قبل) متعلق ہوتا ہے، البتہ ادائے گی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ ہو جانے تک موقوف رہتی ہے اور قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی بھی زکوٰۃ واجب الادا رہتی ہے۔

اس تفصیل کی روشنی میں فقہا، اس صورت کا حکم بھی یہی لکھتے ہیں کہ اگر مدیون باوجود دین کی ادائگی پر قدرت کے ٹال مٹول کرتا ہو تب بھی دائن پر ملنے کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ اصولی اعتبار سے یہ دین قوی ہے۔

"وكذا الدين المقربه إذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول إليه"[3]

لیکن علامہ شامی مصارف الزکوٰۃ کے باب میں درمختار کی عبارت " ومنه مالو كان ماله

---

(۱) الدر المختار مع رد المحتار ۲/۲۵ (۲) الجوهرة ۱/۱۳۲ (۳) بدائع الصنائع ۲/۹

سوجلاً أو على غائب أو معسر أو جاحد ولو له بينة في الأصح" کے ذیل میں ارشاد فرماتے ہیں:

" قلت وقدمنا أول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتي إلى
هذا وقال بل في زماننا يقر المديون بالدين وبملاءته لا يقدر الدائن
على تخلصه منه فهو بمنزلة العدم "(۱)

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے علامہ شامی کی اسی ترجیح پر اعتماد ظاہر فرمایا ہے چنانچہ آپ کا قول بھی یہی ہے کہ نادہندہ مقروض کا قرضہ دین قوی نہیں اس لیے وصولیابی کے بعد سال پورا ہونے پر زکوٰۃ واجب ہوگی، آپ کے الفاظ یہ ہیں:

" ومتمسكي فيه ما في رد المحتار الخ "(۲)

پراویڈنٹ فنڈ کی زکوٰۃ

پراویڈنٹ فنڈ جو ملازم کی ماہانہ یافت میں سے سرکار یا پرائیویٹ کمپنیز لازماً وضع کر کے رکھتی ہیں اور ختم ملازمت پر اضافہ کے ساتھ اس کو واپس کرتی ہیں، تقریباً حال اور ماضی کے علماء کرام کا اتفاق ہے کہ یہ قسم دین ضعیف یا دین وسط کے تحت آتی ہے اور صحیح ترین روایت کے بموجب ان دونوں میں قبضہ کے بعد سے سال پورا ہونے پر زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے اس سلسلہ میں دو متضاد فتوے صادر ہوئے تھے، ایک میں دین قوی قرار دے کر گزشتہ کی زکوٰۃ واجب قرار دی گئی تھی، دوسرے میں دین وسط یا ضعیف قرار دے کر قبضہ کے بعد تمامیت سال پر وجوب زکوٰۃ ثابت کیا گیا تھا۔ حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ نے اس تعارض کو رفع کرانے کی غرض سے ایک تحقیقی استفتاء حضرت سے کیا جس میں بدائع، بحر اور منحۃ الخالق کی عبارات کی روشنی میں حضرت کے دوسرے فتوے کی تصویب چاہی گئی تھی۔ مفتی صاحبؒ کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے:

" الغرض پراویڈنٹ کا روپیہ دین قوی میں تو داخل ہو نہیں سکتا، کیونکہ وہ معاوضہ کسی مال تجارت کا نہیں، بلکہ خدمت کا معاوضہ ہے اور دین متوسط میں داخل کر کے بھی اس وقت تک کسی روایت

---

(۱) الدر المختار ورد المحتار ۲/۱۲ (۲) امداد الفتاوی مبوب ۲/۳۵

پر منطبق نہیں ہے جب تک زر کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس پیش نظر
بھی مان لیں تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح ہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ
واجب نہیں ہے۔"

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس تحقیق سے اتفاق ظاہر فرماتے ہوئے لکھا :

"آپ صاحبوں کی تحقیق صحیح ہے۔ لہٰذا میں بھی اسی کو اختیار کرتا ہوں۔" (۱)

چنانچہ اسی کے مطابق مفتی کفایت اللہ صاحب، مفتی عبدالرحیم صاحب، مفتی محمود الحسن صاحب اور مفتی نظام الدین صاحب وغیرہم نے فتاویٰ موجود ہیں۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ کا مکلف شخص حقیقی ہے جو تکلیفات شرعیہ کا اہل ہو، لہٰذا چند شرکاء کے مشترکہ کاروبار سے جو ایک شخص اعتباری کا تصور پیدا ہوتا ہے (کمپنی) اس کے ساتھ فریضۂ زکوٰۃ وابستہ نہیں بلکہ کمپنی کے جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب ہیں صرف ان پر ان کے حصوں کے بقدر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر شرکاء کی تعداد اتنی بڑی ہے، یا مشترکہ مال کی مقدار اتنی کم ہے کہ شرکاء پر ان کے حصوں کے مطابق تقسیم کرنے پر ان میں سے کوئی بھی صاحب نصاب نہیں بنتا تو کسی پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، خواہ کمپنی کی مجموعی مالیت کروڑوں میں ہو، الا یہ کہ کسی شریک کے پاس اپنا کوئی نصاب شرعی موجود ہو جس کی زکوٰۃ لازم الاداء ہو تو اس کے ساتھ وہ کمپنی میں سے اپنے حصۂ مالیت کی بھی زکوٰۃ نکالے گا۔ کمپنی بحیثیت کمپنی پر زکوٰۃ دو وجہ سے نہیں ہے۔ اولاً اس لیے نہیں کہ وہ شخص حقیقی مکلف نہیں، ثانیاً اس وجہ سے نہیں کہ وجوب زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک مخصوص نصاب کی شرط ضروری ہے جس کا مدار مالکین کے لیے سہولت اور آسانی مہیا کرنے پر ہے، لہٰذا سہولت اسی میں ہے کہ وہ نصاب شخص واحد ہی کا ہو، متعدد اشخاص کا مشترک نہ ہو، متعدد اشخاص کی ملک سے کوئی نصاب بن گیا جس کی وجہ سے سب پر بقدر حصص زکوٰۃ واجب ہوگئی تو یہ اس علت فقہی کے منافی ہوگا۔ لہٰذا اس کا بھی تقاضا ہے کہ مشترکہ

(۱) امداد الفتاویٰ جلد ۲، ص ۴۳ تا ۵۰ میں حضرت تھانوی رح کے دونوں فتوے، مفتی صاحب کا تحقیقی استفسار اور حضرت کی تصویب ملاحظہ کی جائے۔

نصاب پر زکوٰۃ نہ ہو جیسا کہ علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں مسئلہ مذکورہ میں اختلاف ائمہ کے ذیل میں اس علت نفی پر زور دیتے ہوئے مالکیہ اور احناف کی وکالت میں رقم طراز ہیں:

"أما المسألة الرابعة فإن عند مالك وأبي حنيفة أن الشريكين ليس يجب على أحد منهما زكاة حتى يكون لكل واحد منهما نصاب[1] وعند الشافعي أن المشترك حكمه حكم مال رجل واحد وسبب اختلافهم الإجمال الذي في قوله عليه السلام ليس فيما دون خمس أواق من الورق صدقة فإن هذا القدر يمكن أن يفهم منه أنه إنما يخصه هذا الحكم لمالك واحد أو أكثر من مالك واحد إلا أنه لما كان مفهوم اشتراط النصاب إنما هو الرفق فواجب أن يكون النصاب من شرطه أن يكون لمالك واحد وهو الأظهر"(٢)

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کسی بھی تجارتی کمپنی کے شیئرز خریدنا درحقیقت اس کمپنی میں شیئرز حصہ کے بقدر شرکت حاصل کرنا ہے اور خریدار اپنے حصہ (مثلاً ہزار روپے) کے بقدر کمپنی کے پورے اثاثے (عمارت، مشینری، خام مال تجارت اور نقد روپوں) میں شریک ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے کمپنی ترقی کرتی رہے گی اس کے حصے کے تناسب سے سرمایہ کی مقدار بھی بڑھتی رہے گی لہٰذا اصل ضابطہ کی رو سے ہونا یہ چاہیے کہ حصہ دار (شیئر ہولڈر) کی رقم کا جتنا حصہ کمپنی کی عمارت، آلات حرفت وغیرہ غیر نامی اثاثوں میں لگا ہوا ہے اس کی تو زکوٰۃ لازم نہ ہو اور جتنا سامان تجارت یا نقد کی صورت میں موجود ہے اگر بقدر نصاب ہے تو اس کی زکوٰۃ لازم ہو اور ادائیگی زکوٰۃ کے سلسلہ میں نہ تو شیئر کی بنیادی قیمت کا لحاظ ہوگا جس کے عوض اس نے شیئر خریدا ہے اور نہ ہی ادائیگی یا وجوب کے وقت شیئر کے بازاری نرخ سے کیونکہ شیئر بذات خود کوئی مال متقوم نہیں ہے کہ اسے تجارتی مال

---

(١) یہ صرف مالکیہ کا مسلک ہے، احناف کے نزدیک کسی ایک کا بھی حصہ اگر بقدر نصاب ہو تو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی، "فلا يجب نصيب أحدهما نصاباً زكاه دون الآخر" الدر المختار ٢/٢٥ (٢) بدایۃ المجتہد ١/٢٥٩

قرار دیا جائے بلکہ یہ ایک اضافی شی ہے جو اپنے مضاف الیہ کے اعتبار سے معنی خیز بنتی ہے، جیسے دکان کا حصہ، مکان کا حصہ وغیرہ، اسی طرح یہاں مشترک تجارت کا حصہ، چنانچہ اس مشترک تجارت میں ہر شریک کا جتنا حصہ ہے وہی اس کا اپنا مال ہے جس پر زکوٰۃ کا حکم حسب شرائط عائد ہوگا اسی طرح ہر شریک کو یہ اختیار بھی ہوگا کہ وہ اپنے حصہ کا مال کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دے۔ (۱)

گویا ہر شریک کو کمپنی سے یہ تفصیل دریافت کرنی ضروری ہوگی کہ اس کے سرمایہ کی کل مقدار کیا ہے؟ کتنا حصہ نامی اثاثوں کی شکل میں ہے؟ اور کتنا غیر نامی کی شکل میں ہے؟ تاکہ وہ اپنی زکوٰۃ کا حساب صحیح طور پر لگا سکے۔ اگر تفصیل اسے کمپنی کی طرف سے موصول ہو جائے تو ٹھیک ہے ورنہ ضرورۃً اس وقت بازار میں شیئر کا جو نرخ ہو اسی کے ذریعہ مالیت کا تعین کیا جائے گا، اس لیے کہ اغلب یہی ہے کہ بازاری قیمت کے مقابلہ میں شیئر کی وہ مقدار جو نامی ہے کم ہے اور شیئر کی قیمتوں کا اتار چڑھاؤ اصل مالیت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کے تابع ہوتا ہے اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ مارکیٹ کی قیمت معیار مالیت قرار دی جائے۔ (۲)

"بونڈس" حقیقت میں اس کے خریدار کی طرف سے حکومت یا کمپنی کو قرض دینا ہے جس کا سارٹیفکٹ اس کے پاس موجود ہے، ظاہر ہے کہ مدت کے اختتام پر اصل رقم کے ساتھ جو منافع ملتا ہے یقیناً ربوٰ ہے اور اصل رقم بمنزلہ دین قوی ہے، جس کی زکوٰۃ لازم ہے اور ادائے گی کم از کم خمس نصاب پر قبضہ کرنے کے بعد سابقہ سالوں کی بھی ہوگی۔

دوسری شرط "نما" حقیقت و اقسام

وجوب زکوٰۃ کے لیے مال نامی کا ہونا ضروری ہے، "نما" کی حقیقت بڑھوتری اور اضافہ ہے۔ شرعی اعتبار سے نما کے تحقق کی دو صورتیں ہیں:

(۱) **حقیقی:-** جانوروں (سوائم) میں بالفعل توالد و تناسل کے ذریعہ اور دوسرے اموال میں بالفعل تجارت کے ذریعہ اضافہ ہو رہا ہو۔

---

(۱) یہاں ان علمی اشکالات سے بحث نہیں جو شیئر کی خرید و فروخت کی بابت پیدا ہوتے ہیں، ان کا کافی و شافی حل حضرت تھانویؒ کے رسالہ "القصص الحسنی" میں ملاحظہ کیا جائے۔ (۲) مستفاد از رسالہ "القصص الحسنی" بہ امداد الفتاوی ج ۲/ ۴۹۶ تا ۵۱۲۔

(۲) تقدیری:- بالفعل اضافہ تو نہ ہو رہا ہو، مگر یہ ممکن ہو کہ اگر چاہے تو اس میں زیادتی اور اضافہ کی شکل پیدا کر سکتا ہے بایں طور کہ مال خود اس کے قبضہ میں ہے یا اس کے کارندے کے قبضہ میں۔ مثلاً مضارب کا مال جو اس کے وطن میں ہے۔(۱)

پھر نماء تقدیری کی بھی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ خلقی اور فعلی۔

(۱) **خلقی**:- اس کا مصداق نقدین، سونا اور چاندی ہیں جو فطری طور پر جملہ حوائج بشری کی تکمیل کی صلاحیت رکھتے ہیں اور خلقۃً ثمن ہیں اس لیے بندوں کی طرف سے نیت کر کے قابل تجارت بنانے کے محتاج نہیں ہیں۔ چنانچہ بقدر نصاب موجود رہنے پر ان میں لازماً زکوٰۃ فرض ہوگی، خواہ تجارت کی نیت سے رکھے گئے ہوں یا کوئی نیت نہ ہو یا اپنے ضروری استعمال میں لانے کی نیت ہو۔

(۲) فعلی:- نقدین کے علاوہ بھی اموال میں نماء فعلی ہوتا ہے ایسا جس کا نماء کی نیت کرنا ضروری ہے جیسے جانوروں میں اگر یہ نیت کر لی گئی کہ سال کا اکثر حصہ چرا کر ان کی افزائش نسل میں لائی جائے گی، جسے سائمہ کہتے ہیں یا سامانوں میں یہ نیت کر لی گئی کہ تجارت کر کے اس میں منافع کیا جائے گا تو نماء تقدیری کا تحقق ہو گیا اگرچہ بالفعل ان میں اضافہ نہ ہو سکے۔

البتہ اسامت یا تجارت کی نیت کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہوگا کہ فعل تجارت یا فعل اسامت کے ساتھ نیت پائی جائے ورنہ نیت معتبر نہ ہوگی خواہ تجارت کی نیت صراحۃً ہو یا دلالۃً۔ تجارت کی نیت صریحہ کی مثال ہے مثلاً عقد معاوضہ کرتے وقت یہ نیت کرے کہ میں اس عقد سے جس شیٔ کا مالک ہو رہا ہوں اس کو تجارت میں لگا کر نفع کماؤں گا، چاہے یہ معاملہ خریداری کا ہو یا اجارے کا، ثمن چاہے نقدین کے قبیل سے ہو یا عروض اور سامانوں کے قبیل سے۔ لیکن اگر اپنے استعمال میں لانے کی نیت ہو یا کوئی شیٔ اس کی ملکیت میں بغیر کسی عقد و اجارہ کا معاملہ کیے آ جائے جیسے وراثت کا مال یا عقد ہو [illegible] کے نتیجہ میں آئے لیکن ایسی معاوضہ مال بالمال کی حقیقت مفقود ہو جیسے ہبہ، صدقہ، وصیت یا مہر کے طور پر ملکیت میں کوئی مال آ جائے تو اس قسم کے مملوکہ اموال سامان تجارت نہ ہوں گے حتی کہ بعد میں بھی تجارت کی نیت کرنا مفید نہ ہوگا الا یہ کہ تجارت کی نیت سے کوئی عملی اقدام کر ڈالے۔

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۰۹، رد المحتار ۲/۷

اور دلالۃً نیت تجارت کی مثال یہ ہے کہ کوئی سامان ایسے سامان کے عوض خریدے جو اس کے پاس پہلے سے تجارت ہی کے لیے رکھا ہوا تھا یا اپنے اس گھر کو جو تجارت کے واسطے تھا کسی سامان کے عوض کرائے پر دے دیا تو ان صورتوں میں اگرچہ صراحۃً تجارت کی نیت نہ بھی کرے تب بھی جس سامان کا مالک ہوگا وہ عروض تجارت کے حکم میں ہوگا۔[1]

اب ہم اس ضمن میں پیدا ہونے والے سوالات کا الگ سے جائزہ لیتے ہیں۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تجارتی سامان چونکہ مال ہیں اس لیے ان کی زکوٰۃ فرض ہے اور مالیت کا حساب بازاری قیمت سے لگایا جائے گا، اصل لاگت سے کوئی مطلب نہیں۔ صاحبین کے نزدیک ادائے گی کے دن جو بازار میں قیمت ہوگی، اس کے حساب سے مالیت کا تعین ہوگا اور امام صاحب کے نزدیک جس دن سال پورا ہوا تھا اس روز کی بازاری قیمت معیار قرار دی جائے گی۔

"وتعتبر القیمۃ یوم الوجوب وقالا یوم الاداء وفی السوائم یوم الاداء اجماعا وھو الاصح ویقوم فی البلد الذی المال فیہ"[2]

حضرت گنگوہی علیہ الرحمۃ نے صاحبین کی رائے کو ترجیح دی ہے۔

"اگر نقصان قیمت میں ہے یا نفع ہر حالت کی زکوٰۃ دیوے جو دینے کے روز اسباب تجارت کی قیمت ہے۔"[3]

رہی بات تھوک اور ریٹیل کی تو جیسا اس کا کاروبار ہوتا ہو یعنی اگر تھوک خریداری اور تھوک ہی فروختگی ہوتی ہو تو معیار تھوک قیمت ہوگی، ورنہ ریٹیل فروختگی کا اعتبار ہوگا۔

اراضی تجارت کی زکوٰۃ

اموال تجارت میں وجوب زکوٰۃ کا جو کلی ضابطہ فقہاء بیان کرتے ہیں وہ یہ کہ

---

(۱) المحیط البرہانی [illegible] (۲) [illegible] (۳) [illegible]

"أن ما عدا الحجرين والسوائم إنما يزكى بنية التجارة بشرط عدم المانع المؤدي إلى الثني" (۱)

یعنی نقدین اور سوائم کے علاوہ میں زکوٰۃ تجارت کی نیت سے واجب ہوتی ہے بشرطیکہ نیت کی وجہ سے وجوب زکوٰۃ کی صورت میں ایک ہی مال میں دو مرتبہ زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہو، چنانچہ کبھی ایسا ہو جائے تو نیت تجارت کے باوجود زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، مثلاً:

"خراجی یا عشری زمین تجارت کی نیت سے خرید کر اس میں کاشت کاری کی یا تجارت کی نیت سے بیج خرید کر بو دیا تو اس صورت میں صرف عشر یا خراج واجب ہوگا، زمین یا بیج کی قیمت پر زکوٰۃ نہیں۔"

لیکن ظاہر ہے کہ یہ اسی صورت میں ہوگا، جب کہ اس زمین کی بوائی کر دی جائے نیز اس کا عشری یا خراجی ہونا معلوم ہو، دونوں باتوں میں سے کسی ایک کے نہ ہونے کے وقت یہ حکم نہ ہوگا، مثلاً تجارت کی نیت سے عشری یا خراجی زمین خریدا اور بوائی نہیں کی یا اس زمین کا سرے سے عشری یا خراجی ہونا معلوم نہیں ہے، جیسا کہ عام طور پر ہندوستان کی زمینوں کا یہی حال ہے تو بلاشبہ یہ اراضی اموال تجارت ہوں گی، اور ان کی متوقع قیمت فروخت کے اعتبار سے ان کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

ہیرے اور جواہرات جو تجارت کی غرض سے رکھے ہوں ان پر نامی ہونے کے باعث زکوٰۃ لازم ہوگی، باقی اس مقصد سے ان کا ذخیرہ کیا گیا ہو کہ انکم ٹیکس یا دیگر سرکاری قوانین کی زد سے محفوظ رہیں گے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں خواہ ان کی مالیت لاکھوں کی ہو، البتہ زیادہ سے زیادہ ان کے حوائج اصلیہ سے زائد ہونے کی وجہ سے حرمت زکوٰۃ، وجوب صدقۂ فطر اور وجوب قربانی وغیرہ احکام آئیں گے۔ البتہ ہیرے جواہرات کا ذخیرہ کرنے والوں کی نیت اگر حکم شرعی (زکوٰۃ) سے فرار اختیار کرنی ہو تو گناہگار ہوں گے لیکن اصل صورت میں بھی زکوٰۃ ان پر واجب نہ ہوگی۔

---

(۱) الدر المختار ۲/۳

"لا زكوة فى اللآلى والجواهر وإن ساوت ألفا إتفاقا إلا أن تكون للتجارة"(۱)

یہی حکم ان جواہرات کا بھی ہے جو تزئین اور آرائش کے طور پر استعمال کیے جاتے ہیں بلکہ ان کے متعلق حاجت اصلیہ کے تحت شامل ہونے نہ ہونے ہی میں فقہاء کا اختلاف ہے اگرچہ صحیح یہی ہے کہ ایسے قیمتی اثاثے جن کا مقصد محض تزئین ہو، تحقق غنا کے لیے کافی ہیں، لیکن حرمت زکوۃ وغیرہ کی حد تک نہ کہ وجوب زکوۃ کے سلسلہ میں۔

تیسری شرط۔ حاجات اصلیہ سے فارغ ہونا

حاجات اصلیہ، تعریف اور دائرہ

تیسری شرط مال کا حاجت اصلیہ (بنیادی ضرورت) سے زائد ہونا ہے۔ حاجت اصلیہ کی تعریف فقہاء یوں کرتے ہیں:

"ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا أو تقديرا"(۲)

حاجت اصلیہ ہر اس ضرورت کو کہتے ہیں جس کا استعمال انسان کو ہلاکت سے بچائے خواہ یہ ہلاکت سے بچانا حقیقۃً ہو یا حکماً پھر ہر دو کی تشریح کرتے ہیں،

"فالثانى كالدين والأول كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر والبرد وكآلات الحرفة وأثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها"(۳)

تقدیراً ہلاکت سے بچانے والی ضرورت مثلاً دین ہے کہ اگر کسی شخص کا بقایا اس کے ذمہ ہو، اور ادائے گی نہ کرے تو ذلت اٹھانی پڑے گی جو ہلاکت کے مرادف ہے، بلکہ اس کی وجہ سے قید بھی ہو سکتی ہے لہٰذا دین کی ادائے گی ایک بنیادی ضرورت ہے اور اپنی ذلت سے ضرر کا دفعیہ، بلکہ یہ ضرورت دوسری ضروریات کی بہ نسبت زیادہ اہم ہے۔

حقیقۃً ہلاکت سے بچانے والی ضروریات میں رہائش کا گھر، ہتھیار، استعمالی کپڑے جو سردی اور

---

(۱) الدر المختار ۲/۲۶ (۲) البحر الرائق ۲/۲۲۲، الدر المختار ۲/۶ (۳) البحر ۲/۲۰۶

گرمی سے دفاع کے لیے رکھے جائیں، گھر کے استعمالی ساز و سامان، سواری کا جانور اہل علم کے لیے کتابیں وغیرہ۔

ضرورت کے تحت رکھے ہوئے نقد کی زکوٰۃ

البتہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی شخص نے نقد رقم اپنی واقعی اور بنیادی ضرورت کی خاطر جمع کر رکھی ہے مثلاً رہائش کا گھر نہیں ہے وہ اس سے گھر خریدنا چاہتا ہے، کپڑے بنوانے ہیں، ابھی ان ضرورتوں کی تکمیل ہونے نہ پائی تھی کہ اس سے پہلے اس پر سال پورا ہو جاتا ہے تو کیا اس کی زکوٰۃ ذمہ پر واجب ہوگی؟ یا یہ رقم حاجت اصلیہ میں شمار کی جائے گی؟ اس سلسلہ میں فقہاء کے اقوال مختلف ہیں۔ محقق ابن نجیم شرح المجمع لابن الملک سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"فاذا كان له دراهم مستحقة ليصرفها الى تلك الحوائج صارت كالمعدومة اھ فقد صرح بان من معه دراهم وامسكها بنية صرفها إلى حاجته الأصلية لاتجب الزكاة إذا حال الحول وهي عنده ويخالفه ما في معراج الدراية في فصل زكوة العروض ان الزكاة تجب في النقد كيف ما امسكه للنماء أو للنفقة اھ وكذا في البدائع في بحث النماء التقديري" (۱)

جب کسی کے پاس کسی ضرورت کے پیش نظر کچھ دراہم موجود ہوں جو اس ضرورت میں خرچ ہونے ہیں تو وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ ابن الملک نے اس کی صراحت کر دی کہ بنیادی ضرورتوں میں خرچ کرنے کی نیت سے رکھے ہوئے دراہم میں خواہ ان پر سال گزر جائے زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جبکہ معراج الدرایہ کی فصل زکوٰۃ العروض میں اس کے خلاف ہے کہ نقد میں بہرحال زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، نماء (تجارت) کے لیے رکھا ہو یا خرچ کے لیے، اسی طرح بدائع میں نماء تقدیری کے تحت بھی مذکور ہے۔

علامہ شامی نے دونوں میں بڑی اچھی تطبیق پیدا کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ بدائع اور معراج الدرایہ وغیرہ کے بیان کا محمل یہ ہوگا کہ نقدی میں زکوٰۃ فرض اس وقت رہے گی جب کسی نے اس ارادے سے

---

(۱) البحر ۲/۲۲۲

رکھ رکھا ہو کہ اگر کوئی ضرورت پیش آئے گی تو خرچ کر دوں گا لیکن کوئی ضرورت پیش ہی نہ آئی کہ سال پورا ہو گیا، اب اس کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اگرچہ اس کا خرچ کرنے کا ارادہ اب بھی بدستور قائم ہے، لیکن اگر کسی متعین ضرورت کے پیش نظر رکھا تھا، مثلاً رہائش کا گھر بنانا ہے، سال پورا ہو گیا اور وہ ضرورت ہنوز باقی ہے تو اس صورت میں ان دراہم کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جیسا کہ شرح المجمع میں صراحت ہے۔(۱)

حاجت اصلیہ کا تعین احوال و ظروف کے اعتبار سے

اس میں شک نہیں کہ حاجت اصلیہ کا دائرہ ہر زمانے اور ہر ماحول کے اعتبار سے مختلف ہو سکتا ہے، جیسا کہ فقہاء کی تعبیر "کتب العلم لاھلہا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل علم کے لیے کتابیں حاجت اصلیہ ہیں جب کہ غیر عالم کے حق میں حاجت اصلیہ نہیں، چنانچہ کسی ماحول میں عام طور سے پانچ چھ جوڑے کپڑے استعمال کے لیے رکھے جاتے ہوں، ایسے ماحول میں کوئی شخص پچیس پچاس یا اس سے زائد جوڑے رکھتا ہو تو ظاہر ہے کہ ماحول کے اعتبار سے یہ اس کی پہننے کی ضرورت سے بہت زائد ہیں، لہٰذا اس کی حاجت اصلیہ سے باہر ہوں گے۔

لیکن اس کا اثر زیادہ سے زیادہ تحقق غنا پر پڑے گا، جس سے زکوٰۃ لینے کی حرمت، صدقۃ الفطر اور قربانی کا وجوب وابستہ ہوتا ہے نہ کہ وجوب زکوٰۃ پر کیوں کہ اس میں حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کے ساتھ نامی ہونے کی بھی شرط ہوتی ہے۔

چوتھی شرط۔ دین سے محفوظ ہونا

مال کا دین سے محفوظ ہونا حاجت اصلیہ سے زائد ہونے کی شرط کے تحت آجاتا ہے بایں معنی کہ یہ ایک معنوی ضرورت ہے، لیکن چوں کہ حسی حوائج اصلیہ کی بہ نسبت اس کی تفصیلات و احکام قدرے مختلف ہیں اس لیے فقہاء اس کو الگ سے مستقل شرط کی حیثیت سے ذکر کرتے ہیں، کسی شخص کے مال میں جملہ شرائط وجوب نصاب نامی وغیرہ موجود ہوں لیکن اس پر کسی قرض یا بقایا کا بار ہو تو پہلے بقایا کی مالیت اس کے نصاب سے

---

(۱) رد المحتار ۲/۶۰۲

منہا کرلی جائے گی، اس کے بعد اگر مال بقدر نصاب بچتا ہو تو اس میں وجوب زکوٰۃ کا حکم لگایا جائے گا۔

کس قسم کا دین وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں یوں ملتی ہے:

"قال في النهاية كل دين له مطالب من جهة العباد فإنه يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للعباد أو لله تعالى كدين الزكاة فالذي له مطالب من جهة العباد كالقرض وثمن المبيع وضمان المتلف وأرش الجراحة والمهر وسواء كان الدين من النقود أو الكيل أو الموزون أو الثياب أو الحيوان وسواء وجب بنكاح أو خلع أو صلح عن دم عمد وهو حال أو موجل"(1)

یعنی ہر وہ دین جس کا بندوں کی طرف سے کوئی مطالبہ کرنے والا ہو وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے چاہے وہ دین بندوں کا ہو جیسے قرض، مبیع کا ثمن، تلف کی ہوئی شئی کا ضمان، زخم کا تاوان اور مہر یا اللہ کا مثلاً دین زکوٰۃ کیوں کہ اس کا بھی مطالبہ کرنے والا امام موجود ہوتا ہے۔ برخلاف دین کفارہ اور دین نذر کے کہ امام المسلمین کو ان کا مطالبہ کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ پھر اس دین کا کوئی نقدی کے قبیل سے ہونا ضروری نہیں بلکہ جس قسم کا بھی ہو، خواہ کیلی ہو، وزنی ہو، مزروعات میں سے ہو یا عددی کے قبیل سے ہو، اس کا ذمہ پر وجوب چاہے معاملے کے ضمن میں ہوا ہو یا عقد نکاح کے یا خلع کے یا دم عمد (قصاص) پر عقد صلح کے نتیجہ میں، سردست واجب الاداء ہو یا ادھار۔

دین طویل الاجل کا حکم

حنفیہ کے نزدیک دین کے وجوب زکوٰۃ سے مانع ہونے کی جو تفصیل اوپر ذکر کی گئی اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ دین خواہ مؤجل ہو یا معجل بہر صورت اس کا ذمہ پر ہونا زکوٰۃ کی فرضیت سے مانع ہے، اس کی مدت لمبی ہو یا کم، لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ اصل چیز مطالبہ ہے اور مؤجل کا مطالبہ عادۃً معینہ مدت سے قبل نہیں ہوا کرتا، اس لیے مانع نہیں ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ عورت کا دین مہر جو مؤجل ہو اس کے بارے میں فقہاء کے درمیان

---

(1) الجوهرة النيرة ۱۳۹،۱۳۸/۱، البدائع ۲/۶

تین اقوال پائے جاتے ہیں اور مسئلہ خاصا مختلف فیہ ہے۔

(۱) ہر صورت مانع زکوٰۃ ہے۔

(۲) معجل، مانع ہے مؤجل نہیں۔

(۳) شوہر اگر ادائے گی کا پختہ ارادہ رکھتا ہو تو مانع ہے ورنہ نہیں۔

بدائع میں ہے:

"وعلى هذا يخرج مهر المرأة فإنه يمنع وجوب الزكاة عندنا معجلاً كان أو مؤجلاً لأنها إذا طالبته يؤاخذ به، وقال بعض مشائخنا إن المؤجل يمنع لأنه غير مطالب به عادة فإن كان المعجل فيطالب به عادة فيمنع وقال بعضهم إن كان الزوج على عزم من قضائه يمنع وإن لم يكن على عزم القضاء لا يمنع لأنه لا يعده دينا"[۱]

علامہ شامیؒ نے قہستانی سے دوسرے قول کا راجح ہونا نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"عزاه في المعراج إلى شرح الطحاوي وقال وعن أبي حنيفة لا يمنع وقال الصدر الشهيد لا رواية فيه ولكل من المنع وعدمه وجه زاد القهستاني عن الجواهر والصحيح أنه غير مانع"[۲]

اس مسئلہ میں ہمارے بزرگوں کے فتاویٰ بھی بہت مختلف نظر آتے ہیں، حضرت تھانویؒ کا تینوں قولوں کے مطابق فتویٰ موجود ہے[۳]، حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے تیسرے قول پر فتویٰ دیا ہے[۴]، اور فتاویٰ دار العلوم میں شامی پر اعتماد کرکے دوسرے قول کو اختیار کیا گیا ہے[۵]۔

آج کل حکومتیں جو اپنے شہریوں کو لمبی لمبی مدت پر بڑی بڑی رقمیں قرض کے طور پر دیتی ہیں جس کی ادائے گی سالانہ قسط وار کرنی ہوتی ہے ان کا حکم مذکورہ بالا نقول کی روشنی میں بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سالانہ واجب الادا قسط ہی نصاب زکوٰۃ سے منہا کی جانی چاہیے نہ کہ پوری مقدار قرض۔ اوّلاً اس وجہ سے کہ ان

---

(۱) بدائع ۲/۶ (۲) رد المحتار ۲/۵ (۳) امداد الفتاویٰ ۲/۹-۱۰

(۴) کفایت المفتی ۴/۲۳۶ (۵) فتاویٰ دار العلوم ۶/۱۵۰ و ۴۶

کے ارباب انتظام کو سخت آزمائش کا سامنا ہے۔ جہاں محتاج طلبۂ علم دین اور یتامیٰ جیسے مستحقین زکوٰۃ موجود ہوتے ہیں جن کی خاطر وہ قوم سے زکوٰتیں یا دیگر صدقات واجبہ وصول کر کے لاتے ہیں اور ان پر حسب حکم شرعی صرف کرنے کے پابند ہوتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ ان اداروں میں مستحقین کے علاوہ خرچ کی کچھ اور مدات بھی ہوتی ہیں جن میں صدقات واجبہ کی رقمیں صرف نہیں کی جاسکتیں اور کافی سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً ملازمین کی تنخواہیں، ادارے کی تعمیر اور ان پر آنے والے ضروری اخراجات بجلی پانی، اثاث فرنیچر وغیرہ۔ اور تجربہ شاہد ہے کہ ان میں سے اکثر اداروں کو صدقات واجبہ کے علاوہ اتنی رقم فراہم نہیں ہو پاتی جس سے وہ ادارے کے دوسرے اخراجات پورا کر سکیں، اس مشکل کو آسان کرنے کے لیے فقہ کی بعض جزئیات کو نظیر بنا کر زمانے کب سے حیلۂ متعارفہ کی ایک رسم بدچلی آرہی ہے جس پر مالکین خوش ہیں کہ ہم نے زکوٰۃ کی رقم مصرف پر خرچ کرنے دی اور منتظمین خوش ہیں کہ ہم نے مصرف پر خرچ کر لی، جب کہ حقیقت میں رقم اپنے مصرف پر خرچ نہ ہوئی، صرف ہتھ پھیر ہوا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"قطع نظر ورع سے میرے نزدیک قاعدۂ فقہیہ کے رو سے بھی یہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی کیوں کہ تملیک رکن زکوٰۃ ہے اور تملیک میں جب عاقدین ہازل ہوں تو تملیک نہیں ہوتی اور صورت متعارفہ میں دونوں شہادت قرائن قویہ معترف ہیں کہ تملیک مقصود نہیں۔" (۱)

ایک طرف اس دور جہل وضلالت میں علم دین کی روشنی پھیلانے کے لیے اس طرح کے اداروں کا قیام وعمل ضروری ہے تو دوسری طرف ان کی بقاء و دوام کی راہ میں مختلف مالی مشکلات کا سامنا ہے، ان مشکلات کے حل کی ایک راہ ڈھونڈی بھی گئی تو تجربہ نے بتایا کہ یہ خطرات سے محفوظ نہیں اس لیے ہمارے خیال میں حیلۂ متعارفہ سے ہٹ کر کوئی ایسی راہ عمل تلاش کرنا ضروری ہے جس سے شریعت کی حکم عدولی سے محفوظ رہتے ہوئے احیائے دین کے ان مراکز کو زیادہ سے زیادہ فروغ دیا جا سکے۔ سوالنامہ میں جو دو صورتیں ذکر کی گئی ہیں ان میں سے اول الذکر پر ہمیں اشکال ہے، جب کہ دوسری پر بحمد اللہ اطمینان ہے اور وہ حیلۂ متعارفہ کا نعم البدل کہ طالب علم پر آنے والے مجموعی اخراجات طالب علم کے ذمہ واجب الادا ہوں، اور چوں کہ وہ غیر مستطیع ہے اس لیے زکوٰۃ کی مد سے اتنی نقد رقم یا اس کا چیک طالب علم کو دے دیا جائے اور وہ اپنے

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۱۳

اوپر عائد قرض کی ادائے گی ہیں اس کو داخل مدرسہ کر دیا کرے۔

اول الذکر صورت کہ مدرسہ کا مہتمم خود ہی اتنی مقدار رقم مدز کوٰۃ سے ادا کر دیا کرے یہ محل اشکال اس وجہ سے ہے کہ اس کی بنیاد مہتمم ادارہ کو مستحقین کا ہر اعتبار سے وکیل تسلیم کرنے کے نظریہ پر قائم ہے جو بجائے خود محل نظر ہے۔

مہتمم طلبہ کا وکیل یا زکوٰۃ دہندگان کا؟

اس سلسلہ میں کل تین احتمالات ہیں۔ صرف زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہے، صرف طلبہ کا وکیل ہے، دونوں کا وکیل ہے ـــــ عام علمائے کرام کا رجحان یہی ہے کہ ہمارے ملک کے مدارس جو عوامی چندوں سے چلتے ہیں ان کے ارباب انتظام صرف اُ... سوال کی طرف سے زکوٰۃ کا مال مصرف پر خرچ کرنے کے سلسلہ میں وکیل ہیں اور مستحقین کے نائب یا وکیل نہیں، جیسا کہ حضرت مفتی محمد شفیع صاحب علیہ الرحمۃ کا بھی خیال ہے فرماتے ہیں:

"آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کے بھیجے ہوئے سفرا صدقات یا زکوٰۃ وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ یعنی مالداروں کے وکیل ہیں۔ ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے، اس لیے ان کا قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو مصرف پر خرچ نہ کر دیں۔

فقراء کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ حقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں اور امیر المومنین کی ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود وکالت فقراء حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک وہ اس مال کو خرچ نہ کر دیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔"[1]

لیکن اس صورت میں کئی ایک اشکالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

---

(۱) معارف القرآن ۴/۳۹۹ - ادارۃ المعارف کراچی

(۱) مہتمم اس کو دوسرے اموال میں خلط کر دے تو استہلاک کی وجہ سے اس کی ملک ہو جانا چاہیے اور جو کچھ خرچ کرے گا وہ اس کی جانب سے تبرع ہوگا اور معطیین کے لیے اتنے کا ضامن۔

(۲) معطی جب مر جائے گا اور مال مہتمم کے قبضہ میں بدستور باقی ہو تو اس مال کا اس کے ورثہ کی طرف لوٹانا واجب ہوگا جن کی تلاش و جستجو اس کی ذمہ داری ہے۔

(۳) جب رقم ارباب اموال کی ملک ہے تو جس معطی نے زکوٰۃ کی رقم مثلاً نصاب یا اس سے زائد مقدار میں دی ہو اور اس پر سال گزر جائے تو اس کی زکوٰۃ بھی مالکین پر لازم ہونی چاہیے کیوں کہ وکیل کا قبضہ خود موکل کا قبضہ ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مصرف طلبہ اور مستحقین کا وکیل قرار دیا جائے تو اس صورت میں مال کا مہتمم کے قبضہ میں آجانا گویا طلبہ کے قبضہ میں آجانا ہے اور وہ ان کی طرف سے ہر ایسے کام میں خرچ کرنے کا مجاز ہوگا جس میں کسی بھی اعتبار سے طلبہ کا فائدہ ہو۔

لہٰذا تملیک کی بھی ضرورت نہ ہوگی، اسی طرح طلبہ کی خوراک، پوشاک یا نقد کی صورت میں مالک بنانے کے علاوہ تنخواہ ملازمین، مدرسہ کی تعمیر وغیرہ دوسری مدات میں صرف کرنے کا بھی جواز ہوگا اور حیلۂ متعارفہ جیسے بے کار عمل سے نجات مل جائے گی۔

لیکن اس میں ایک زبردست اشکال یہ رہ جاتا ہے کہ زمانہ رسالت علیہ السلام یا آپ کے بعد اسلامی بیت المال میں جو زکوٰتیں وصول ہو کر آتی تھیں روایات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مصارف ثمانیہ ہی میں خرچ کیا جاتا تھا، حالاں کہ امیر المومنین کی ولایت عامہ ہونے کی وجہ سے فقرا اور مستحقین کی طرف سے امام کو یقیناً وکالت و نیابت دلالۃً حاصل تھی، امام کا قبضہ خود مستحقین کا قبضہ تھا، گویا کہ مستحقین نے قبضہ کر کے امام کو اس کے خرچ کرنے کا اختیار دے دیا تھا، پھر بھی عہد نبوی، عہد خلفاء راشدین یا قرون اولیٰ میں کوئی ایسی نظیر نہیں ملتی کہ صدقۂ واجبہ کی رقم رفاہ عامہ کے کاموں یا عاملین کے علاوہ سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں صرف کی گئی ہو بلکہ اس کے برعکس ابوداؤد شریف میں ایک مرفوع حدیث ہے جس سے یہ متعین ہو جاتا ہے کہ ہرچند کہ زکوٰۃ پر امام کا قبضہ مستحقین کا قبضہ ہے لیکن ان کو اس کا مالک بنانا ضروری ہے اور ان کے علاوہ کسی اور جگہ پر صرف کرنا جائز نہیں ہے۔

روایت کے الفاظ یہ ہیں:

" فاتاہ رجل فقال اعطنی من الصدقۃ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لم یرض بحکم نبی ولا غیرہ من الصدقات حتی حکم فیہا ھو فجزءھا ثمانیۃ اجزاء فان کنت من تلک الاجزاء اعطیتک " (۱)

ایک شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور کہا کہ صدقات میں سے مجھے بھی دیا جائے آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ صدقات کی بابت کسی نبی یا غیر نبی کے فیصلہ پر راضی نہیں بلکہ خود اس نے مصارف زکوٰۃ کی آٹھ قسمیں کردی ہیں اگر تو ان میں سے ہے تو میں دے سکتا ہوں ورنہ نہیں۔

لہٰذا جب اسلامی بیت المال کے ذمہ دار کو یہ حق نہیں تو آج کے مدارس کے نظماء کو کیوں کر یہ حق پہونچے گا کہ غیر مصرف میں زکوٰۃ صرف کروالیں۔

اس لئے تیسری صورت متعین ہوجاتی ہے کہ ہر اعتبار سے مہتمم معطیین کا وکیل ہے اور نہ ہر اعتبار سے طلباء اور مستحقین کا بلکہ بعض بعض پہلوؤں سے ہر دو کے نائب اور وکیل کا درجہ رکھتا ہے، قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ نے پہلی صورت کے تحت مذکورہ اشکالات کے جواب میں یہی بات ارشاد فرمائی ہے:

" مہتمم مدرسہ کا قیم و نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسا کہ امیر نائب جملہ عالم کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی، مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے اس کے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہوگیا اگرچہ وہ مجہول الکمیت والذوات ہوں مگر نائب معین ہے، پس بعد موت معطی کے ملک ورثہ معطی کی اس میں نہیں ہوسکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہوسکتا ہے بہرحال زر وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہوگی اور نہ خود معطی کی ملک ہے " (۲)

یہی بات حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری رحمہ اللہ نے حضرت مولانا اشرف علی صاحب علیہ الرحمۃ کے ایک اشکال کے جواب میں کہی ہے:

" ہمارے نزدیک مدارس کا روپیہ وقف نہیں مگر اہل مدرسہ مثل عمال بیت المال معطیین اور آخذین

---

(۱) سنن ابو داؤد ۱/۲۳۰ (۲) تذکرۃ الرشید ۱/۱۲۵، ۱۲۶

کی طرف سے وکلا ہیں لہٰذا اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور نہ معطیین واپس لے سکتے ہیں۔ (۱)

یہ حقیقت ہے کہ ارباب مدارس لوگوں کی زکوٰۃ وصول کر کے مصرف میں خرچ کرنے پر اللہ کی طرف سے مامور نہیں ہیں، جیسا کہ امیر المومنین مامور ہے، بلکہ وہ اور وہ چلانے کے لیے مالکین اموال سے صدقات وصول کرتے ہیں اور دینے والے حضرات صراحۃً انھیں مصرف پر خرچ کرنے کا وکیل بنادیتے ہیں، دوسری طرف ظاہر ہے کہ مستحقین نے صراحۃً انھیں اپنا وکیل بنایا نہیں، لیکن چوں کہ احیاء دین کی خاطر مدارس کی داغ بیل ڈالی گئی ہے اور ان کا انحصار ان ہی صدقات وعطیات پر ہے اس لیے بر بنائے ضرورت ارباب انتظام کو (جن کا تعین ارباب حل وعقد کے مشورے سے ہوتا ہے اور عوام وطلبہ عرفاً ان کے اہتمام کو تسلیم بھی کرتے ہیں) امیر المومنین کے قائم مقام تسلیم کر لیا گیا ہے تاکہ وہ پیچیدگیاں لازم نہ آئیں جو پہلی صورت کے ذیل میں بطور اشکال ذکر کی گئیں اور قاعدہ ہے "الضرورات تتقدر بقدرها"

لہٰذا جس قدر ضرورت داعی ہوگی اسی قدر ان کو فقراء کا نائب تسلیم کیا جائے گا، اور یہاں ضرورت صرف اس قدر ہے کہ مال معطیین کی ملک سے نکل جائے تاکہ ان کے مرنے پر ورثہ کی طرف واپسی لازم نہ ہو، خلط (جس سے بچنا عادۃً ناممکن سا ہو گیا) کی وجہ سے استہلاک نہ لازم آئے، اسی طرح اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہو نیز زکوٰۃ وصول کر کے لانے والوں کو عاملین کی طرح زکوٰۃ میں اجرت دینا جائز ہو جائے۔ باقی قصداً مال ضائع کردینے کی صورت میں ضامن ہونے کی بابت اور مصارف پر صحیح طریقے سے خرچ کرنے کی بابت وہ مالک معطیین یعنی مالکین ہی کے وکیل ہوں گے نہ کہ طلبہ کے۔ واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم واحکم۔

مدارس کے سفراء العاملین کے مصداق ہیں؟

مدارس کے سفراء جو وصولی صدقات کے لیے بھیجے جاتے ہیں "العاملین علیہا" کے مصداق ہیں یا نہیں؟ اس سلسلہ میں علماء کرام کی آراء مختلف ہیں مگر اپنی ناقص معلومات کی حد تک ہم جس نتیجہ پر پہنچے ہیں وہ یہ کہ ضرورۃً انھیں بھی عاملین کا مصداق قرار دینا چاہیے جیسا کہ ضرورۃً مہتمین کو بعض پہلوؤں سے

---

(۱) فتاویٰ خلیلیہ ۱/۳۸۱، امداد الفتاویٰ مع التبویب ۲/۲۶، فتاویٰ امدادیہ موسوم بفتاویٰ اشرفیہ ۲/۳۷، جس میں حضرت تھانوی اور مولانا خلیل احمد صاحب کی مفید علمی مکاتبت ہے جس کی مراجعت سے اشکالات رفع ہو جاتے ہیں۔

امیر المؤمنین یا عمال کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس ادارہ کی بہت سی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں مثلاً یہی کہ باضابطہ تنخواہ پر سفراء کا تقرر کرنے میں بسا اوقات ان پر جو خرچ ہوتا ہے اس سے مدرسہ کو نقصان پہونچتا ہے آمد کا تناسب کم اور خرچ کا تناسب زائد آتا ہے۔ اب اگر ان کو عاملین کے تحت داخل ما جائے گا تو ان پر عامل کے احکام آئیں گے اور عامل کو اتنی ہی مقدار دی جاتی ہے جو اس کے وصولی پر جانے اور لوٹنے کی درمیانی مدت میں اس کی جملہ ضروریات کی اوسط طریقہ پر کفایت کر سکے اور ساتھ ہی اس بات کا لحاظ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس کی اجرت اس کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے بڑھنے نہ پائے ورنہ کمی کی جائے گی۔ (۱)

چنانچہ جب سفیر کو اس کی فکر ہوگی کہ اگر صدقات کی وصولی مجھ سے کم ہوئی تو لازماً میرے اوسط درجہ کے اخراجات وصول شدہ رقم کے نصف سے بڑھ جائیں گے اور اس میں میرا نقصان ہوگا تو وہ زیادہ جمع کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس صورت میں بہر حال آمد کا تناسب اخراجات سے زائد ہوگا، ہمارے اس خیال کی تائید مفتی کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے فتویٰ سے بھی ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

"زکوٰۃ کی رقم وصول کرکے لانے والوں کو اسی رقم میں سے اجرت عمل دینے کی گنجائش ہے خواہ وہ غنی ہوں، مگر کسی حال میں ان کی وصول کی ہوئی رقم کے نصف سے زیادہ نہیں دی جائے گی۔"

نیز فرماتے ہیں:

"اموال زکوٰۃ و قیمت چرم قربانی میں سے اجرت عامل (سفیر چندہ) دینے کا جواز تو قابل تردد ہے اور اس صورت میں حیلۂ تملیک کی ضرورت بھی معلوم نہیں ہوتی۔" (۲)

واضح رہے کہ عاملین کے مصداق صرف محصلین اور سفراء ہی ہو سکتے ہیں وہ عملہ نہیں جو حساب آمد و خرچ کے اندراج پر مامور ہے کیوں کہ قرون اولیٰ میں کہیں سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وصول کرکے لانے والے کے علاوہ محرر بیت المال محافظ وغیرہ کو صدقات میں سے تنخواہ دی گئی ہو۔

کمیشن پر زکوٰۃ کی فراہمی

فقہ حنفی کے اصول بیوع و اجارات کی رو سے ہر ایسا معاملہ جس میں معقود علیہ یا اس کا بدل مجہول ہو

---

(۱) روح المعانی ۱۰/۱۲۱، تفسیر الخازن ۳/۱۵۰ (۲) کفایت المفتی ۴/۲۶۹

ناجائز ہوتا ہے، چنانچہ مذکورہ مسئلے میں بھی اسی علت کے باعث اہل علم بالخصوص ارباب افتا، عدم جواز کا فتویٰ دیتے آئے ہیں۔ کمیشن پر چندہ کرانے میں جو امور عدم جواز کے متقاضی ہیں وہ درج ذیل ہیں:

۱ـــــ اجرت مجہول ہے، کیوں کہ کمیشن وصولی کے تناسب سے ہوگا، معلوم نہیں وصولی زیادہ ہوگی یا کم، اگر اتنی کم ہوئی کہ جس کے کمیشن سے اس کا سفر خرچ وغیرہ بھی نہ نکل پائے تو یہ مستقل باعث نزاع ہے کہ سفیر فراہمی چندہ کے لیے دردر کی ٹھوکریں کھائے اور نتیجہ صفر ہو، لہذا منتظم سے الجھنا ممکن ہے۔ اسی طرح وصولی اتنی زیادہ کر لایا کہ اس کا کمیشن ہی پچیس تیس ہزار تک پہونچ جاتا ہے تو منتظمین کی نیتیں ڈگمگانے لگتی ہیں، یہ محض احتمال نہیں بلکہ ایسے واقعات رونما ہوتے دیکھے گئے ہیں۔

۲ـــــ جب سفیر عامل صدقہ کے حکم میں ہے تو اس کے اوپر اخراجات میں میانہ روی برتنا اور اسراف وتقصیر (فضول خرچی وتنگی) سے اجتناب لازم ہوگا، فضول خرچی سے اس لیے کہ یہ مال فقرا کا ہے اور جو کچھ بطور حق الخدمت اسے دیا جاتا ہے وہ ضرورۃً ہے اور ضرورت کو بقدر ضرورت ہی اختیار کیا جاتا ہے اور تنگی سے اجتناب اس لیے لازم ہے کہ خود خسارہ میں نہ پڑے اور بعد کو بد دل ہو کر یہ کام ہی چھوڑ دے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں:

"علی الامام أن یبعث من یرضی بالوسط من غیر إسراف ولا تقصیر" (۱)

زیر بحث مسئلہ میں اگر سفیر کے ہاتھوں چندہ کم ہوگا تو تبذیر کا مرتکب ہوگا، جو فقرا کی حق تلفی ہے اگرچہ برابر سرابر بھی صورت ہو سکتی ہیں لیکن پہلے دونوں امکانات اس کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور "درء المفاسد أولی من جلب المنافع" (۲)

عدم جواز کی پہلی علت کے سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ میں جہالت ایسی نہیں جس سے لازماً نزاع اور جھگڑا پیدا ہو اور جہالت وہی مضر ہے جو مفضی الی النزاع ہوتی ہے چنانچہ بہت سے معاملات جن میں معقود علیہ یا اس کا بدل مجہول ہوتا ہے مگر اس کی جہالت باعث نزاع نہ ہونے کی وجہ سے قابل اعتراض نہیں اور وہ معاملے جائز ہیں، مثلاً مزارعت (بٹائی) درختوں پر پھلوں کی بیع جو لازماً مجہول

---

(۱) روح المعانی ۹/۱۲ (۲) المدخل الفقہی للزرقاء ۲/۹۸۵

ہوتے ہیں اور مضاربت وغیرہ۔

لیکن ان معاملات کی حقیقت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چوں کہ لوگوں کی عام ضروریات ان سے وابستہ ہو گئی ہیں اور ان کا عرف و تعامل بن چکا ہے، اس لیے ان کی جہالت کسی کے لیے قابل اعتراض نہیں ہوتی اور کوئی نزاع نہیں ہوتا، مگر جب تک ان میں عرف نہیں ہوتا تب تک دو چند اشخاص اگر اس قسم کے معاملات کرتے ہیں چاہے ان میں بالفعل منازعت نہ بھی ہو تب بھی وہ معاملے ناجائز کیے جاتے ہیں۔

گویا زیر بحث مسئلہ میں بھی اجرت کی جہالت باعث نزاع اسی وقت نہیں ہوگی جب اس کا عرف و تعامل ہو جائے ورنہ اکا دکا اشخاص اور دو چند اداروں کے ذمہ دار جو اس طرح کا معاملہ کریں خواہ بالفعل ان میں جھگڑا رونما نہ بھی ہو تب بھی معاملہ ناجائز ہی کہا جائے گا، الا یہ کہ اس مسئلہ میں بھی عام ضرورت اور عرف و تعامل معتبر حد تک تسلیم کر لیا جائے جو محل نظر ہے، جیسا کہ عرف کی تعریف "ھو عادۃ جمھور قوم فی قول او فعل"[1] سے کی گئی ہے۔

رہی عدم جواز کی دوسری دلیل تو اپنی جگہ پختہ ہے اس لیے مسئلہ کا حل اسی میں ہے کہ اگر سفیر کو عامل صدقہ کا مصداق قرار دیا جاتا ہے تو اجرت بھی اسی طرح دی جائے جس طرح عامل کو دی جاتی تھی۔

مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کے مصداق کے سلسلہ میں صحابہ، تابعین، ائمہ مجتہدین متقدمین و متأخرین کا جس پر اتفاق ہے اس سے اختلاف کرنے کی جرأت ہماری نگاہ میں سخت خطرناک ہے ان سب حضرات کی تصریحات کو یکسر پس پشت ڈالتے ہوئے لفظ کے محض ظاہری لغوی معنی کو پکڑ کر توسیع یا تعمیم کا نظریہ بالکل غلط ہے۔

جس طرح صوم، صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ شریعت کی مخصوص اصطلاحیں ہیں اسی طرح فی سبیل اللہ شریعت کی ایک مخصوص اصطلاح ہے، شریعت نے ان الفاظ کو ان کے لغوی معانی سے نکال کر ایک مخصوص مفہوم کیلیے

---

(۱) المدخل الفقھی ۲/۸۴۰

متعین کر دیا ہے اسی طرح یہ لفظ سبیل اللہ بھی ایک خاص معنی کے لیے متعین ہو کر رہ گیا ہے اور وہ غزوہ اور جہاد عسکری ہے اور جب بھی کتاب و سنت میں یہ لفظ مطلق بولا جاتا ہے تو یہی معنی مراد ہوتا ہے۔

مسئلہ چوں کہ اجماعی ہے اور ماضی و حال کے علماء حق نے بحمد اللہ اس سلسلہ میں پیدا ہونے والے سبھی شکوک و شبہات کا جائزہ خوب اچھی طرح لے کر غلط فہمی یا گمراہی کے جتنے راستے ہو سکتے ہیں سب کو مسدود کر دیا ہے اور منشا شریعت کی بھرپور ترجمانی کر دی ہے (فجزاہم اللہ خیر الجزاء) اس لیے زیر بحث موضوع پر تفصیلی گفتگو کے بجائے ہمارے لیے صرف ایک راہ نظر آتی ہے کہ مسئلہ کی تنقیح کے ضمن میں ذکر کردہ نکات اور سوالات کا جواب صرف ہاں یا نہیں میں دے دیا جائے اور بوقت ضرورت دو چار جملوں میں مقصد کی وضاحت بھی کر دی جائے اور بس۔

(۱) آیت کریمہ میں حصر حقیقی ہے، جہاں تک حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کا تعلق ہے اس آپ کی رائے بھی جمہور امت سے مختلف نہیں ہے، بلکہ آپ نے جس انداز سے آیت کریمہ کی تشریح کی ہے وہ ان لوگوں کے منہ پر زوردار طمانچہ ہے جو شاہ صاحب کو اپنا نظریاتی مقتدا و پیشوا کہتے ہوئے ایک لمحہ کے لیے تھکتے نہیں اور نظریہ توسیع فی سبیل اللہ کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔

شاہ صاحب پہلے تو جمہور کی طرح صدقات واجبہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ ان کا حق یہ ہے کہ کسی مستحق کو ان کا مالک بنا دیا جائے نہ کہ مساجد، مدارس اور رفاہ عام کے کاموں میں صرف کیا جائے جہاں تملیک مفقود ہوتی ہے۔ پھر اپنے حکیمانہ مزاج کے مطابق مصارف کو تین بنیادی جامع تعبیروں میں سمیٹتے ہوئے فی سبیل اللہ کی جگہ غزاۃ کا لفظ استعمال کرتے ہیں جو بالکل جمہور کے مطابق ہے۔ مصارف کی توضیح کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ چوں کہ منافقین حضور پاک کو صدقات کی بابت طعن و تشنیع کے ذریعہ چاہتے تھے کہ ہماری خواہش کے مطابق صدقات کا مصرف محدود کر دیا جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ نہیں! اس میں تو بہت سے لوگوں کا حق ہے اور اس میں توسیع ضروری ہے جن کا دائرہ ان آٹھ مصارف کی حد تک وسیع ہوگا تاکہ اس سے مسلم معاشرہ میں توازن پیدا ہو سکے۔ ان آٹھوں مصارف سے تجاوز نہ ہوگا۔ اگر شاہ صاحب کی مراد وہی ہو، جیسا کہ ظاہر الفاظ سے متبادر ہوتا ہے کہ حصر اضافی ہے اور ان مصارف کا ذکر صرف منافقین کے مقابلہ میں آگیا ہے ورنہ تو ان میں فی نفسہٖ توسیع کی گنجائش ہے تاکہ عوامی ضروریات انجام پا سکیں تو یہ شاہ صاحب کے انداز تشریح کے سراسر خلاف ہوگا، کیوں کہ جن وجوہ میں تملیک نہیں انھیں سب سے پہلے شاہ صاحب خارج

کر چکے ہیں۔ باقی فقراء، مساکین، مسافرین اور قرض داروں کو محتاجین میں شامل کر لیا، غازیوں اور عاملین کو حفظ سے تعبیر کر دیا، رہا فی الرقاب اور مؤلفۃ القلوب تو اس کی الگ سے نشاندہی کی۔ تو اب لے دے کر صرف اغنیاء بچ جاتے ہیں جن کو نہ دینا واضح ہے کہ مال صدقہ انہیں سے تو وصول کیا گیا ہے۔

(۲) جیسا کہ جمہور مفسرین اور فقہاء نے قرآن و حدیث کے تتبع سے جو یہ کہا ہے کہ قرآن و حدیث میں کسی قید و قرینہ کے بغیر جب لفظ فی سبیل اللہ بولا جاتا ہے تو اس سے غزوہ اور جہاد عسکری ہی مراد ہوتا ہے اس کے ہم ماننے کے پابند ہیں۔

(۳) احناف کا اصول یہ ہے کہ جب کسی مسئلہ میں مختلف اقوال صحابہ کے دوران پائے جاتے ہوں تو احناف ان ہی میں سے کسی ایک کو ترجیحی دلائل سے منتخب کر لیتے ہیں یا کوئی تطبیق کی صورت پیدا کرتے ہیں۔ ان اقوال کی حد سے تجاوز نہیں کرتے۔ جیسا کہ شیخ عبدالوہاب شعرانی شافعی امام ابوحنیفہ کا قول نقل کرتے ہیں:

"ما جاءنا عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فعلی الرأس والعین بأبی ھو وأمی ولیس لنا مخالفۃ وما جاءنا عن اصحابہ تخیرنا وما جاءنا عن غیرھم فھم رجال ونحن رجال" (۱)

(۳) الف: فی سبیل اللہ سے مراد محتاج غازی ہیں اگرچہ امام محمد رحمہ اللہ نے ضرورت مند حاجیوں کو بھی اس کا مصداق قرار دیا ہے لیکن احناف کے نزدیک امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف ہی کا قول مفتی بہ ہے۔ فقہاء متاخرین میں سے بعض نے محتاج طلبہ علوم دین کو بھی اس میں داخل مانا ہے جس کا مقصد ان کی زیادہ استحقاقیت ثابت کرنا ہے کہ اس میں دہرا اجر ہے۔

(ب): تینوں میں فقر کی شرط ضروری ہے:

"ولا یصرف الی اغنیاء الغزاۃ لان المصرف ھو الفقیر" (۲)

(۵) مصارف زکوٰۃ کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اگر دیکھا جائے تو اس میں فقراء، اغنیاء کا فرق

---

(۱) بحوالہ درس ترمذی ۱/۱۹۰ (۲) فتح القدیر ۲/۲۶۵، دار احیاء التراث العربی

(۳) الہدایہ ۱/۱۸۶

اور مسلمان بھی قسم کے لوگ ہیں، مجموعی اعتبار سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاص امر تعبدی ہے جس کی پابندی ضروری ہوتی ہے، اس پر کسی دوسرے امر کو قیاس کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ اس سلسلہ میں مولانا عبدالرزاق صاحب قاضی شریعت ضلع کٹیہار کی یہ بات کیا خوب ہے۔

"آٹھ مصارف کے بارے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ان میں تین مال دار بھی ہو سکتے ہیں اور ایک زمانۂ نبوی میں کافر تھا جو عہد فاروقی میں الغا کر دیا گیا اور چار میں فقر وغیرہ شرط ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف مال دار اور غریب کافر اور مسلمان متضاد صفات والے ہیں۔ یہ بجائے خود دلیل ہے کہ مصارف صدقات واجبہ زکوٰۃ وغیرہ کا تعین انسان کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے۔"

اس لیے ہمارے نزدیک مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہی نہیں کیوں کہ امر تعبدی پر قیاس کرنا جائز نہیں۔

(۴) ظاہر ہے کہ یہ ضرورت بمعنی حاجت ہے نہ کہ ضرورت بمعنی اضطرار۔ یہ صحیح ہے کہ حاجت کو بمنزلۂ ضرورت بعض مواقع میں تسلیم کیا گیا ہے لیکن صرف ان ہی احکام میں جہاں کوئی نص قطعی موجود نہ ہو بلکہ نص عام ہو یا مسئلہ قیاسی و اجتہادی ہو اور مصارف زکوٰۃ نص صریح قطعی سے متعین کیے گئے ہیں اس لیے ان میں کسی حاجت کو دخیل بنانا نص کی مخالفت ہوگی جو جائز نہیں۔ شیخ مصطفےٰ احمد زرقا، حاجت و ضرورت کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" أما الأحكام التي تثبت بناءً على الحاجة فهي لا تصادم نصاً و لكنها تخالف القواعد والقياس"۔ (۱)

اس لیے اکیڈمیوں، تنظیموں یا رفاہی اداروں کی یہ ضرورت چنداں اس حکم قطعی کو مس نہ کر سکے گی اور براہ راست صدقات واجبہ کی رقم ان میں خرچ نہیں ہو سکتی۔

وصلی اللہ علی سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم وصحبہ أجمعین

---

(۱) المدخل الفقهي، ج ۲ فقرہ ۶۰۲

خلاصۂ جوابات

محور اول، ملک تام

۱۔ ثمن کی زکوٰۃ بائع کے ذمہ ہے اور مبیع کی زکوٰۃ خریدار پر قبضہ کے بعد سے واجب ہوگی۔

۲۔ کرایہ کی پیشگی رقم کرایہ دار کا دین قوی اس کی زکوٰۃ اس کے ذمہ پر لازم ہے۔ ادائے قبضہ کے بعد سابقہ کی بھی ہوگی۔

۳۔ حصص اموال میں زکوٰۃ نہیں لیکن مخلوط ہونے کی صورت میں اگر علاوہ کوئی نصاب موجود ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۴۔ مدارس وغیرہ کے سرمایہ پر زکوٰۃ نہیں۔

۵۔ دین قوی کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ ہوتی ہے۔ ادائے گی لازم کر خمس نصاب پر قبضہ کے بعد کرے گا تو بقیہ مال وصول کرے تو قبضہ کے بعد زکوٰۃ فرض ہوگی۔

۶۔ پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر قبضہ ہونے کے بعد سے زکوٰۃ ہوگی سابقہ کی نہیں۔

۷۔ کمپنی بحیثیت کمپنی پر زکوٰۃ نہیں بلکہ جو شیئر ہولڈر مالک نصاب ہوں گے ان کے حصص میں زکوٰۃ آئے گی۔

۸۔ شیئر کی زکوٰۃ شیئر ہولڈر کے ذمہ ہے۔ واقعی مالیت تو اس کی کمپنی سے اس کی تفصیل دریافت کر کے اس کے مطابق زکوٰۃ دینی ہوگی۔ تفصیل نہ ملنے پر بازاری نرخ معیار ہوگا۔ اور بونڈس دین قوی ہے قبضہ کے بعد سابقہ سالوں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

۹۔ اموال تجارت جو بھی ہوں ادائے گی کے وقت ان کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوٰۃ نکالی جائیگی اور زمین کی متوقع قیمت فروخت کے حساب سے۔

۱۰۔ ہیرے جواہرات اگر تجارت کی غرض سے نہیں ہیں تو ان کی زکوٰۃ نہیں خواہ لاکھوں کی مالیت کے برابر ہوں۔

۱۱۔ حاجت اصلیہ کا تعین حالات و زمانے کے اعتبار سے ہوگا۔ مگر اس کا اثر وجوب زکوٰۃ پر نہیں پڑتا۔

المال مملوكا في اليد فلو ملك شيئا لم يقبضه فلا تجب فيه الزكاة كصداق المرأة قبل قبضه فلا زكوة عليها فيه۔

اور فتاوی عالمگیری میں ہے: [1]

منها الملك التام وهو ما اجتمع فيه الملك واليد، وأما إذا وجد الملك دون اليد كالصداق قبل القبض أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة۔ كذا في السراج الوهاج۔

وفي الجوهرة[2]: لأن الملك التام هو ما اجتمع فيه الملك واليد، وأما إذا وجد الملك دون اليد كملك المبيع قبل القبض والصداق قبل القبض أو وجد اليد دون الملك كملك المكاتب والمديون لا تجب فيه الزكاة۔

اس ذیل میں چند سوالات کے جوابات

جواب ۱: وجوب زکوٰۃ کی شرط ملک تام ہے یعنی ملکیت کے ساتھ قبضہ بھی ہو، چونکہ صورت مسئولہ میں یہ شرط مفقود ہے لہٰذا زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جب قبضہ ہو جائے گا تو صحیح قول کے مطابق دین قوی میں شمار کر کے زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگا۔

كما في البحر الرائق[3]: وأطلق الملك فانصرف إلى الكامل وهو الملك رقبة ويدا، فلا تجب على المشتري فيما اشتراه للتجارة قبل القبض ولا على المولى في عبده المعد للتجارة إذا أبق لعدم اليد۔ الخ۔

وفي فتح القدير[4]: ويخرج أيضا المشتري للتجارة إذا لم يقبض حتى حال حول لا زكوة فيه إذا لم يستفد ملك التصرف وكمال الملك بكونه مطلقا للتصرف۔

---

(۱) ۱۷۲/۱ (۲) ۱۴۸/۱ (۳) ۲۰۲/۲ (۴) ۴۸۳/۱

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے: (۱)

واما المبیع قبل القبض فقیل لا یکون نصابا والصحیح انہ یکون نصابا کذا فی محیط السرخسی۔

جواب ۳: کرائے کی مدت میں دی گئی پیشگی رقم کی زکوٰۃ یا زرِ ضمانت جو عقد اجارہ کے فسخ ہو جانے یا مدت پوری ہونے پر کرایہ دار کو واپس کیا جاتا ہے اس صورت میں فقہاء متقدمین رحمہم اللہ کے درمیان اختلاف رائے ہے بعض فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ دینا کرایہ دار اور مالک مکان دونوں پر احتیاطاً واجب ہوگی، لیکن علامہ شامی کے قول کے مطابق صرف مشتری پر لازم ہوگی اور علامہ شامی کے قول کی تائید ہوتی ہے صاحب بدائع کے بعض مشائخ کے قول سے اور وغیرہ کے قول سے بھی۔

کما فی خلاصۃ الفتاوی (۲): الاجارۃ الطویلۃ التی یفعلها الناس فی زماننا .... فزکاۃ الاجرۃ المعجلۃ فی هذه الاجارۃ الطویلۃ تجب علی الآجر واما علی المستاجر فتجب ایضا ذکرہ الشیخ الامام محمد الائمۃ السرخسی فی الجامع الکبیر وعلی هذا فی البیع الذی اعتادہ اهل هذا الدیار وهو البیع الذی یعد فیه الوفاء ان زکاۃ ذلک علی البائع ان بقی فی یدہ ویجب ان یلزم المشتری ایضا. وفی الجامع للسید الامام ابی شجاع لا زکاۃ علی المستاجر والاحتیاط ان یزکی کل واحد منهما۔

وفی البدائع (۳): وذکر الشیخ الامام ابوبکر محمد بن الفضل البخاری فی الاجارۃ الطویلۃ التی تعارفها اهل البخاری ان الزکاۃ فی الاجرۃ المعجلۃ یجب علی الآجر لانه ملکه قبل الفسخ وان کان یلحقه دین بعد الحول بالفسخ وقال بعض مشائخنا انه یجب علی المستاجر ایضا لانه یعد ذلک مالا موضوعا عند الآجر۔

---

(۱) ۱/۸۸ (۲) ۱/۲۴۹ (۳) ۲/۹

وفی رد المحتار علی الدر المختار[۱]: قالوا ثمن المبیع وفاء ان بقی حولا فزکاته علی البائع لانه ملکه وقال بعض المشائخ علی المشتری لانه یعده مالا موضوعا عند البائع فیواخذ بما عنده بدائع وذکر فی الذخیرة ان زکاته علیهما للتعلیلین المذکورین قال ولیس هذا ایجاب الزکاة علی شخصین فی مال واحد لان الدراهم لا تتعین فی العقود والفسوخ وهکذا ذکر فخر الدین البزدوی هذه المسئلة ایضا فی شرح الجامع اھ ومثله فی البزازیة قلت ینبغی لزومها علی المشتری فقط علی القول الذی علیه العمل الآن من ان بیع الوفاء منزل منزلة الرهن وعلیه فیکون الثمن دینا علی البائع۔ تأمل۔

جواب ۳: دینی مدارس اور اداروں وغیرہ میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ کیوں کہ یہ مال موقوف کے مانند ہے جو متولی یا مہتمم حضرات کے پاس بطور امانت رہتا ہے جن کا خود وہ حضرات مالک ہونے کی حیثیت سے اپنی ذات کے لیے تصرف کرنے کا بالکل اختیار نہیں رکھتے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ اس قسم کے جمع شدہ مال پر وجوب زکوٰۃ کی شرائط میں سے ملک تام کی شرط مفقود ہے۔

کما فی کتاب الفقه علی المذاهب الاربعة[۲]: ولا زکاة فی المال الموقوف لعدم الملك فیه۔

وفی رد المحتار علی الدر المختار[۳]: فلا زکاة فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك الخ۔

جواب ۴: جو مال کسی شخص کے قبضہ میں بطور حرام آگیا ہے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ اگر حلال و حرام اموال مخلوط ہوگئے ہوں کہ تمیز مشکل ہوجائے اس شرط پر کہ اس کے پاس اس مال مخلوط کے سوا دوسرا اتنا مال بھی پایا جاتا ہو جس سے مال مغصوب والا قرض وہ ادا کرسکے تو غاصب کا مال شمار کرکے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یعنی کسی کے پاس اپنا ذاتی مال پہلے سے تھا اس نے کسی دوسرے کا مال چھین کر اس طرح ملا لیا کہ

---

(۱) ۲/۹ (۲) ۱/۵۹۲ (۳) ۲/۵

ایسے چھوٹے ہوا مال اس سے جدا نہیں ہو سکتا ہے امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ یہ ضائع کر دینے کے حکم میں ہے اور اس پر اس مال مغصوب کا تاوان لازم ہوگا لہٰذا وہ اس مال کا مالک بن گیا۔ لیکن اس صاحب مال کے علاوہ اگر مال کا وہ خود مالک ہو، ضروری ہوگا جس سے اس تاوان کو ادا کر سکے۔ اس صورت میں اس پر اپنا تمام مال کا زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہوگا ورنہ نہیں۔ صاحبین کے نزدیک غاصب مال مغصوب کا کسی صورت میں مالک نہیں ہو سکتا ہے لہٰذا زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

كما في البحر الرائق (١) لو ان سلطانا غصب مالا وخلطه انتهى - او خلط بماله اذا لم يكن له مال وغصب اموال الناس وخلطها ببعضها فلا زكاة عليه كما في الغنية لان الخبيث تعذر لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه ومثله في البزازية قال في الشرنبلالية وبه صرح في شرح المنظومة ويجب عليها تفريغ ذمته برده الى اربابه ان علموا والا الى الفقراء۔

وفي رد المحتار على الدر المختار (٢) ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فيجب الزكاة فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تمييزه عند ابي حنيفة وقوله ارفق اذ قلما يخلو مال من غصب وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه والا فلا زكاة كما لو كان الكل خبيثا كما في النهر

جزء ہشتم: راہن و مرتہن کسی پر بھی مال زکوٰۃ واجب نہیں رہن کی زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملک تام شرط ہے حالانکہ ان دونوں میں سے کسی کو ملک تام حاصل نہیں، راہن کی ملکیت ہے تو قبضہ نہیں اور مرتہن کا قبضہ ہے تو ملکیت نہیں۔

امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک دین تین قسم پر ہے:

---

(١) ۲۲۱/۲   (٢) ۲۹/۲

(۱) قوی (۲) متوسط (۳) ضعیف

دین قوی قرض یا مال تجارت کا بدل ہے۔ جب نصاب پورا ہو جائے گا اور اس پر سال گزر جائے گا تو زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہو جائے گی، لیکن لوٹے ہوئے زکوٰۃ ہی تا خیر کی جائے گی، وصول کے بعد امام اعظمؒ کی یہی دلیل جائے گی یعنی جب وصول کرے گا تو ہر چالیس درہم پر ایک درہم زکوٰۃ میں دے گا۔

دین متوسط یعنی وہ مال تجارت کا بدلہ نہ ہو بلکہ جانوروں کی قیمت یا خدمت کے غلام ہوں یا دوسری اصلیہ میں سے دوسری ملکیت کی چیز ہو تو دو سو درہم قبضہ میں آنے کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی اور سال کا حساب جس وقت فروخت کیا تھا اس وقت سے لگایا جائے گا، شامی نے اسی کو صحیح ترین قول فرمایا ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ قبضہ میں آنے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ صاحب بدائع کی تحقیق کے مطابق یہی دوسرا قول صحیح قرار پایا۔

اور دین ضعیف وہ ہے جو مال کا بدل نہ ہو جیسے مہر، دیت، بدل خلع وغیرہ اس پر زکوٰۃ اس وقت لازم ہوگی جب اس قسم کے دین میں سے دو سو درہم پر مالک کا قبضہ ہو جائے گا اور اس کے بعد سے حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات طے پائی کہ دین کے اقسام ثلاثہ میں سے دین قوی پر بعد القبض امام اعظمؒ کی زکوٰۃ واجب ہوگی، اور دین متوسط کے دوسرے قول کو راجح قرار دے کر اور دین ضعیف ان دونوں قسم پر بعد القبض سے حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اگر مدیون دین ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور وصول کی امید ہو تو بعد القبض امام اعظمؒ کی زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں۔ لیکن مدیون پر کسی حالت میں زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی۔

کما فی رد المحتار (۱): اعلم ان الدیون عند الامام ثلثة: قوی و متوسط و ضعیف، فتجب زکاتها اذا تم نصابا و حال الحول لکن لا فورا بل عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض و بدل مال تجارة فکلما قبض اربعین درهما یلزمه درهم و عند قبض مائتین منه لغیرها ای من بدل مال لغیر تجارة و هو المتوسط کثمن سائمة و عبید خدمة و نحوهما مما هو مشغول

---

(۱) رد المحتار ج۲ ص ۲۵

بحوائج الاصلية كطعام وشراب واملاك ويعتبر ما مضى من الحول قبل القبض فى الاصح ومثله ما لو ورث دينا على رجل وعنده قبض مأتين مع حولان الحول بعده اى بعد القبض من دين ضعيف وهو بدل غير مال كمهر ودية وبدل كتابة وخلع الا اذا كان عنده ما يضم الى الدين الضعيف كما مر - ولو ابرأ رب الدين المديون بعد الحول فلا زكاة سواء كان الدين قويا اولا خانية وقيده فى المحيط بالمعسر اما الموسر فهو استهلاك فليحفظ بحر قال فى النهر وهذا ظاهر فى انه تقييد للاطلاق وهو غير صحيح فى الضعيف كما لا يخفى۔

وفى البدائع (۱): واما الدين الوسط فما وجب له بدلا عن مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه روايتان عنه ذكر فى الاصل انه تجب فيه الزكاة قبل القبض لكن لا يخاطب باداء ما لم يقبض مأتى درهم فاذا قبض مأتى درهم زكى لما مضى وروى ابن سماعة عن ابى يوسف عن ابى حنيفة انه لا زكاة فيه حتى يقبض المأتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه۔

وفى البدائع (۲): ومال ابن السبيل مقدور الانتفاع به فى حقه بيد نائبه وكذا المدفون فى البيت لانه يمكن الوصول اليه بالنبش بخلاف المفازة لان النبش كل الصحراء غير مقدور له وكذا الدين المقر به اذا كان المقر مليا فهو ممكن الوصول اليه الخ۔

وفى رد المحتار (۳): ولو كان الدين على مقر ملى او على معسر مفلس اى محكوم بافلاسه او على جاحد عليه بينة وعن محمد لا زكاة

---

(۱) البدائع ۲/۱۰ (۲) ايضا ۲/۹ (۳) رد المحتار ۲/۹۰۰

وهو الصحيح ذكره ابن مالك وغيره لان البينة قد لا تقبل او يعلم

به قاض سيحين ان المفتي به عدم القضاء بعلم القاضي فيوصل

الى ملكه فتلزم زكاته لما مضى۔

جواب ۴: پراویڈنٹ فنڈ کی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں، کیونکہ پراویڈنٹ فنڈ میں جو رقم جمع ہوتی ہے ظاہر ہے کہ
یہ دین قوی میں سے نہیں اس لیے کہ یہ قرض نہیں ہے اور کسی مال تجارت کا بدل بھی نہیں۔ اسی طرح دین
متوسط بھی نہیں اس لیے کہ یہ کسی چیز کی قیمت یا خدمت کے علاوہ اور حوائج اصلیہ میں سے کسی چیز کا
بدل بھی نہیں ہے تو لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ یہ دین ضعیف میں شامل ہوگا کیونکہ وہ کسی چیز کا بدل نہیں،
بلکہ یہ رقم ملازم کے ماہانہ حقوق میں سے ایک حصہ جمع کرکے رکھ لیا جاتا ہے جو ایام ملازمت کے اختتام
پر اس کو واپس دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ اور عطیہ بھی ملتا ہے۔ یہ حصہ گو وہ خود مالک تھا لیکن قبضہ
نہیں تھا۔ تب جب سے ملک تام حاصل ہوگا اس وقت سے حساب کرکے حولان حول پر زکوٰۃ ادا
کی جائے گی۔ کما مر دلیلہ۔

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط نماء: نما کی حقیقت اور اس کی صورتیں

نما دو طرح ہوتا ہے۔ حقیقی یا تقدیری، یعنی وجوب زکوٰۃ کے لیے جو مال ہو وہ بڑھنے والا ہو خواہ وہ
تقدیراً بڑھنے والا ہو یعنی مالک اس مال پر قبضہ کے ساتھ اس کے بڑھانے پر قدرت رکھتا ہو اگرچہ وہ اپنے نائب
اور قائم مقام کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو، یا حقیقۃً یعنی توالد و تناسل اور تجارت کے ذریعہ مال کو بڑھاتا ہو۔

كما في البحر الرائق (۱): والنماء في اللغة بالمد الزيادة والقصر

بالهمزة خطأ يقال نما المال ينمي نماء وينمو نموا وانماه الله

كذا في المغرب وفي الشرع نوعان حقيقي وتقديري فالحقيقي

الزيادة بالتوالد والتناسل والتجارات والتقديري تمكنه من

الزيادة بكون المال في يده او يد نائبه فلا زكوٰة على من لم يتمكن

(۱) البحر الرائق ۲۲۲/۲

منها في ماله كمال الضمار الخ۔

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

ابن مالکؒ نے حاجت اصلیہ کی تعریف اس طرح کی ہے کہ مالک اس کے ذریعے اپنے اوپر سے ہلاکت کو دور کرے، خواہ وہ حقیقۃً ہو جیسے اپنے استعمال کے کپڑے اور دوسری وہ تمام اشیا جن کے اوپر ٹیک لگا ہوا وہ اپنی زندگی بسر کرے۔ یا تقدیراً جیسے اپنے اوپر کسی کا حق دینا ہے۔

حوائج اصلیہ کے دائرہ میں یہ تمام اشیا، داخل ہیں

روزمرہ کے اخراجات، رہنے کا مکان، لڑائی کے آلات، جاڑے گرمی کے کپڑے، پیشہ وروں کے اسباب وآلات، سواری کے جانور، اہل علم کی کتابیں۔

كما في رد المحتار على الدر المختار (١) (قوله وفارغ عن حاجة الأصلية) اشارة إلى انه معطوف على قوله عن دين (قوله وفسره ابن مالك) اى فسر المشغول بالحاجة الأصلية والأولى فسرها وذلك حيث قال وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقا كالنفقة ودور السكنى وآلات الحروب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر او البرد. أو تقديرا كالدين فان المديون محتاج إلى قضائه بما في يده من النصاب دفعا عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لأهلها۔

جواب ملا۔ کتب فقہ سے جہاں تک پتہ چلتا ہے کہ حوائج اصلیہ کا اطلاق کسی زمان، مکان اور اشخاص کے ساتھ محدود اور مقید نہیں، لہٰذا ہر دور و ماحول کے تغیر تبدل کا اعتبار کیا جائے گا، اور اس صورت مسئلہ کو سفر حج کے "راحلہ" پر بھی قیاس کیا جا سکتا ہے۔

---

(١) رد المحتار على الدر المختار ٢/٣

كما في رد المحتار على البحر المختار (۱) (تحت قوله الحارة) انه يعتبر في كل ما يليق بحاله عادة وعرفاً فمن لا يقدر الا عليها اعتبر في حقه بلا ارتياب وان قدر بالمحمل او القتب فلا يجد ركوبها على شيء اذا فرقه۔ اھ

وفي كتاب الفقه على المذاهب الاربعة (۲) الحنفية قالوا۔ الاستطاعة هي القدرة على الزاد والراحلة الخ ويعتبر في الراحلة ما يليق بالشخص عادة وعرفاً۔ ويختلف ذلك باختلاف احوال الناس۔

چوتھی شرط: دین سے محفوظ ہو۔ کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے، دین کی قسمیں اور ان کے احکام

جواب :۔ دین تین قسم پر ہے۔ مال زکوٰۃ کا نصاب اس دین سے فارغ ہو جس کا بندوں میں سے کوئی مطالبہ کا حق رکھتا ہو۔

اول :۔ وہ دین خالص اللہ کا ہو، جیسے زکوٰۃ و خراج کہ اس دین کا مطالبہ کا حق خلیفۃ المسلمین کے عامل کو پہنچتا ہے۔

دوم: وہ دین خالص بندہ کا ہو جیسے بطور کفالت ہو یا وہ میعادی قرض ہو اگرچہ وہ اس کی بیوی کا مہر مؤجل ہو جس کا موت یا طلاق کے وقت ادا کرنا ضروری ہوتا ہو یا اس کے ذمہ قرض ایسا نفقہ ہو جو اس پر قاضی کے فیصلہ کی وجہ سے یا باہم رضامندی سے لازم ہو چکا ہو۔

سوم: وہ دین خالص اللہ کا ہو جیسے نذر، کفارہ اور حج کے دین لیکن بندوں میں سے کوئی دنیا میں طلب کرنے والا نہیں ہے۔

قسم اول و دوم دین مانع زکوٰۃ ہے اور قسم سوم مانع زکوٰۃ نہیں ہے۔

كما في كتاب الفقه على المذاهب الاربعة (۲) : الحنفية قالوا ينقسم الدين بالنسبة لذلك الى ثلاثة اقسام۔ اول ان يكون دينا خالصا للعبد الثاني ان يكون دينا لله تعالى ولكن له مطالب من جهة العباد

---

(۱) كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۲۲۸ (۲) ایضاً ۱/۴۲۸

كدين الزكاة والمطالب هو الامام في الاموال الظاهرة وهي السوائم
وما يخرج من الارض او نائب الامام في الاموال الباطنة وهي اموال التجارة
كالذهب والفضة۔ ونائب الامام هم الملاك لان الامام كان يأخذها
الى زمن عثمان رضي الله عنه ففوضها عثمان الى اربابها في الاموال
الباطنة۔ الثالث ان يكون دينا خالصا لله تعالى ليس له مطالب
من جهة العباد كديون الله تعالى الخاصة من نذور وكفارات وصدقة
فطر ونفقة حج فالدين الذي يمنع وجوب الزكاة هو دين القسمين
الاولين ...... اما القسم الثالث فانه لا يمنع وجوب الزكاة۔

جواب: علی زراعت یا تعمیر مکان وغیرہ کے لیے اگر میعادی قرض لیا جائے تو وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ
سے سالانہ واجب الاداء قسط کو وضع کرکے باقی اموال پر زکوٰۃ واجب قرار دی جائے گی، کیونکہ
اس وقت دائن کی طرف سے پورے قرض کو ادا کرنے کے لیے مدیون پر مطالبہ نہیں۔ لہٰذا جب زکوٰۃ
ادا کرنے کا وقت ہوگا اس وقت جو قسط واجب الاداء ہوگی اسی کو وضع کرکے حساب لگایا جائے
گا۔ اور اس کو مہر مؤجل پر قیاس کیا جائے گا، جس کو زوج فی الفور ادا کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا ہے
لہٰذا وہ عدم مطالبہ کی وجہ سے مانع زکوٰۃ میں محسوب نہیں ہوگا۔
جیسا کہ فتاویٰ عالمگیری میں ہے: [1]

ومنها الفراغ عن الدين قال اصحابنا رحمهم الله كل دين له مطالب من
جهة العباد يمنع وجوب الزكاة سواء كان الدين للعباد كالقرض وثمن
المبيع وضمان المتلفات وارش الجراحة وسواء كان الدين من النقود او
المكيل او الموزون او الثياب او الحيوان وجب بخلع او صلح عن دم عمد
وهو حال او مؤجل .... وذكر الصدر في شرح الجامع الكبير
قال مشائخنا رحمهم الله في رجل عليه مهر مؤجل لامرأته وهو

---

[1] فتاویٰ عالمگیری ۱/۱۷۳

لانه يريد اداءه لايجعل مانعا من الزكاة لعدم المطالبة فى العادات وانه حسن ايضا هكذا فى جواهر الفتاوى .

کمپنیز پر زکوٰۃ

احناف کے نزدیک مال مشترک میں زکوٰۃ واجب نہیں یعنی ہر شخص کا جدا جدا مال نصاب کو نہ پہونچے مگر جب شرکاء کا مال ملایا جائے تو نصاب پورا ہو جاتا ہے اور الگ الگ شریک کا مال نصاب کو پہونچ جائے تو ہر ایک پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ الغرض اس قسم کے مال مشترک میں ہر ایک شخص پر اپنے حصے کے اعتبار سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔ کما فی رد المحتار على الدر المختار[1]

لاتجب الزكاة عندنا فى نصاب مشترك من سائمة ومال تجارة وان صحت الخلطة فيه باتحاد اسباب الاسامة التسعة التى يجمعها اوص من يشفع وبيانه فى شرح المجمع وان تعدد النصاب تجب اجماعاً ويتراجعان بالحصص وبيانه فى الحاوى بلغ نصيب احدهما نصابا زكاه دون الآخر ولو بينه وبين ثمانين رجلا ثمانون شاة : لاشئ عليه لانه مما لايقسم خلافا للثانى، سراج .

ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ

ہیرے موتی جواہرات چاہے جتنی قیمت کی ہو، تجارت کی اگر نیت نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ اس لیے کہ پیدائش کے اعتبار سے ثمن میں شمار نہیں۔ اسی طرح اگر مال جمع کرنے کی غرض سے خریدا گیا تھا پھر نفع حاصل کرنے کے خیال سے بیچ ڈالا تب بھی اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ ایسا ہی اگر عورتوں نے زینت و آرائش کی غرض سے زیورات کے طور پر استعمال کیا تب بھی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

کما فى كتاب الفقه على المذاهب الاربعة[2] . وكذا لاتجب فى الجواهر

---

(۱) رد المحتار على الدر المختار ۲/۳۴-۳۵ (۲) كتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۵۹۵

عشر الارض الخراجية فلبقاء الذمي كما قدمنا لا لان الارض ليست من عروض تشبه. (قوله لا لان الارض الخ) رد على ما في النهر حيث اجاب عما اورده عليه بان الارض ليست من العروض بناء على ما نقله من الصحاح قال في البحر وهو مردود لما علمت من ان العروض تفسر هنا بما ليس بنقد اهـ

وايضاً[١] وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفي السوائم يوم الاداء اجماعا وهو الاصح ويقوم في البلد الذي المال فيه ولو في مفازة ففي اقرب الامصار اليه. فتح. (قوله وهو الاصح) اي كون المعتبر في السوائم يوم الاداء اجماعا هو الاصح فانه ذكر في البدائع انه قيل ان المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الاداء اهـ

وفي المحيط: يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح اهـ فهو تصحيح للقول الثاني الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما.

شیئرز اور بونڈز کی زکوٰۃ

کمپنی کے شیئرز تین قسم کے ہوں گے۔

(۱) کمپنی ذریعۂ آمدنی کے لیے کوئی چیز خرید کر لیتی ہے اور اس کے استعمال سے نفع حاصل کرتی رہتی ہے تو اس صورت میں صرف منافع پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور اصل سرمایہ پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، اس لیے کہ وہ ذریعۂ معاش اور حوائج اصلیہ کی چیزیں بن گئی ہیں، جس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

(۲) ایسی کمپنی جو شیئرز کے روپیوں سے تجارت کرتی رہتی ہے اس صورت میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوگی کیوں کہ وہ تجارتی رقم ہے اور تجارتی رقم میں اصل سرمایہ اور منافع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

---

(۱) رد المحتار علی الدر المختار ۲/۲۸۶

(۲) شیئرز ہولڈرس شیئرز خرید و فروخت کرنے کو ایک تجارتی پیشہ بنا لیتے ہیں تو اختتام سال پر بوقت ادائے زکوٰۃ مارکیٹ میں اس شیئر کا جو ریٹ ہے اس کا اعتبار کیا جائے گا۔

شیئرز اور بونڈس پر تجارتی سرمایہ کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی اور یہ دین قوی میں شامل ہوگی۔
اس وجہ سے بعد القبضہ گزرے ہوئے سالوں کی بھی زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہوگی، جیسا کہ مذکورۃ الصدر اداریے سے ظاہر ہے

وفی رد المحتار على الدر المختار[1] وثمنية المال كالدراهم والدنانير لتعينهما للتجارة بأصل الخلقة فتلزم الزكاة كيف ما أمسكهما ولو للنفقة۔

وفی کتاب الفقه على المذاهب الأربعة[2] الحنفية قالوا الأوراق المالية (البنكنوت) من قبيل الدين القوي إلا أنها يمكن صرفها فضة فوراً فتجب فيها الزكاة فوراً۔

محور ثانی نصاب زکوٰۃ

نصاب زکوٰۃ کے سلسلے میں سامان تجارت کی قیمت سونا یا چاندی کا نصاب جس سے حساب لگانے سے فقیر کا نفع زیادہ ہو اسی کی قیمت سے حساب لگایا جائے گا۔ مثلاً مال تجارت کی قیمت اگر چاندی کے نصاب سے لگائی جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر سونے کے نصاب سے قیمت لگائی جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی تو اس صورت میں چاندی کے نصاب سے قیمت لگائی جائے گی، اس لیے کہ اس میں فقراء کا فائدہ ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے پاس کچھ سونا اور کچھ چاندی موجود ہو تو اس صورت میں دونوں کی قیمت لگا کر چاندی کے نصاب کو اصل قرار دے کر اس نصاب کے برابر اگر قیمت ہو جائے تو زکوٰۃ واجب ہو جائے گی۔

کما فی رد المحتار على الدر المختار[3] ولو بلغ بأحدهما نصاباً دون الآخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ بأحدهما نصاباً وخمساً وبالآخر أقل قومه بالأنفع للفقير سراج۔

---

(۱) رد المحتار على الدر المختار ۲/۱ (۲) کتاب الفقه على المذاهب الاربعة ۱/۶۰۶ (۳) رد المحتار على الدر المختار ۲/۳۰

وفی خلاصة الفتاوی(۱) والفلوس والدراهم المموهة علی هذا لا زکاة فیها الا ان تکون للتجارة وقیمتها تبلغ نصابا کذا فی الکرخی عن ابی حنیفة رح .... واصل هذا ان الذهب یضم الی الفضة لتکمیل النصاب عندنا استحسانا .... والضم عند ابی حنیفة رح باعتبار القیمة وعندهما باعتبار الاجزاء حتی لو کان احدهما ثلث النصاب لابد ان یکون الآخر ثلثی النصاب وغیر الذهب والفضة انما یکون مال الزکاة اذا کان معدا للتجارة ویعتبر النصاب فیها بالقیمة ان شاء قومها بالذهب وان شاء قومها بالفضة وعن ابی حنیفة رح انه یقوم بما هو انفع للفقراء۔

وفی کتاب المبسوط(۲) ثم عند ابی حنیفة رح یعتبر فی التقویم منفعة الفقراء کما هو اصله حتی روی عنه انه اذا کان للرجل مائة وخمسة وتسعون درهما ودینار یساوی خمسة دراهم انه تجب الزکاة وذلک بان یقوم الذهب بالفضة .... وابو حنیفة یقول هما عینان وجب ضم احدهما الی الآخر لایجاب الزکاة فکان الضم باعتبار القیمة کعروض التجارة وهذا لان کمال النصاب لا یکون الا عند اتحاد الجنس وذلک لا یکون الا باعتبار صفة المالیة یعنی فان الاموال اجناس باعتبار اعیانها جنس واحد باعتبار صفة المالیة فیها۔

تجویز ثالث مصارف زکوٰۃ

جزو ۱۔ مصارف زکوٰۃ کی آٹھ قسموں میں سے پہلی قسم فقراء کی ہے یعنی مسلمان محتاج کو جس مال کا مالک

---

(۱) خلاصة الفتاوی ۲۳۹/۱ (۲) المبسوط ۱۹۲/۲

بنا دینا جس کا نکالنا شرعاً معلوم ہے، اس شرط کی بنا پر اگر طلبہ یا مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ طلبہ کو اپنی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے رقم یا چیک بطور تملیک دے دیں گے اور وہ وصول کر کے اپنے ضروریات پر خرچ کر دیں، تب وہ ادا کر دیں گے تو زکوٰۃ کی ادائیگی ہو جائے گی۔ یا تو مستحقین زکوٰۃ طلباء سے مدرسہ میں داخلہ لیتے وقت مہتمم مدرسہ ان کی طرف سے زکوٰۃ کا روپیہ قبول کر کے ان کی ضروریات میں خرچ کرنے کا تحریری وکالت حاصل کر لیں گے تو مہتمم مدرسہ زکوٰۃ سے ادا کر سکیں گے ورنہ عدم تملیک کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی، کما مر ولیلہ۔

لہٰذا مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان اور فقراء و مستحقین زکوٰۃ دونوں کی طرف سے بہ حیثیت وکالت مختار کل بن جائیں گے اور ایسا ہی ایک آدمی دونوں طرف سے وکیل بن سکتے ہیں۔ ہدایہ میں ہے:

الواحد يتولى طرفي النكاح۔

اور درمختار میں ہے[۱]۔

ولو خلط زكاة موكليه ضمن وكان متبرعا الا اذا وكله الفقراء۔

جواب نمبر ۲: (الف) مدارس اسلامیہ کے محصلین اور سفراء کی اجرت اپنے اعمال کے تناسب سے بطور کمیشن دینے کے جواز کی کوئی دلیل کتب فقہ کی کتاب الاجارہ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ بلکہ اس طریقے کے عدم جواز کی دلیل ملتی ہے۔

مضاربت اور مزارعت پر چندہ کے کمیشن کا قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے، اس لیے کہ مضاربہ میں رب المال راس المال کو دیتا ہے اور مضارب تجارت کرتا ہے اور چندہ کی صورت میں مہتمم یا ناظم مدرسہ محصل کو کوئی ملکیت کی چیز سپرد نہیں کرتا ہے۔

اسی طرح مزارعت میں بھی رب الارض اپنی ملکیت کی زمین حوالے کرتا ہے اور تحصیل میں ایسی کسی چیز کی ملکیت سپرد نہیں کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں پر قیاس کر کے محصلین مدرسہ کے لیے کمیشن کو جائز نہیں قرار دیا جائے گا۔ علاوہ ازیں فقہاء کرام نے مزارعت کے جواز کو مزارعت ہی کے ساتھ محدود کر دیا اور اس کا جواز خلاف قیاس ہونے کی وجہ سے اور کسی چیز کو مقیس علیہ نہیں بن سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ محصلین مدرسہ کو اپنے کسب کے تناسب سے اسی سے اجرت دینا جائز نہیں۔ اھ

---

[۱] درمختار، ج ۲، ۲۰

کہ اس صورت میں اجرت الاجیر من عملہ لازم آتی ہے اسی کو اجارۂ فاسدہ میں شمار کیا گیا۔ رد المحتار اور ہدایہ جلد رابع کتاب الاضحیۃ[1] میں ملتی ہے:

ولا یعطی اجر الجزار من الاضحیۃ لقولہ علیہ السلام لعلیؓ تصدق بجلالہا وخطامہا ولا تعط اجر الجزار منہا شیئا۔ متفق علیہ

(ب) شرعی عامل زکوٰۃ وہ ہوتا ہے جس کو امام یعنی امیر المؤمنین یا خلیفۃ المسلمین زکوٰۃ، عشر اور خراج وصول کرنے کے لیے مقرر کرتے ہیں۔

کما فی البدائع[2]: والعاملین علیہا فہم الذین نصبہم الامام بجبایۃ الصدقات۔

وفی کتاب الفقہ علی مذاہب الاربعۃ[3]: والعامل ہو الذی نصبہ الامام لاخذ الصدقات واستشہد فی اخذہا بقدر ما عمل۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسہ کے مہتمم صاحب کا مقرر کردہ عامل یا سفیر العاملین علیہا کے تحت داخل نہیں مانا جائے گا کیونکہ وہ امام یا خلیفۃ المسلمین کی طرف سے منتخب کردہ نہیں ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ شرعی عامل کی کوئی اجرت امام یا خلیفۃ المسلمین کی طرف سے مقرر نہیں ہے بلکہ جو کچھ ان کو دیا جاتا ہے بطور کفایہ دیا جاتا ہے اور مہتمم مدرسہ کی جانب سے جو عامل مقرر ہوتے ہیں ان کی خاص ایک اجرت اور تنخواہ مقرر ہوتی ہے۔ لہٰذا حقیقت میں وہ والعاملین علیہا کے تحت داخل نہیں مانے جائیں گے اور ان کی اجرت بھی مد زکوٰۃ سے نہیں دی جائے گی۔

کما فی شرح النقایۃ[4]: فیعطی بقدر عملہ ای ما یکفیہ واعوانہ ذہابا وایابا لانہ فرغ نفسہ لعمل من امور المسلمین لیستحق الکفایۃ۔

وکذا فی البدائع[5]: انما یستحق بعملہ لکن علی سبیل

---

(۱) ہدایہ کتاب الاضحیۃ ۴/۴۳۰ (۲) البدائع ۲/۴۴ (۳) کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعۃ ۱/۶۲۱
(۴) شرح النقایۃ ۱/۱۲۶ (۵) البدائع ۲/۴۴

الكفاية له ولأعوانه لا على سبيل الأجرة لأن الأجرة مجهولة أما عنده فظاهر لأن قدر الكفاية له ولأعوانه غير معلوم وكذا عندهما لأن قدر ما يجتمع من الصدقات بجبايته مجهول فكان ثمنه مجهولا لا محالة وجهالة أحد البدلين يمنع جواز الإجارة فجهالة البدلين جميعا أولى فدل أن الاستحقاق ليس على سبيل الأجرة بل على طريق الكفاية له ولأعوانه۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ کو اخذ کرنے کا حق امیر المومنین یا خلیفۃ المسلمین کا ہے اور ایسا عامل پہنچ کر زکوٰۃ وصول کر سکتا ہے اب اگر عامل کے ہاتھ زکوٰۃ کا مال ہلاک ہو جائے صاحب نصاب کی جانب سے واجب ساقط ہو جائے گا لیکن اگر صاحب مال عامل کے ہاتھ پر زکوٰۃ نہ دے کر فقیر کو دے دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی بلکہ وہ نفل صدقہ ہو جائے گا۔ امیر کا عامل آئے تو دوسری مرتبہ ان کو زکوٰۃ دینی پڑے گی اور اسی کو زکوٰۃ میں شمار کیا جائے گا لیکن مدرسہ کی جانب سے جو عامل مقرر ہوتے ہیں ان کے ہاتھ سے اگر مال زکوٰۃ ہلاک ہو جائے تو صاحب نصاب سے واجب ساقط نہیں ہوگا بلکہ فقیر کی تملیک کے بعد واجب ساقط ہوگا۔

كما في فتح القدير[1] وفي الفصل الرابع وعندنا إذا قال أديت بنفسي إلى الفقراء في المصرف لا يصدق وإن حلف وقال الشافعي يصدق لأنه أوصل الحق إلى المستحق ولنا أن حق الأخذ للسلطان فلا يملك إبطاله بخلاف الأموال الباطنة (قوله لنا أن حق الأخذ للسلطان) يمكن أن يمنع كونه أوصل إلى المستحق بل المستحق الإمام والحق أن الإمام مستحق الأخذ والفقير مستحق التمليك والانتفاع وحاصله أن هناك مستحقين فلا يملك إبطال حق واحد منهما ثم قيل الزكاة هو الأول والثاني سياسة وقيل هو الثاني والأول ينقلب نفلا وهو الصحيح۔

---

(۱) فتح القدير ۲/۵۳

وفی البدائع (۱): ولو قال ادیت زکاتها الی الفقراء لا یصدق ویؤخذ منه عندنا وعند الشافعی لا یؤخذ. وجه قوله ان المصدق لا یأخذ الصدقة لنفسه بل لیصرفها الی مستحقها وهو الفقیر وقد اوصل بنفسه ولنا ان حق الاخذ للسلطان فهو بتفرقة ادیت بنفسه اراد ابطال حق السلطان فلا یملک ذلک وکذا الی العشر علی هذا الخلاف۔

وفی البحر الرائق (۲): ویسقط الواجب عن ارباب الاموال ان هلک المال فی یده لانه امین کید الامام وهو نائب عن الفقراء ولا شکر له مقدرا -

چوتھی وجہ یہ ہے کہ سلطان کا عامل اگر کسی مزارعہ سے خراج وصول کرنا چھوڑ دے سلطان کے علم کے بغیر تو اس کے لیے ایسا کرنا حلال ہے جیسا کہ سلطان کسی کا خراج چھوڑ سکتا ہے لیکن مدرسہ کی جانب سے مقرر کردہ عامل کو یہ حق نہیں ہے۔

کما فی البحر الرائق (۳): ومن احکام العامل ما ذکر فی البزازیة ان العامل اذا ترک الخراج علی المزارع بدون علم السلطان یحل له لو مصرفا کالسلطان اذا ترک الخراج له۔

پانچویں وجہ یہ ہے کہ عامل شرعی کے لیے چند شرائط ہیں جیسے آزاد ہو غلام نہ ہو، مسلمان ہو کافر نہ ہو، غیر ہاشمی ہو۔ یہ قوت ہو کہ وہ جماعت کے مال کو چور اور ڈاکو سے بچا سکے کیونکہ تاجروں سے عشر اس لیے لیا جاتا ہے کہ حکومت ان کے مال کی حفاظت کرتی ہے۔ امام یا خلیفۃ المسلمین ان تمام شرائط کے مدنظر عامل کے تقرر کا حق رکھتے ہیں۔

ان شرائط میں سے اگر کوئی ایک بھی شرط مفقود ہوگی تو اس کو شرعی عامل نہیں قرار دیا جائے گا علاوہ مدرسہ کی جانب سے اس قسم کا عامل مقرر کرنے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے تو پھر شرعی مصرف میں شامل کرکے مذکورہ قصے اس کو کیا دیا جائے گا۔ جیسا کہ شامی نے ذکر کیا ہے۔

وفی البدائع (۴): واما شرط ولایة الاخذ فانواع منها وجود الحمایة

---

(۱) بدائع ۲/۳۶-۳۷ (۲) بحر الرائق ۲/۲۴۲ (۳) ایضاً (۴) البدائع ۲/۳۶-۳۷

من الامام حتی لو ظهر اهل البغی علی مدینة من مدائن اهل العدل وقریة من قراهم وغلبوا علیها فاخذوا صدقات سوائمهم وعشر اراضیهم وخراجها ثم ظهر علیهم امام العدل لا یأخذ منهم ثانیا لان حق الاخذ للامام لاجل الحفظ والحمایة ولم یوجد الا انهم یفتون فیما بینهم وبین ربهم ان یؤدوا الزکاة والعشر ثانیا......

ومنها وجوب الزکاة...... وشرطها ظهور المال وحضور المالک۔

یعنی وجہ ہے کہ اس بات میں سب متفق ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صاحب نصاب خود بھی زکوٰۃ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا دیتے تھے اور عاملین کے ذریعے بھی جمع کر لیتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء راشدین کے دور میں بھی یہ نظام باقی رہا لیکن حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں انھوں نے اموال باطنہ کو صاحب مال کے حوالے کر دیا اور یہ اموال تجارت اور سونا چاندی ہیں اس کے بعد جب خلافت سلطنت سے بدل گئی اور امراء سلطنت پر صحابہ و تابعین وغیرہ اہل علم حضرات کا اعتماد کم ہونے لگا تو دین کے ایک اہم رکن کی ادائیگی کا ذمہ دار امراء کو قرار دینے میں ان حضرات کا اختلاف پیدا ہو گیا۔ بعض حضرات شرعی نظام کی خاطر اس کو ان کے ہاتھ میں دینے کے قائل ہو گئے اور بعض حضرات ان سے علیحدہ کر دینے کے قائل ہوئے کہ وہ شرعی طور پر اس امانت کو صحیح مصرف میں رکھیں گے۔ اس لیے کہ زکوٰۃ اسلام کے بنیادی ارکان خمسہ میں سے ایک اہم رکن ہے اگر اس کو اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے پورے طریقہ پر ادا نہیں کیا جائے گا تو اموال کی زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی نہ دینے والوں میں شمار ہو کر دوزخ میں جانے کا ایک سبب بن جائے گا۔ بنا بریں مدارس کے ذمہ دار حضرات تحصیل زکوٰۃ کے لیے جو سفراء بھیجتے ہیں ان کو والعاملین علیہا کے تحت عامل قرار دے کر مد زکوٰۃ سے ان کی تنخواہ نہیں دی جا سکتی۔

وفی عمدۃ القاری شرح بخاری[۱] : الحادی عشر قوله (تؤخذ من اغنیاءهم) دلیل علی ان الامام یوصل الصدقات الی مصرف الاسرائی

(۱) عمدۃ القاری ۲۳۸/۸

لقبض صدقاتهم وقال ابن المنذر اجمع اهل العلم على ان الزكاة كانت ترفع إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم وإلى رسله وعماله وإلى من امر بدفعها اليه واختلفوا فى دفع الزكاة إلى الامراء فكان سعد بن ابي وقاص وابن عمر وابو سعيد الخدري وابو هريرة وعائشة و الحسن البصري والشعبي ومحمد بن علي وسعيد بن جبير وابو رزين والاوزاعي والشافعي يقولون تدفع الزكاة إلى الامراء. وقال عطاء يعطيهم اذا وضعوها مواضعها. وقال طاؤس لا يدفع اليهم اذا لم يضعوها مواضعها. وقال الثوري احلف لهم و عدهم واكذبهم ولا تعطيهم شيئا اذا لم يضعوها مواضعها۔

وفى البدائع (۱): قوله ان الذى يعطى للعامل اجرة عمله مصرح وقد بينا فساده واما حديث على رضي الله عنه فلا حجة فيه لان فيه انه فرض له وليس فيه بيان المفروض انه من الصدقات او من غيرها فيحتمل انه فرض له من بيت المال لانه كان قاضيا والله اعلم۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب تفسیر معارف القرآن میں فرماتے ہیں کہ

"فائدہ: تفصیل مذکور سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ آج کل جو اسلامی مدارس اور انجمنوں کے مہتمم یا ان کی طرف سے بھیجے ہوئے سفیر صدقات، زکوٰۃ وغیرہ مدارس اور انجمنوں کے لیے وصول کرتے ہیں ان کا وہ حکم نہیں جو عاملین صدقہ کا اس آیت میں مذکور ہے کہ زکوٰۃ کی رقم میں سے ان کی تنخواہ دی جا سکے، بلکہ ان کو مدارس اور انجمن کی طرف سے جداگانہ تنخواہ دینا ضروری ہے، زکوٰۃ کی رقم سے ان کی تنخواہ نہیں دی جا سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ فقراء کے وکیل نہیں بلکہ اصحاب زکوٰۃ مالداروں کے وکیل ہیں، ان کی طرف سے مال زکوٰۃ کو مصرف پر لگانے کا ان کو اختیار دیا گیا ہے اسی لیے ان کے قبضہ ہو جانے کے بعد بھی زکوٰۃ اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک یہ حضرات اس کو

---

(۱) البدائع ۲/۴۴ (۲) معارف القرآن ۴/۳۹۹

مصرف پر خرچ نہ کردیں۔

فقرا کا وکیل نہ ہونا اس لیے ظاہر ہے کہ تحقیقی طور پر کسی فقیر نے ان کو اپنا وکیل بنایا نہیں، اور امیر المؤمنین کو ولایت عامہ کی بنا پر جو خود بخود وکالت فقرا حاصل ہوتی ہے وہ بھی ان کو حاصل نہیں، اس لیے بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ ان کو اصحاب زکوٰۃ کا وکیل قرار دیا جائے اور جب تک یہ اس مال کو مصرف پر خرچ نہ کردیں ان کا قبضہ ایسا ہی ہے جیسا کہ زکوٰۃ کی رقم خود مال والے کے پاس رکھی ہو۔

اس معاملہ میں عام طور پر غفلت برتی جاتی ہے بہت سے ادارے زکوٰۃ کا فنڈ وصول کرکے اس کو سالہا سال رکھتے رہتے ہیں اور اصحاب زکوٰۃ سمجھتے ہیں کہ ہماری زکوٰۃ ادا ہوگئی حالانکہ ان کی زکوٰۃ اس وقت ادا ہوگی جب ان کی زکوٰۃ مصارف زکوٰۃ میں صرف ہو جائے۔

اسی طرح بہت سے لوگ ناواقفیت سے ان لوگوں کو عاملین صدقہ کے حکم میں داخل سمجھ کر زکوٰۃ ہی کی رقم سے ان کی تنخواہ دیتے ہیں، یہ نہ دینے والوں کے لیے جائز ہے نہ لینے والوں کے لیے۔"

محور ثالث مصارف زکوٰۃ فی سبیل اللہ

(۱) مصارف زکوٰۃ والی آیت کا حصر حقیقی ہے اور یہی قول راجح ہے۔

(۲) ہاں بندہ جمہور فقہاء کے اس دعویٰ سے متفق ہے کہ فی سبیل اللہ کا استعمال جب کتاب و سنت میں مطلق طور پر ہوتا ہے تو اس سے مراد غزوہ و جہاد ہی ہوا کرتا ہے۔

(۳) قرون اولیٰ میں زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کی تشریح میں جب دو ہی قول ملتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کریں۔ تیسرا اور چوتھا قول ہم کو اختیار کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

(۴)۔ الف، فی سبیل اللہ سے مراد غازی و مجاہد ہے جس کے پاس اسلحہ اور جنگ کا ضروری سامان خریدنے کے لیے مال نہ ہو۔ یا وہ شخص جس کے ذمہ حج فرض ہوچکا ہو مگر اس کے پاس اب مال باقی نہ رہا جس سے وہ حج فرض ادا کرے۔

ب: فی سبیل اللہ کا مصداق جو لوگ بھی ہوں ان کے مستحق زکوٰۃ ہونے کے لیے فقر و حاجت مندی

شرط ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ قیاس شرعی کا محل ہے اسے میرا ذہن قبول نہیں کرتا۔ اگر قیاس کیا جائے تو پھر بھی جہاد قلمی، جہاد فکری، جہاد ثقافتی وغیرہ کو شامل نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ جب فقر و حاجت مندی شرط ہے تو جہاد کے لیے مجاہد جو ہوگا، فقیر ہونا پڑے گا، ہاں اگر کوئی فقیر شخص اس قسم کا دینی کام کرنا چاہے تو اس کام کا انجام دینے کے لیے مد زکوٰۃ سے تائید کی جا سکتی ہے۔

(۶) دورِ حاضر میں مختلف دینی اور دعوتی کاموں کے لیے بے پناہ سرمایہ کی ضرورت ہے اس واقعہ کے انکار کی گنجائش نہیں ہے لیکن جب مصارف زکوٰۃ کے اصول وضوابط میں اس کو تسلیم کرنے کا کوئی سراغ ملتا ہو حالاں کہ سوائے حیلۂ تملیک فقراء کے کوئی گنجائش ہی نہیں، کیوں کہ زکوٰۃ نام ہی اس عطیہ کا ہے، جو غریبوں کو بغیر کسی معاوضۂ خدمت کے دیا جائے۔ اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایت دی تھی کہ خذ ھا من اغنیاءھم وردھا فی فقراءھم۔ الغرض میری نظر میں مصارف زکوٰۃ کی تعمیم و توسیع والا کوئی قول اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

(۷) فی سبیل اللہ کے مصرف میں جمہور فقہائے کرام اور مفسرین عظام جو مراد لیتے ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ مراد لینے کی کوئی دلیل میرے پاس موجود نہیں ہے جو کچھ ہے وہ توسیع کے خلاف ہی ہے کیوں کہ صحابۂ کرام جنھوں نے قرآن کریم کو براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے پڑھا اور سمجھا ہے ان کی اور ائمہ تابعین کی جتنی تفسیریں اس لفظ کے متعلق منقول ہیں ان میں لفظ کو حجاج اور مجاہدین کے لیے مخصوص قرار دیا گیا ہے۔ سوائے اس کے اور کوئی قول میری نظر میں قابل قبول نہیں ہے۔

از: مفتی محمد عبدالرحیم قاسمی، جامعہ حسینیہ خیرالعلوم
نور محل روڈ، بھوپال۔

زکوٰۃ کے معنی طہارت و پاکیزگی اور زیادتی و بڑھوتری کے ہیں، اسلام کی نظر میں مال کے مقررہ زمرہ و شرعی حصہ کا مسلمان غیر سید فقیر کو مالک بنا دینا اور اپنی ملکیت سے خارج کر دینا زکوٰۃ ہے۔

جواب سوال ۱:

زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے ملکیت تامہ شرط ہے اور کامل ملک قبضہ سے ہوتی ہے:

"فقد ذكر في سبب الشيء من الشروط الملك المطلق وقال وهو الملك يدا ورقبة" (۱)

لہٰذا مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہیں ہوئی، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں اور وہ قیمت جو ادا کی جا چکی خریدار کے تصرف سے نکل کر بائع کے قبضہ میں داخل ہو گئی اس پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔

درمختار میں ہے:

---

(۱) رد المحتار ۲/۴۔

" فتجب زکاتہا اذا تم نصابا وحال علیہ الحول لکن لا فوراً بل عند قبض اربعین درھما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارۃ قال الشامی والحاصل ان مبنی الاختلاف فی الدین المتوسط علی انہ ھل یکون مال زکوۃ بعد القبض اوقبلہ فعلی الاول لا بد من مضی حول بعد قبض النصاب وعلی الثانی ابتداء الحول من وقت البیع الخ " (۱)

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتاویٰ دارالعلوم میں قول اول کو ترجیح دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں کہ جس وقت جس قدر حصہ ثمن کا وصول ہوگا اسی وقت سے اس کا سال لگایا جائے گا بعد سال بھر کے ادائے زکوٰۃ واجب ہوگی اور بعض روایات میں بقدر وصول مقدار نصاب زکوٰۃ لازم ہوگی اور اسی کو ظاہر الروایہ اور مفتی بہ قرار دیا گیا ہے اور بعض روایات میں قول اول کی تصحیح کی گئی ہے وھو الاقیس کذا فی الشامی۔ (۲)

جواب سوال (۳) :-

مالک مکان کو دی جانے والی رقم کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پیشگی کرایہ کے نام سے دی گئی ہو اور اس کو کرایہ میں وضع کرانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ مکان دار کے ذمہ ہوگی۔ دوسرے یہ کہ زر ضمانت (ڈپوزٹ) کے نام سے مالک مکان کے پاس رقم جمع کی جائے، لیکن عقد اجارہ فسخ ہونے یا مدت پوری ہونے کے وقت کرایہ دار کو واپس کیے جانے کا معاہدہ ہو تو اس کی زکوٰۃ کرایہ دار پر واجب ہے۔ رقم واپس ملنے کے بعد گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ کرایہ دار کے ذمہ لازم ہوگی۔

دُرِّمختار میں ہے:

" وکذا الودیعۃ عند غیر معارفہ قال الشامی فلو عند معارفہ تجب الزکوٰۃ " (۳)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

---

(۱) رد المحتار ۲/۳۶ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۶/۳۶ (۳) رد المحتار ۲/۹

" اس روپیہ کی زکوٰۃ بعد واپسی کے تمام گزشتہ سالوں کی ادا کرنا لازم ہے اگر اس خیال سے کہ بعد واپسی کے بہت برسوں گزشتہ کی زکوٰۃ دینی پڑے گی اور رقم کثیر ہو جاوے گی ہر سال موجودہ روپئے کے ساتھ زکوٰۃ کو دے دیا کرے تو یہ بھی درست ہے۔ (۱)

جواب سوال (۳) :-

مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کا کوئی معین مالک نہیں ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض نہیں۔

" کما فی الدر المختار : وسببہ ای سبب افتراضہا ملک نصاب حولی قال الشامی : فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک " (۲)

فتاویٰ دار العلوم میں ہے :

" مدرسہ کا چندہ جو بقدر نصاب جمع ہوتا ہے اور سال اس پر گزر جاتا ہے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے " (۳)

مدرسہ وغیرہ کے مال میں کسی کو بھی کامل کمل ملکیت حاصل نہیں اگرچہ ظاہرا کچھ تصرفات کا اختیار ہو مگر ملک تام نہ ہونے کی وجہ سے بھی وجوب زکوٰۃ کا حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

جواب (۴) :

رشوت، سود اور حرام طریقہ پر قبضہ میں آنے والے مال کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیوں کہ یہ قابض مالک نہیں، اس لیے قابض پر لازم ہے کہ یہ مال مالک کو واپس کرے اور واپسی نہ ہو سکتی ہو تو بلا نیت ثواب صدقہ کردے، جب پورے مقبوضہ مال کو واجب التصدق قرار دیا گیا ہے تو اس کے بعض کو زکوٰۃ میں ادا کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

" قال الشامی : لو کان الخبیث نصابا لا یلزمہ الزکوٰۃ لان الکل واجب التصدق علیہ فلا یفید ایجاب التصدق ببعضہ " (۴)

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم ۶/۱۳۰ (۲) رد المحتار ۲/۹ (۳) فتاویٰ دار العلوم ۶/۳۹، ۵۱

(۴) رد المحتار ۲/۲۵، وکذا فی عمدۃ الحق ص۲۳۳۔

مال حرام کو حلال مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیا کہ تمیز مشکل ہو جائے موجب ملک ہے لہٰذا اس پر زکوٰۃ فرض ہے۔

"ولو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب الزكوٰة فيه ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يكن تمييزه عند ابي حنيفة رحمه الله وقوله ارفق"(۱)

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے:

"مال حرام تمام کو بشرائط صدقہ کرنا لازم ہے زکوٰۃ اس میں نہیں ہے مگر خلط مال حرام کا موجب ملک ہے اس وقت اس میں زکوٰۃ بھی لازم ہوگی"۔(۲)

جواب سوال (۵):

قرض کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی (۲) دین متوسط (۳) دین ضعیف

اول یہ ہے کہ نقد روپیہ یا سونا چاندی قرض دینے یا تجارتی مال فروخت کرنے کے بعد لینے والے کے ذمہ اس کی قیمت باقی رہے اور ایک سال یا کئی سال کے بعد وصول ہو تو ایسا قرض فقہی اصطلاح میں دین قوی ہے۔ بقدر نصاب باقی رہنے کی صورت میں اس قرض پر پچھلے تمام سالوں کی زکوٰۃ فرض ہے اور یکمشت وصول نہ ہو تو مقدار نصاب کا پانچواں حصہ وصول ہونے پر اس پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوگی اور ہر پانچویں حصہ کی زکوٰۃ فرض ہوتی رہے گی، اسی طرح پورے سالوں کی زکوٰۃ نکالی جائے گی۔

درمختار میں ہے:

"عند قبض اربعين درهما من الدين القوي كقرض وبدل مال تجارة فكلما قبض اربعين درهما يلزمه درهم قال الشامي وذكر في المنتقى رجل له ثلث مائة درهم دين حال عليها ثلثة احوال فقبض مائتين فعند ابي حنيفة يزكي للسنة الاولى خمسة

---

(۱) درمختار علیٰ هامش رد المحتار ۲/۵۸ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۶/۳۹ و ۸۲۔

والثانية والثالثة اربعة اربعة من مائة وستين زاد شيء عليه في الفضل لانه دون الاربعين (1)

دوسری قسم یہ ہے کہ مال تجارت کے علاوہ خانگی سامان یا استعمالی اشیاء کی قیمت خریدار کے ذمہ باقی ہو تو یہ دین متوسط ہے ایک سال یا متعدد سالوں کے بعد وصول ہونے پر اس کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی فرض ہوگی اور یکمشت وصول نہ ہو تو جب تک مقدار نصاب کے برابر قرض وصول نہ ہو اس کی زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی اور وصولی کے بعد پچھلے سالوں کی زکوٰۃ بھی لازم ہوگی اگرچہ یہ وصول شدہ قرض بقدر نصاب نہ ہو لیکن دیگر مال کے ساتھ مل کر نصاب بن جائے تو اس کو شامل کرکے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔

"قوله في الاصح قد علمت انه ظاهر الرواية وعبارة الفتح والبحر في صحيح الرواية قلت لكن قال في البدائع ان رواية ابن سماعة انه لا زكوة فيه حتى يقبض المائتين ويحول الحول من وقت القبض هي الاصح من الروايتين عن ابي حنيفة رحـ (2)

تیسری قسم یہ ہے کہ نقد روپیہ اور اشیاء کی فروختگی کے علاوہ کسی اور سبب سے دوسرے کے ذمہ قرض ہو جائے مثلاً شوہر کے ذمہ بیوی کا مہر یا بیوی پر شوہر کا بدل خلع یا قاتل پر دیت خون بہا، یا ملازم کی تنخواہ تو یہ قرض دین ضعیف ہے وصولی کے بعد مالک کے پاس سال گزرنے پر اس کی زکوٰۃ فرض ہوگی یہ وصول شدہ مال بقدر نصاب نہ ہو اور دیگر مال کے ساتھ شامل کرکے نصاب بن جائے تب زکوٰۃ فرض ہوگی مگر حق دار کو وصول ہونے سے پہلے گزرے ہوئے سالوں کی زکوٰۃ اس پر فرض نہیں۔

درمختار میں ہے:

"وعند قبض مائتين مع حولان الحول بعده اي بعد القبض من دين ضعيف وهو بدل غير مال كمهر ودية وبدل كتابة وخلع الا اذا كان عنده ما يضم الى الدين الضعيف قال الشامي والحاصل انه اذا قبض منه شيئا وعنده نصاب يضم المقبوض

---

(1) رد المحتار ٢/٣٥ (2) رد المحتار ٢/٣٦

بالنصاب ويزكيه بحوله ولا يشترط له حول بعد القبض (۱)

قرض کے اقسام و احکام کی مذکورہ تفصیل سے یہ مسئلہ واضح ہو جاتا ہے کہ قدرت کے باوجود مدیون دین کی ادائے گی میں ٹال مٹول کر رہا ہو تب بھی مدیون پر زکوٰۃ کو فرض نہیں کیا جا سکتا، البتہ قرض کی وصولی سے سال پورا ہونے پر مستقبل کی زکوٰۃ دائن کے ذمہ فرض ہوگی گزشتہ سالوں کی نہیں۔

"قلت وقد منا اول الزكاة اختلاف التصحيح فيه ومال الرحمتي الى هذا وقال بل في زماننا يقر المديون بالدين وبملائته ولا يقدر الدائن على تخليصه منه فهو بمنزلة العدم" (۲)

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

"دوسرا آدمی اجازت لے کر اپنی رقم سے صاحب مال کی طرف سے زکوٰۃ ادا کر دے تو زکوٰۃ ادا ہو جاتی ہے مگر بکر نے زید سے روپیہ قرض لیا ہے اس وجہ سے اس کا ادا کرنا سود شمار ہوگا، لہٰذا زکوٰۃ ادا نہ ہوگی زید کے ذمہ زکوٰۃ باقی رہے گی" (۳)

جواب سوال (۹):-

دین کی تینوں قسموں قوی، متوسط، ضعیف کی تفصیل سے پراویڈنٹ فنڈ کی شرعی حیثیت واضح ہوگی، مزید تحقیق یہ ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ مال تجارت کا معاوضہ نہیں اس لیے دین قوی میں داخل نہیں، البتہ خدمت جو کا معاوضہ ہے اس کو دین متوسط قرار دیں یا دین ضعیف بہرحال اصح روایت کے مطابق اس پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"ظاہر یہ ہے کہ دین قوی میں داخل ہونے کی صرف ایک صورت ہے کہ جب تجارت کی خدمت یا مال تجارت یا ارض تجارت کا معاوضہ ہو، اس کے سوا کوئی دین اجرت وغیرہ میں بالاتفاق داخل نہیں ہے اور یہ ظاہر ہے کہ پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ جو ملازم کی تنخواہ سے وضع کیا گیا یا بطور انعام گورنمنٹ کی طرف سے جمع کیا گیا ہے وہ اس میں قطعاً شامل نہیں اس

---

(۱) ردالمحتار ۲/۴۲ (۲) ردالمحتار ۲/۱۲ (۳) [illegible]

اس میں صرف دو ہی احتمال ہو سکتے ہیں کہ دین متوسط ہو یا دین ضعیف اور دین متوسط میں بھی اس کا داخل ہونا اس لیے مشکل ہے کہ دو روایتیں جو بحوالہ محیط منحۃ الخالق میں لکھی ہیں وہ دونوں عبد کی خدمت کے متعلق ہیں، حر کی خدمت کا وہاں ذکر نہیں اور ظاہر ہے کہ حر کی خدمت کو عبد کی خدمت پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کہ حسب تصریحات فقہاء خدمت عبد فی الجملہ مال ہے اور خدمت حر مال نہیں ہے۔ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ یہ دین ضعیف میں داخل ہے اور اگر اس کو دین متوسط بھی تسلیم کیا جائے تب بھی اصح روایت کے مطابق امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ کے نزدیک دین متوسط بھی بحکم دین ضعیف ہے۔ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ کما صرح بہ فی البدائع۔ الغرض پراویڈنٹ فنڈ کا روپیہ دین قوی میں تو داخل نہیں ہو سکتا اور دین متوسط میں داخل کرنا بھی اس وقت تک کسی روایت پر منطبق نہیں ہے جب تک کہ حر کی خدمت کو مال قرار دینے کی تصریح نہ ملے اور بالفرض اس میں داخل مان بھی لیا جائے تو حکم اس کا بھی اصح روایت پر دین ضعیف کی طرح یہی ہے کہ اس پر ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔"(۱)

فتاویٰ دار العلوم میں ہے :

"ملازمان کی تنخواہ میں سے جو کچھ روپیہ وضع ہوتا ہے اور پھر اس میں کچھ رقم ملا کر بوقت ختم ملازمت ملازموں کو ملتا ہے وہ ایک انعام سرکاری سمجھا جاتا ہے اس کی زکوٰۃ گزشتہ برسوں کی واجب نہیں ہوتی، آئندہ بعد وصول کے جب سال بھر نصاب پر گزر جاوے گا اس وقت زکوٰۃ دینا لازم ہوگا۔"(۲)

پراویڈنٹ فنڈ میں اپنی مرضی سے جمع کی ہوئی رقم پر زکوٰۃ فرض ہے اور اس پر ملی ہوئی زائد رقم سود ہے جیسا کہ فتاویٰ رحیمیہ میں ہے :

"جو نو روپے لازماً کٹتے ہیں اور اس پر جو مزید رقم ملے گی یہ سب سرکاری انعام ہے اس پر زکوٰۃ کا مسئلہ ملنے اور قبضہ میں آنے کے بعد جاری ہوگا، ملنے سے پہلے نہیں، البتہ جو رقم بلا جبر جمع کرنے کی آپ نے اپنی مرضی سے منظوری دی ہے اس میں زکوٰۃ کا حکم جاری ہوگا اگرچہ وہ

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۴۹ (۲) فتاویٰ دار العلوم ۶/۲۳۱، ۲۳۲

آپ کے قبضہ میں نہیں ہے جس طرح ہم کسی کو اپنی مرضی سے قرض دیتے ہیں اس پر بھی ہمارا قبضہ نہیں ہوتا مگر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اسی طرح ہم نے جو رقم کسی کے پاس امانت رکھی ہے اس پر بھی ہمارا قبضہ نہیں ہے مگر وہ ہماری ملک ہے اور ہم نے اپنی مرضی سے امانت رکھوائی ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اسی طرح صورت مذکورہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہے اور اس رقم پر سود کے نام سے جو رقم ملے گی وہ سود ہوگی کیوں کہ وہ آپ کی ذاتی رقم کے حساب میں دی گئی ہے۔" (۱)

نماء کی حقیقت اور اس کی صورتیں

مال میں زیادتی نماء ہے۔ مویشی سے نسل چلانا یا تجارت سے مال کمانا یہ ظاہری بڑھوتری ہے، سونے چاندی اور قیمتی اشیاء کو محفوظ رکھنے کے باوجود ان کی قیمتوں میں اضافہ ہونا بھی نماء کی ایک صورت ہے مشنریز اور مکانات سے آمدنی حاصل کرنا بھی نماء ہے۔

حضرت مولانا عمر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ

"مال نامی ایسے مال کو کہتے ہیں جس سے آدمی کے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے جو مکانات یا کوٹھی تجارتی مقصد کے لیے بنائی جاتی ہیں تاکہ ان سے نفع حاصل کیا جائے خواہ فروخت کرکے خواہ کرایہ پر چلا کر وہ مال تجارت ہیں اور ان کی مجموعی قیمت پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ اس سے جو آمدنی ہوتی ہے اگر وہ آمدنی آدمی کے پاس بچتی ہے یعنی اس کے اخراجات میں صرف نہیں ہو جاتی اور وہ سال بھر تک محفوظ رہتی ہے تو اس پر الگ زکوٰۃ فرض ہوگی۔ ہمارے علماء کو بعض ان روایات اور ائمہ فقہاء کے ان ارشادات سے غلط فہمی ہوئی ہے جن میں مکانات پر زکوٰۃ نہ ہونے کی تصریحات آگئی ہیں۔ حالاں کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ہمارے ائمہ فقہاء کے عہد میں مکانات تجارتی مقصد کے لیے نہیں بنائے جاتے تھے لوگ صرف اپنی رہائش کے مکانات بناتے تھے، موجودہ صورت حال اس سے قطعاً مختلف ہے جو قدیم زمانہ میں پائی جاتی تھی لہٰذا

---

(۱) فتاویٰ رحیمیہ ۵/۱۳۹

ان ارشادات کو دلیل نہیں بنایا جاسکتا۔ آج کل جو مکانات کرایہ پر چلانے کے لیے بنائے جاتے ہیں وہ قطعاً مال تجارت ہیں اور وہ رہائشی مکانات کے ضمن میں نہیں آتے ان کی جو کچھ بھی مجموعی قیمت ہو اس پر زکوٰۃ فرض ہوگی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں گھوڑوں پر زکوٰۃ نہیں لی جاتی تھی کیوں کہ آپ کے عہد میں تجارتی بنیاد پر گھوڑوں کی پرورش نہیں کی جاتی تھی، بلکہ اپنے ذاتی استعمال کے لیے پالے جاتے تھے اس عہد میں گھوڑوں کا وجود غزوہ و جہاد کے لیے آلاتِ حرب کی حیثیت رکھتا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں پر زکوٰۃ نہ لینے کا حکم دیا تھا، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاد کی وسعت کے ساتھ ساتھ گھوڑوں کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا اور لوگوں نے تجارتی مقاصد کے لیے گھوڑوں کی پرورش شروع کردی تھی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے عہد میں گھوڑوں پر زکوٰۃ لگانی پڑی تھی۔ بعینہ یہی صورت مکانات کے سلسلہ میں بھی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک عہد میں بلکہ ہمارے ائمہ فقہاء کے زمانہ میں بھی مکانات کی تعمیر نے کمرشیل حیثیت اختیار نہیں کی تھی، لہٰذا اس وقت ان پر زکوٰۃ عائد نہیں فرمائی گئی، لیکن آج یہ صنعت تجارتی صورت اختیار کرچکی ہے لہٰذا انھیں مال زکوٰۃ تصور کرکے ان پر زکوٰۃ عائد کرنی ہوگی۔" (۱)

اور مشنریز کے متعلق مولانا عمر کی رائے یہ ہے کہ

"اسی طرح کارخانوں اور فیکٹریز پر کوئی زکوٰۃ عائد نہیں کی جاتی اور فقہاء کے اس قول کو دلیل میں پیش کیا جاتا ہے، اصحاب حرفہ کے آلات پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، موجودہ کارخانے اور فیکٹریاں بھی آلات حرفہ میں شامل ہیں لہٰذا ان پر زکوٰۃ نہیں لی جاسکتی، البتہ کارخانہ دار اس کارخانہ سے جو منافع کماتا ہے صرف اس پر زکوٰۃ لی جاسکتی ہے۔ اس سلسلہ میں بھی بڑی غلط فہمی پائی جاتی ہے، آلات حرفہ سے مراد دست کاری کے وہ آلات ہیں جو اہل حرفہ استعمال کرتے ہیں، یعنی جن سے وہ اپنے ہاتھوں کے ذریعہ کام لیتے ہیں، مثلاً لوہار کے اوزار، معمار کے آلات، جولاہے کی دستی کھڈی، حجام کے اوزار وغیرہ وغیرہ ان آلات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے، کیوں کہ ان اوزار کے ذریعہ ہی سے وہ اپنی روزی حاصل ———

---

(۱) فقہ القرآن ص۲۵۲

کرتا ہے ان کے بغیر وہ اپنی روزی حاصل نہیں کرسکتا ان آلات کو وہ اپنے ہاتھوں سے استعمال کرتا ہے لیکن کارخانوں کی مشینری اس زمرہ میں نہیں آتی قدیم زمانہ میں نہ صنعت وحرفت کی یہ اجتماعی اور تجارتی صورت تھی جو آج ہے اور نہ ہمارے فقہاء نے ان کے متعلق کوئی حکم دیا تھا صنعت وحرفت نے اس عہد میں یہ تجارتی اہمیت حاصل نہیں کی تھی اور پھر کارخانوں اور فیکٹریوں کی مشینیں یوں بھی آلات حرفہ نہیں ہیں کہ انھیں کارخانہ دار اپنے ہاتھوں سے استعمال کرکے اپنی روزی نہیں کماتا بلکہ مشین مینوں اور تربیت یافتہ افراد کو ملازم رکھتا ہے اور ان کے ذریعے سے ان مشین مینوں سے کام لیتا ہے اور مختلف مصنوعات بنواتا ہے۔ اگر یہ مشین آلات حرفہ ہیں تو وہ ان اہل حرفہ کے آلات ہیں جو انھیں اپنے ہاتھوں سے چلا رہے ہیں کارخانہ دار کے آلات حرفہ نہیں جو ایک سرمایہ دار کی حیثیت سے دفتر میں بیٹھ کر ان تربیت یافتہ مزدوروں سے کام لیتا ہے اور ان کے خون پسینے سے بنائی ہوئی مصنوعات کو ملک کی منڈیوں میں چوگنے اور پانچ گنے داموں پر فروخت کرتا ہے اور اس طرح اپنی تجوریاں بھر رہا ہے اور یوں سرمایہ جمع کرکے یکے بعد دیگرے کارخانے پر کارخانے اور فیکٹریوں پر فیکٹریاں بناتا چلا جارہا ہے اور زکوٰۃ میں ایک پائی نہیں دیتا۔ یاد رکھیے یہ تمام کارخانے اور فیکٹریاں سامان تجارت ہیں اور ان کی قیمت پر نصاب کے حساب سے زکوٰۃ واجب ہے۔[1]

فتاویٰ دارالعلوم میں ہے :

"کرایہ پر مکان چلانے کے لیے لینا یعنی کرایہ پر دینے کے لیے مکان خریدنا یہ بھی تجارت کے لیے ہی خریدنا ہے پس زکوٰۃ اس کی قیمت پر واجب ہوگی۔"

درمختار میں ہے :

" والاصل ان ما عدا الحجرین والسوائم انما یزکی بنیة التجارة بشرط عدم المانع المودی الی الثنی وبشرط مقارنتها لعقد التجارة وهو کسب المال بالمال بعقد شراء او اجارة قوله ما عدا الحجرین الخ

---

[1] فقہ القرآن /۲۵۷

وما عداه مذكر كالجواهر والعقارات والمواشي المعلوفة والعبيد والثياب والأمتعة ونحو ذلك من العروض. (شامی)

قوله مالم ينوه اى يوجهه للتجارة (شامی)

اس سے معلوم ہوا کہ اجارہ پر دینے کے لیے خریدنا بھی تجارت کے لیے خریدنا ہے۔ (۱)

سوال (۲۲۲) ایک شخص نے آٹا پیسنے کی مشین لگائی ہے اس پر زکوٰۃ ہے یا نہیں؟

جواب: اس مشین کی قیمت پر زکوٰۃ ہے۔ (۲)

فتاویٰ دار العلوم سے بھی مولانا عثمانی کی تائید ہوتی ہے۔ لہٰذا علماء کرام کو حالات حاضرہ اور دلائل مندرجہ کی روشنی میں کرایہ کے مکانوں اور مشینریوں کی قیمتوں پر زکوٰۃ عائد کرنے کے متعلق غور وفکر کرنا چاہیے۔

حاجتِ اصلیہ

خانگی ساز و سامان، رہائشی مکان، تجارتی دکان، زراعتی زمین، مستعمل سواری، ستر پوشی، روزی جسمانی ضروریات کا جن چیزوں پر دار و مدار ہے، حاجت اصلیہ میں داخل ہیں۔

"قال الشامي سئل محمد عمن له ارض يزرعها او حانوت يستغلها او دار غلتها ثلاثة آلاف ولا تكفي لنفقته ونفقة عياله سنة يحل له اخذ الزكوة وان كانت قيمتها تبلغ الوفا وعليه الفتوى وعندهما لا يحل۔ (۳)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"حضرت استاذی علیہ الرحمۃ کو امام محمد رحمہ کے قول پر فتویٰ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور خود بھی احقر اسی پر عمل ہے مگر اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس غلہ سے یہ شخص مستغنی نہیں کہ تب تو خود اس کی قیمت کا اعتبار ہے پس اگر وہ فاضل از حاجت اصلیہ

---

(۱) فتاویٰ دار العلوم ۶/۱۲۰ (۲) ایضاً ۶/۱۳۲ (۳) ردالمحتار ۲/۱۵

قیمت میں بقدر نصاب ہے تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطرہ و اضحیہ ہے اور اگر اس سے استغلال کرتا ہے تو اس کے غلہ کا اعتبار ہے اور اگر اس کا غلہ سال بھر کے خرچ سے بقدر نصاب نہیں بچتا تو مانع اخذ زکوٰۃ و موجب فطرہ و اضحیہ نہیں، اور امام صاحب کے قول کا تقدم علی الاطلاق نہیں کما فصل فی رسم المفتی۔"(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ضروریات زندگی اور حاجت اصلیہ کا تعین دور حاضر میں حالات کا جائزہ لے کر علماء ہی کو کرنا چاہیے۔ کفایت، مؤنت، علاقہ اور ماحول اور گرانی و ارزانی کے اعتبار سے مختلف ہونے کی بناء پر حاجت اصلیہ کا معیار مقرر کرنا ضروری ہے۔

"قال الشامی وسئلت عن المرأۃ هل تصیر غنیة بالجهاز الذی تزف به إلی بیت زوجها والذی یظهر مما مر أن ماکان من اثاث المنزل وثیاب البدن واوانی الاستعمال مما لابد لامثالها منه فهو من الحاجة الاصلیة وما زاد علی ذلك من الحلی والاوانی والامتعة التی یقصد بها الزینة اذا بلغ نصابا تصیر به غنیة"(۲)

کون سا دَین مانع زکوٰۃ ہے؟

دَین عبد یعنی بندے جس کا مطالبہ کرنے والے ہوں ایسا قرض وجوب زکوٰۃ سے مانع ہے۔ لہٰذا اس کو مال سے منہا کر کے باقی ماندہ کی زکوٰۃ دینا فرض ہے۔

"وصدیون للعبد بقدر دینه فیزکی الزائد ان بلغ نصابا"(۳)

طویل الاجل کثیر دین کی جب تک کل قسطیں ادا نہ ہو جائیں غناء کا تحقق نہیں ہوگا اور زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی۔

"قال الشامی ولایتحقق الغنی بالمال المستقرض مالم یقبض"(۴)

---

(۱) امداد الفتاوی ۲/۳۱ (۲) شامی ۲/۶۵ (۳) درمختار علی هامش رد المحتار ۲/۶

(۴) رد المحتار ۲/۶

حضرت مولانا ظفر احمد عثمانی فرماتے ہیں:

"اگر کسی کے پاس اس قدر مال ہے کہ اس پر زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے لیکن وہ اس کے ساتھ ہی مقروض بھی ہے تو اگر اس پر قرض اتنا ہو جو اس کے مال کو محیط ہو جائے یعنی دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے لیکن دس ہزار روپے ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی البتہ اگر دس ہزار روپیہ کا مال اس کے پاس ہے اور پانچ ہزار روپیہ کا قرض ہے تو اسے صرف پانچ ہزار روپیہ پر زکوٰۃ دینی ہوگی، اسی ذیل میں وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو بینکوں سے قرض لے کر کوئی کارخانہ یا فیکٹری لگاتے ہیں اگر کارخانہ اور فیکٹری کی قیمت کے برابر ہی اس پر قرض بھی ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہوگی، البتہ اگر قرض کی مقدار کم ہے تو جس قدر فیکٹری اور کارخانہ کی قیمت قرض سے زیادہ ہے اس مقدار پر زکوٰۃ واجب ہوگی اس سے زیادہ پر نہیں۔"(۱)

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کی مجموعی مالیت خواہ کتنی ہی ہو اس کے مالک شرکاء ہیں لہٰذا وجوب زکوٰۃ میں ان میں سے ہر فرد کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔ جن شرکاء کے حصے بقدر نصاب مالیت کے ہوں گے ان پر زکوٰۃ فرض ہوگی باقی پر نہیں۔ امداد الفتاویٰ میں ہے:

"سوال (۵) مشترک تجارت میں بعد ازاں حول کے یعنی زکوٰۃ مشترک واجب ہوگی؟

الجواب: نہیں۔

بقیہ سوال: یا انفراداً؟ —— الجواب: ہاں۔

۶۔ سوال: یعنی کل شرکاء ایک زکوٰۃ کا روپیہ نکالیں؟ —— الجواب: نہیں۔

بقیہ سوال: اور اگر بعض حصہ دار زکوٰۃ نہ دینا چاہیں تو ہر شخص انفراداً اپنے روپے مع نفع جو بعد حول کے بعد اس کے حصہ میں آوے اس کی زکوٰۃ ادا کر سکتا ہے؟

الجواب: ہاں۔" (۲)

---

(۱) فقہ القرآن ۳۳۶/۱ (۲) امداد الفتاویٰ ۵۴/۲

مندرجہ بالا فتویٰ سے معلوم ہوا کہ تمام شرکاء کے مجموعی حصول میں زکوٰۃ نہیں بلکہ ہر شریک انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالنے کا ذمہ دار ہے۔

" وسببه ای سبب افتراضها ملك نصاب حولى نسبة للحول لحو لانه عليه تام بالرفع صفة ملك "(۱)

جن شرکاء کی ملکیت میں بقدر نصاب مالیت کا شئیر ہو، ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور جس شئیر کی مالیت اتنی نہ ہو اس کی زکوٰۃ واجب نہیں۔

ہیرے جواہرات

ہیرے جواہرات کی تجارت کی جائے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہونا ظاہر ہے۔ دور حاضر میں ہیرے جواہرات قیمتی مال ہیں ان کی ذخیرہ اندوزی سے قیمت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے اس لیے ہیرے جواہرات کی شکل میں سرمایہ محفوظ کرنے پر بھی زکوٰۃ فرض ہونی چاہیے۔

مولانا عمر عثمانی تحریر فرماتے ہیں کہ:

" ہمارے نزدیک امام ابو یوسفؒ اور امام عنبریؒ کا قول زیادہ صحیح ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تمام جواہرات یا تو معدنیات سے تعلق رکھتے ہیں یا سمندری برآمدات سے۔ معدنیات کے متعلق ہم صحیح روایات میں خمس کے وجوب کا حکم آیا ہے۔ سمندری برآمدات مثلاً مروارید، مونگا وغیرہ بھی معدنیات ہی کے شکل میں ہیں لہٰذا ان میں خمس واجب ہونا چاہیے، لیکن یہ خمس ان لوگوں پر واجب ہوتا ہے جو ان چیزوں کو زمین سے یا سمندر سے برآمد کرتے ہیں۔ جو ان کو خرید کر اپنے پاس ذخیرہ کرتے ہیں یا بطور زیورات کے انھیں استعمال کرتے ہیں ان پر زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے کیونکہ یہ مال متقوم ہیں اور سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ایک ذریعہ ہیں۔ ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ہمارے فقہاء کرام نے یہ فیصلہ فرماتے وقت کہ جواہرات وغیرہ میں زکوٰۃ نہیں ہوتی اس نکتہ کو کیوں نظر انداز فرما دیا کہ یہ بھی سرمایہ کو محفوظ کر لینے کا ہی ایک ذریعہ ہے۔ جہاں تک

---

(۱) درمختار علیٰ ھامش الرد ج ۲/۲

ہمارا خیال ہے ہمارے فقہاء کے دور میں ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے اور ان کے ساتھ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کا رواج نہیں تھا۔ خال خال کچھ لوگ دو چار موتی یا زمرد و یاقوت وغیرہ کے نگینے اپنی انگوٹھی وغیرہ میں لگوا لیتے تھے اسی لیے انھوں نے یہ فیصلہ فرمایا ورنہ ظاہر ہے کہ ہمیں کوئی معقولیت نظر نہیں آتی کہ آدمی اپنے سرمایہ کو سونے اور چاندی کی شکل میں جمع کرے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اور اگر اسی سرمایہ کو جواہرات کی شکل میں محفوظ کرے تو اسے زکوٰۃ سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔ حالاں کہ سرمایہ دونوں جگہ موجود ہے، محض اس کی حفاظت کے طریقے مختلف ہیں۔ اس طرح تو ہم سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے طریقے بتلاتے ہیں کہ وہ اپنے سرمایہ کو محفوظ کرنے کے لیے سونے چاندی کو ذخیرہ نہ کریں بلکہ جواہرات کو ذخیرہ کرلیں اس کا ثبوت کہ فقہاء کے عہد میں جواہرات کی صورت میں سرمایہ کو ذخیرہ کرنے کا عام رواج نہ ہوا تھا یہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی آیت:

" وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ:

یقیناً جو لوگ سونے چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور انھیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو (اے پیغمبر اسلام) آپ انھیں دردناک عذاب کی خوش خبری دے دیجیے۔

میں سونے اور چاندی کے ذخیرہ کرنے کا ذکر فرمایا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ عہد قدیم میں جواہرات کو ذخیرہ کرنے اور سرمایہ کو اس شکل میں محفوظ کرنے کا طریقہ رائج نہیں تھا اس لیے اگر فقہاء کرام کے عہد تک بھی یہی صورت حال تھی تو بڑی حد تک انھیں معذور سمجھا جا سکتا ہے لیکن آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی ہے اس لیے ان ارشادات کو حرف آخر قرار دے کر سرمایہ دار طبقہ کو زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اس طریقہ کو اپنانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔" (۱)

ہیرے جواہرات کے زیورات سے اگرچہ تمول مقصد نہ ہو صرف زینت کے طور پر ہی استعمال کیے جائیں تب بھی ان پر زکوٰۃ فرض ہونا چاہیے۔ رد المحتار میں ہے:

---

(۱) فقہ القرآن / ۲۶۳۔

"سئل الحسن بن علي عمن لها جواهر واللآلي تلبسها في الأعياد وتتزين بها للزوج وليست للتجارة هل عليها صدقة الفطر قال نعم اذا بلغت نصابا" (۱)

علامہ شامی فرماتے ہیں:

"ومن زاد على ذلك من الحلي والأواني والأمتعة التي يقصد بها الزينة إذا بلغ نصابا تصير به غنية" (۲)

سامان تجارت یا اراضی تجارت کی زکوٰۃ

جو سامان تجارت تاجر کے قبضہ میں ہے ادائے گی کے دن کی قیمت کے اعتبار سے اس کی زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ تھوک بیوپاری کو زکوٰۃ دیتے وقت تھوک قیمت کا اعتبار کرنا چاہیے اور پھٹکر تجارت کرنے والے کو پھٹکر قیمت سے ہی زکوٰۃ ادا کرنا چاہیے۔ تجارتی کاروبار کے لیے خریدی گئی زمینوں کی زکوٰۃ ادا کرتے وقت ان زمینوں کی مارکیٹ میں جو قیمت ہو وہی معتبر ہونا چاہیے۔

"وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الأداء وفي السوائم يوم الأداء اجماعا وهو الأصح" (۳)

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

تجارتی شیئرز کے اصل سرمایہ اور اس سے حاصل شدہ نفع دونوں پر زکوٰۃ فرض ہے، کرایہ وصول کرنے والی کمپنیوں کے شیئرز میں صرف نفع پر ہی زکوٰۃ ہے۔

فتاویٰ رحیمیہ میں ہے:

"شیئرز پر زکوٰۃ ہے۔ شیئرز پر جو کمپنی تجارت کرتی ہے جیسے کہ کپڑا اور پیپر کے کارخانے اور مل کمپنی وغیرہ تو اصل رقم اور اس کے نفع دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے اور جو کمپنی تجارت

---

(۱) رد المحتار ۲/۲۹۸ (۲) شامی ۲/۱۵ (۳) درمختار علی ہامش الرد ۲/۲۸۔

نہیں کرتی بلکہ زید وصول کرتی ہے جیسا کہ ریلوے کمپنی وغیرہ تو زکوٰۃ صرف نفع پر واجب ہے۔ اصل رقم پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ (۱)

ادائیگی زکوٰۃ کے وقت مارکیٹ میں شیئر کی جو قیمت ہوگی اسی کے اعتبار سے زکوٰۃ ادا کرنا فرض ہے۔ فتاویٰ دارالعلوم میں ہے کہ جو قیمت اس وقت ہے یعنی پانچ سو روپے کی زکوٰۃ دیوے۔ (۲)

دوسری جگہ اس طرح ہے:

"سوال (۲۱۸) زید نے ایک کمپنی کے چند حصے پانچ ہزار کے خریدے اس میں جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ سالانہ تقسیم ہوکر حصہ داروں کو ملتا ہے زید کو بھی پانچ سو روپے ملے آیا زید کے ذمہ پانچ ہزار کی زکوٰۃ دینا لازم ہے یا صرف نفع کی رقم پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔

الجواب: زید کو اس رقم پانچ ہزار کی زکوٰۃ بھی دینی لازم اور فرض ہے۔ کذا فی الدر المختار۔ (۳)

قرض حاصل کرنے والی حکومت یا کمپنی کی طرف سے دیے گئے سرٹیفکیٹ کا نام بونڈ ہے لہٰذا یہ قرض دین قوی ہے، مدت معینہ گزرنے کے بعد بونڈ کیش کرانے پر گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ بھی دینی لازم ہوگی۔ کما فی فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۳۶۔

نصاب زکوٰۃ

"وسیبلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعین ما یبلغ به إلى قوله تقومه بالانفع للفقیر۔ (۴)

زکوٰۃ کی ادائیگی میں احتیاط کا تقاضہ اور انفع للفقراء یہ ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت اور وجوب کے لیے چاندی کے نصاب کو معیار مقرر کرنا مناسب ہے۔

کما فی عامۃ کتب الفتاویٰ

(۱) فتاویٰ رحیمیہ ۵/۱۹ (۲) فتاویٰ دارالعلوم ۶/۱۳۶ (۳) ایضاً ۶/۱۳۴

(۴) درمختار علی الرد ۲/۳۱

مصارف زکوٰۃ

(۱) غیر مستطیع طلبہ کو نقد یا چیک کی شکل میں مقررہ خرچ دے کر اس کو فیس کے نام سے وصول کیا جائے تو شرعاً زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

مہتمم طلبہ کی طرف سے وکیل ہے اس لیے زکوٰۃ پر مہتمم کا قبضہ ہو جانا زکوٰۃ کی ادائے گی کے لیے کافی ہے۔ فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

"مدرسہ کا مہتمم وکیل ہوتا ہے طلبہ فقراء کی طرف سے کہ ارباب اموال سے زکوٰۃ وصول کر کے طلبہ پر صرف کرے اس صورت میں بلاشبہ مختلف ارباب اموال کی زکوٰۃ کو خلط کرنا مہتمم کے لیے درست ہے۔ در مختار کی جو عبارت سوال میں نقل کی گئی اس کے متصل ہی ایک استثناء بھی مذکور ہے اگر اس پر غور کیا جائے تو ارباب اموال کی طرف سے اذن کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔

خلط زکوٰۃ موکلیہ ضمن وکان متبرعا الا اذا وکلہ الفقراء اھ۔

(درمختار) وصار خالطا مالهم بعضه من بعض اھ: (شامی ۲/۲۶۹)"(۱)

حضرت فقیہ الامت مولانا مفتی محمود حسن صاحب دامت فیوضہم نے اسی فتویٰ پر اشکال کے جواب میں تذکرۃ الرشید(۲) سے نقل فرمایا ہے کہ

"مہتمم مدرسہ کا نائب جملہ طلبہ کا ہوتا ہے جیسے امیر نائب جملہ عامہ کا ہوتا ہے پس جو شئی کسی نے مہتمم کو دی مہتمم کا قبضہ خود طلبہ کا قبضہ ہے، اس کے قبضے سے ملک معطی سے نکلا اور ملک طلبہ کا ہو گیا اگرچہ وہ مجہول الکمیت والذات ہوں، مگر نائب معین ہے پس بعد موت معطی کے ملک ورثہ معطی اس میں نہیں ہو سکتی اور مہتمم بعض وجوہ میں وکیل معطی کا بھی ہو سکتا ہے، بہر حال نہ یہ وقف مال ہے اور نہ ملک ورثہ معطی کی ہو گی اور نہ خود معطی کی ملک رہے گی۔" (۳)

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۲۱۶/۱۰   (۲) تذکرۃ الرشید ۱۹۶/۲، ۱۹۵

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۲۱۹/۱۰

فتاویٰ محمودیہ جلد سوم میں ہے کہ:

"مہتمم مدرسہ کو ارباب اموال نے صراحۃً وکیل بنایا ہے کہ ہمارا مال حسب صواب دید مصارف میں صرف کردیں، غرباء کا بھی وکیل ہے اس طرح کہ طلبہ نے جب اس کے اہتمام کو تسلیم کرلیا تو گویا یہ کہدیا کہ آپ ہمارے واسطے ارباب اموال سے زکوۃ وغیرہ وصول کرکے ہماری ضروریات (کھانا کپڑا وغیرہ) میں صرف کردیں۔ امداد الفتاویٰ جلد ۲ کے اخیر میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے اس کے متعلق سوال کیا ہے اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ نے جواب دیا ہے نہایت مفید علمی سوال ہے اور ایسا ہی جواب ہے جس سے شبہ مرتفع ہوجائیگا۔" (۱)

(۲) مدارس کے سفراء عاملین کے حکم میں نہیں، جیسا کہ امداد الفتاویٰ (۲) میں ہے، نیز صحت عقد کے لیے عمل اور اجرت دونوں کا متعین ہونا ضروری ہے، جب کہ کمیشن کے معاملہ میں دونوں مجہول ہیں، لہٰذا کمیشن پر چندہ کے لیے سفراء کو مقرر کرنا درست نہیں۔ حضرت فقیہ الامت مفتی محمود حسن صاحب مفتی اعظم دار العلوم دیوبند فرماتے ہیں:

"اس طرح معاملہ کرنا کہ جس قدر چندہ لاؤگے اس میں سے نصف یا ثلث وغیرہ تم کو ملے گا شرعاً درست نہیں، اس میں اجرت مجہول ہے، نیز اجرت ایسی چیز کو قرار دیا گیا ہے جو عمل اجیر سے حاصل ہونے والی ہے کہ یہ دونوں چیزیں شرعاً مفسد اجارہ ہیں۔ وتفسد الاجارة بجهالة المسمٰی کله وبعضه ولو دفع غزلا لأخر لينسجه بنصفه و استاجر بغلا ليحمل له طعامه ببعضه الخ" (درمختار) (۳)

اور فتاویٰ محمودیہ جلد عاشر میں دلائل تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

"اس کو روپیہ ملنا ارباب اموال کے دینے پر موقوف ہے، گویہاں اجارہ ایسے عمل پر ہے جو اجیر کے اختیار سے خارج ہے اس کے اختیار میں لوگوں کے پاس جانا اور مدرسہ کی ضروریات بتاکر چندہ کی ترغیب دینا ہے مگر اس کے لیے کوئی وقت مقرر نہیں کہ کتنے گھنٹے روزانہ لوگوں

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۳۱/۲ (۲) امداد الفتاویٰ ۵۷/۲

(۳) فتاویٰ محمودیہ ۵۲۳/۸

کے پاس جاتا ہے لہٰذا یہ منفعت بھی مجہول ہے اور اجرت ایسی چیز کو قرار دیا جائے گا جو اجیر کے عمل سے حاصل ہوگی۔ وقت معاملہ وہ معدوم ہے مستاجر کے پاس نہیں اس کے تسلیم کرنے پر مستاجر کو قدرت نہیں، یہ بھی معلوم و متعین نہیں کہ کتنا چندہ سفیر کی ترغیب و محنت سے حاصل ہوگا، اس لئے اس کا نصف بھی معلوم و متعین نہیں، پس اجرت وعمل دونوں مجہول ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تھوڑے وقت میں زیادہ روپیہ وصول ہوجائے اور سفیر زیادہ رقم کا مستحق قرار پائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ وقت اور محنت میں بھی تھوڑا روپیہ ملے یا بالکل نہ ملے اور سفیر تھوڑی رقم کا مستحق قرار پائے یا بالکل ہی محروم رہے، اس کا نتیجہ بھی معلوم ہے۔(۱)

زکوٰۃ سے تنخواہ حساب کتاب کے عملہ کو دی جائے یا دیگر ملازمین کو، اس مد میں دینا جائز نہیں۔

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۹/۳۶۲۔

مسئلہ زکوٰۃ پر ایک نظر

از:- مفتی حبیب اللہ القاسمی، جامعہ عربیہ ریاض العلوم، جون پور

زیر نظر مقالہ مسئلہ زکوٰۃ کے محور اول پر مشتمل ہے، اختصار کے ساتھ زیر بحث عنوان پر روشنی ڈالی جائے گی۔ وباللہ استعین وھو الموفق للصواب۔

زکوٰۃ جن اموال پر واجب ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) سوائم۔ (۲) مال تجارت۔

چوں کہ وجوب زکوٰۃ کے شرائط میں سے مال کا نامی ہونا ہے اور نماء بر صورتی من حیث العین سماً سے ہوتی ہے اور من حیث المعنیٰ تجارت سے ہوتی ہے، پھر مال تجارت کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) اثمان مطلقہ جسے ثمن خلقی بھی کہا جاتا ہے، جیسے سونا چاندی۔ (۲) سلع۔

البتہ دونوں میں فرق ہے وہ یہ کہ سونا چاندی کی تخلیق ہی دراصل تجارت کے لیے ہوئی ہے اس لیے اس میں تجارت کی نیت وجوب زکوٰۃ کے لیے ضروری نہیں، لہذا خواہ تجارت کے لیے کوئی شخص رکھے ہوئے ہو یا خرچ کے لیے بہر حال اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی، بخلاف سونے چاندی کے علاوہ دیگر سامان کہ اس میں جس طرح تجارت کی صلاحیت ہے اسی طرح اس کے عین سے بھی نفع اٹھایا جا سکتا ہے بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد اصلی اس کے عین سے انتفاع ہے، اس لیے اس پر وجوب زکوٰۃ کے لیے نیت تجارت ضروری ہے تاکہ یہ مال تجارت ہو جائے۔ (۱)

---

(۱) تحفۃ الفقہاء، ۱/۲۶۳، ۲۶۴

اور سونا چاندی خواہ جس شکل میں بھی ہوں مضروب ہوں یا غیر مضروب، زیورات ہوں یا تبر، استعمال جائز ہو یا نہ ہو، تجارت کی نیت ہو یا نہ ہو۔ (۱)

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے ان کا بقدر نصاب ہونا بھی ضروری ہے اور نصاب مختلف ہیں مثلاً چاندی میں دو سو درہم سونے میں بیس مثقال اور اگر مال از قبیل عروض ہے تو وہ سونے یا چاندی کے نصاب کے بقدر ہو اور اگر مال از قبیل حیوانات ہے تو ان کا شریعت مقررہ کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ (۲)

مال بقدر نصاب ہونے کے بعد اس میں اوصاف اربعہ کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) حولان حول (۲) نصاب کا دین اور حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا۔

(۳) نصاب کا نامی ہونا خواہ حقیقۃً ہو یا تقدیراً۔

(۴) نصاب پر ملک تام کا حاصل ہونا۔ (۳)

اوصاف اربعہ میں سے ایک وصف ملک تام ہے، یعنی کسی بھی نصاب پر ملک تام کا تحقق اس وقت ہوگا جب ملک اور ید (قبضہ) کا تحقق ہو اگر ان دونوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہوگی تو ملک تام نہیں کہلائے گا۔ مثلاً مہر قبضہ سے پہلے ملک تو موجود ہے لیکن ید مفقود ہے اور مال مکاتب و مدیون میں ید تو ثابت ہے لیکن ملک مفقود ہے، لہٰذا صداق قبل القبض اور مال مدیون میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ کما فی سراج الوہاج۔ (۴)

(۱) صاحب السراج الوہاج کی تشریح کے مطابق وہ مال تجارت جس کی قیمت پیشگی ادا کر دی گئی ہو لیکن مال کی وصولی اب تک نہ ہوئی ہو اس کی زکوٰۃ مشتری (خریدار) پر واجب نہ ہوگی اس لیے کہ ملک تو ثابت ہے لیکن قبضہ میں ابھی نہیں آیا اس لیے ید کا تحقق نہیں ہوا اور وجوب زکوٰۃ کے لیے ملک اور ید دونوں کا تحقق ضروری ہے۔ چنانچہ علامہ شامی نے بحوالہ بحر اس صورت کو مستثنیٰ قرار دیا ہے:

"وخرج به ایضاً کما فی البحر المشتری للتجارۃ قبل القبض" (۵)

---

(۱) تحفۃ الفقہاء ۱/۲۹۶ (۲) ایضاً ۱/۲۹۶ (۳) ملتقی الابحر ۱/۴۲

(۴) فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۷۲ و مجمع الانہر ۱/۲۹۲ (۵) رد المحتار ۲/۲۹۳

لیکن علامہ سرخسی علیہ الرحمۃ کی عبارت کچھ فرق ہے جو کہ الاحیا عالمگیری میں موجود ہے،

"واما المبيع قبل القبض فقيل لا يكون نصابا والصحيح انه يكون نصابا"[1]

اس جزئیہ سے بظاہر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ خریدار پر صحیح قول کے مطابق زکوٰۃ واجب ہوگی۔ فلیتأمل۔

(۳) کرایہ کی مد میں دی گئی پیشگی رقم (ڈپوزٹ) پر کرایہ دار و مالک مکان میں سے کسی پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہونی چاہیے، مالک مکان پر تو اس وجہ سے نہیں کہ اس کو صرف ید حاصل ہے ملک نہیں، چونکہ یہ رقم عقد اجارہ کے فسخ یا تکمیل مدت کے بعد واجب الرد ہوتی ہے، اور کرایہ دار پر زکوٰۃ اس وجہ سے نہیں کہ اس کو ملک تو حاصل ہے ید نہیں اور وجوب زکوٰۃ کے لیے مال پر ملک و ید دونوں کا جمع ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ مسئلہ رہن کے تحت بیان کردہ تعلیلات فقہاء سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

"ولا في مرهون اي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد"[2]

ابن نجیم صاحب البحر الرائق فرماتے ہیں:

"ومن الموانع الوجوب الرهن"[3]

البتہ اس رقم کی واپسی کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ کا مسئلہ زیر غور ہے، اگر ڈپوزٹ کو مسئلہ رہن پر قیاس کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ راہن پر استرداد کے بعد واجب نہیں ہوگی۔ اور اگر مسئلہ رہن پر قیاس نہ کیا جائے تو سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"واذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضية"[4]

(۴) مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے کہ جب تک وہ رقم

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۷۲ (۲) شامی ۲/۲۶۲ (۳) ایضاً

(۴) رد المحتار ۲/۲۶۳

مستحقین پر صرف نہیں ہوئی، وہ حکماً ملکِ معطی میں ہے تو یہ نظراً انتہا، انظار دقیقہ پر مشتمل ہونے کی وجہ سے
لائقِ تحمل ہے اس لیے ایسر و اسہل یہی ہے کہ اس کو ملکِ معطی سے خارج قرار دے کر ملکِ مدرسہ قرار دیا جائے
اور اس کی تائید کتاب الوقف کی بعض جزئیات سے بھی ہوتی ہے۔ (۱)

لہٰذا معطی پر زکوٰۃ کے واجب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح مدرسہ کے مہتمم پر
بھی اس کی زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ یہ رقوم غلۃ الوقف کے درجہ میں ہے اور جس طرح غلۃ الوقف پر زکوٰۃ
واجب نہیں، مدارس و اداروں کی رقوم پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں۔ (۲)

البتہ فقہی سمینار اہلِ مدارس سے سفارش کرے کہ بقدرِ ضرورت ہی مال کی فراہمی کریں تاکہ مال
زکوٰۃ اس طرح محبوس نہ ہو اور مستحق مدارس محروم نہ ہوں، لیکن اگر اہلِ مدارس کے پاس زکوٰۃ کی رقم پسماندہ
ہو تو احوط یہ ہے کہ اس کو بذریعہ تملیک رقوماتِ غیر واجبہ میں شامل کر لیا جائے اور اس کی احسن صورت
یہ ہے کہ کوئی فقیر مہتمم مدرسہ کی ضمانت پر قرض لے کر مدرسہ کو عطیہ دے اور مہتمم مدرسہ مد زکوٰۃ سے فقیر کو قرض
کی ادائیگی کے لیے دیدے۔

(۳) اگر پورا نصاب مال حرام ہو تو اس مال پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چوں کہ وجوبِ زکوٰۃ کے لیے
ملک ضروری ہے اور مال حرام جو اس کے پاس ہے اس کا وہ مالک نہیں، چوں کہ مال حرام
واجب الرد ہے لہٰذا مالک کا پتہ لگا کر وہ مال واپس کرے اور اگر مالک معلوم نہ ہو سکے تو وہ مال
واجب التصدق ہے، بلا نیتِ ثواب فقراء مسلمین کو دیدے۔ (۳)

اور اگر حرام و حلال مخلوط ہو گئے ہوں تو مال حرام نکالنے کے بعد باقی مال اگر بقدرِ نصاب ہو تو
زکوٰۃ واجب ہوگی اور اگر بقدرِ نصاب نہ ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔ (۴)

لیکن اگر مال حرام مال حلال کے ساتھ اس طرح مخلوط ہو گیا ہو کہ تمیز مشکل ہو تو تحری کر کے
ظنِ غالب پر عمل کرے اور ظنِ غالب کے بہت سے نظائر کتبِ فقہ میں موجود ہیں نیز اس انداز کے

---

(۱) ھندیہ ۲/۴۶۰ کتاب الوقف باب ۱۱ فصل ۲ وباب ۵ ص ۳۹۶ (۲) الکلام البدیع فی احکام التوزیع

(۳) درمختار ۲/۲۹۱ بل لو کان الکل خبیثا کما فی النہر وفی القنیۃ لو کان الخبیث نصابا لا یلزمہ الزکاۃ لان الکل واجب
التصدق علیہ الخ۔ (۴) درمختار ۲/۲۹۱ وھذا اذا کان لہ مال غیر ما استہلکہ بالخلط منفصل عنہ یوفی دینہ والا فلا زکاۃ الخ

مواقع التباس میں تحری کے نظائر بھی کتب فقہ میں ہیں، مگر اعلیٰ و افضل یہ ہے کہ اس طرح کا پورا مال صدقہ کر دے جیسا کہ ہمارے اکابر کا یہی طرز عمل رہا ہے۔

۵ ـــــ حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک دین کی تین قسمیں ہیں:

(۱) دین قوی (۲) دین وسط (۳) دین ضعیف۔

(۱) دین قوی وہ دین ہے جو مال زکوٰۃ (دراہم و دنانیر) یا اموال تجارت یا مال تجارت سے حاصل شدہ نقدی و نفع کے عوض میں واجب ہوا ہو۔

دین قوی کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ بقدر نصاب ہو، سال مکمل گزر چکا ہو۔ لیکن ادا تب کی جائے گی اسی وقت واجب ہوگی جب دین سے کم از کم چالیس درہم وصول ہو جائے، تب چالیس درہم سے ایک درہم بطور زکوٰۃ نکالے اور اگر چالیس درہم سے کم ہو تو زکوٰۃ نہیں نکالی جائے گی، لیکن بقدر نصاب حولان حول چالیس درہم کی شرط اسی وقت ہے جب دین کے علاوہ کوئی دوسرا مال زکوٰۃ نہ ہو اور اگر اس کے پاس اموال زکوٰۃ میں سے کوئی مال ہو تو اس میں تفصیل ہے وہ یہ کہ اگر اس کے پاس موجود مال زکوٰۃ بقدر نصاب ہے تو دین سے جتنی رقم بھی حاصل ہوگی خواہ قلیل ہو یا کثیر وہ نصاب سابق میں ضم کر دی جائے گی اور نصاب سابق کے ساتھ اس کی بھی زکوٰۃ واجب الادا ہوگی اور اگر مال بقدر نصاب نہ ہو مگر دین قوی سے حاصل شدہ رقم کو شامل کرنے کے بعد نصاب کامل ہو جائے تو دین قوی سے چالیس درہم یا اس کے بقدر وصول ہونے کے بعد ایک درہم بطور زکوٰۃ واجب الادا ہوگا اور جب سے نصاب کامل ہوا ہے اس وقت سے سال کی ابتدا ہوگی۔ (۱)

قرض جو اصطلاح شریعت میں دین ہے اور عرف عام میں قرض ہے اگر مقروض وسعت کے باوجود ادا نہ کر رہا ہو تو "مطل الغنی ظلم" کے تحت مجرم ہوگا، لیکن اس کی زکوٰۃ مقروض پر واجب نہیں بلکہ قرض خواہ پر واجب ہے بشرطیکہ اس کے ملنے کا یقین ہو اور اس کی ادائے گی کا وہی طریقہ ہے جو دین قوی کا ہے جس کی تفصیلات ابھی لکھی ہیں، چونکہ یہ دین قوی میں داخل ہے اور اگر نہ ملنے کا یقین ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے وہ مال جو سمندر میں گر کر ضائع ہو جائے۔ اور اگر یک مشت وصول ہو تو سنین ماضیہ

---

(۱) ردالمحتار ۲/۳۴

کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

"لو کان الدین علی مقر ملیٔ الی ان قال فوصل الی ملکه لزمه زکوٰة ما مضیٰ"[1]

(۲) دین وسط وہ دین ہے جو ایسے مال کے عوض میں واجب ہوا ہو اگر مالک کے پاس سال بھر رہ جائے تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، جیسے خدمت کے غلام، ثیاب بذلہ، مال خدمت کا غلہ۔

دین وسط کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن ادائے گی اس وقت واجب ہوگی جب دین سے دو سو درہم وصول ہو جائے، اگر اس سے کم وصول ہوا تو زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی، لیکن دو سو درہم وصول ہو جانے کی صورت میں سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی یہ حضرت امام ابوحنیفہ کی دو روایتوں میں سے روایت اصل ہے۔

دوسری روایت جو ابن سماعہ عن ابی حنیفہ ہے وہ یہ ہے کہ قبضہ کے بعد حولان حول شرط ہے یعنی دو سو درہم وصول ہونے کے بعد جب تک اس پر سال نہ گذر جائے اس میں زکوٰۃ واجب الاداء نہ ہوگی۔ دین وسط میں بھی وہی تفصیلات ہیں جو دین قوی کے تحت گذر چکی ہیں۔

حضرت امام ابوحنیفہ علیہ الرحمۃ کی دونوں روایتوں میں صحیح اور مفتیٰ بہ روایت ابن سماعہ ہے۔[2]

(۳) دین ضعیف: وہ دین ہے جو کسی چیز کے عوض میں واجب نہ ہوا ہو، اس کے دین ہونے میں اس کے کسی فعل کا دخل نہ ہو جیسے میراث یا اس کے فعل کو دخل ہو، جیسے وصیت یا ایسی چیز کے عوض میں واجب ہوا ہو جو مال نہ ہو جیسے دیت علی العاقلہ، مہر، بدل خلع، صلح عن دم العمد، بدل کتابت۔

دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ اس میں زکوٰۃ واجب ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔

(۱) دین سے حاصل شدہ رقم بقدر نصاب (دو سو درہم) ہو۔

(۲) قبضہ کے بعد اس پر سال گذر جائے جس کا حاصل یہ ہے کہ سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، یہ ساری تفصیلات حضرت امام ابوحنیفہ رح کے مسلک کے مطابق ہیں۔

---

(۱) درمختار ۲/۲۶ (۲) تحفة الفقهاء ۱/۲۹۳، رد المحتار ۲/۳۰

حضرت امام ابو یوسف و محمد رح کے نزدیک دیون کی صرف دو قسمیں ہیں۔

۱۔ دینِ مطلق۔ ۲۔ دینِ ناقص۔

دینِ ناقص، جیسے بدلِ کتابت، دیت علی العاقلہ۔ ان دونوں دیون کے علاوہ دوسرے دیون دینِ مطلق میں داخل ہیں۔

دینِ مطلق کا حکم ان حضرات کے نزدیک یہ ہے کہ جب تک دین وصول نہ ہو جائے اس کی زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، خواہ وصول یابی قلیل ہو یا کثیر، جتنی وصول ہوگی اتنے کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

اور دینِ ناقص میں وجوبِ زکوٰۃ کے لیے دو شرطیں ہیں،

(۱) حاصل شدہ رقم بقدرِ نصاب ہو۔ (۲) اس پر سال گذر جائے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ دینِ ناقص میں سنینِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں۔ دین کے مسئلہ کی ساری تفصیلات تحفۃ الفقہاء، علاء الدین سمرقندی اور درمختار و ردالمحتار سے ماخوذ ہیں۔ (۱)

۲۔ پراویڈنٹ فنڈ دو طرح کے ہیں:

۱۔ سرکاری ۲۔ پرائیویٹ۔

(۱) سرکاری پراویڈنٹ فنڈ دینِ ضعیف کے حکم میں ہے لہٰذا جو حکم دینِ ضعیف کا ہے وہی سرکاری پراویڈنٹ فنڈ کا ہے یعنی سنینِ ماضیہ کی زکوٰۃ واجب الاداء نہیں، البتہ وصولی کے بعد اگر وہ بقدرِ نصاب ہو اور سال گذر جائے تو اس رقم کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

(۲) پرائیویٹ کمپنیوں کا پراویڈنٹ فنڈ جو کہ مستقل ایک ایسی کمپنی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے جس میں ملازمین کا بھی ایک نمائندہ ہوتا ہے، وہ کمپنی ملازمین کی وکیل ہوتی ہے اس لیے کمپنی کا قبضہ ملازم کے قبضہ کے درجہ میں ہے اس طرح فنڈ کی رقم گویا کہ ملازم کی ملک ہوگی، اس لیے یہ دین نہیں کہلائے گا۔ اور اس پر سال بسال زکوٰۃ واجب ہوگی، اور اگر ہر سال زکوٰۃ نہیں ادا کی گئی تو وصولی کے بعد سنینِ ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

اور اگر پرائیویٹ کمپنیوں کا حال بھی سرکاری پراویڈنٹ فنڈ کی طرح ہو تب وہ حکم سرکاری فنڈ کا

---

(۱) تحفۃ الفقہاء، ۱/۲۹۲ ، ۲۹۳، ردالمحتار ۲/۳۰۵

ہے وہی حکم پرائیویٹ فنڈ کا بھی ہوگا۔ (۱)

نصاب کے اوصافِ اربعہ میں سے وصفِ ثانی نصاب کا نامی ہونا ہے، نماء کے لغوی معنی اضافہ وبڑھوتری کے ہیں اور اضافہ کبھی حقیقۃً ہوتا ہے، جیسے حیوانات میں توالد وتناسل کے ذریعہ اور دیگر اموال میں تجارت کے ذریعہ اور کبھی تقدیرًا ہوتا ہے، جیسے سونا چاندی اور سکۂ رائج الوقت، وجوبِ زکوٰۃ کے لیے مال کا نامی ہونا ضروری ہے خواہ حقیقۃً نامی ہو یا تقدیرًا لہذا ایسا مال جسے اپنے یا اپنے نائب کے پاس رکھ کر استثمار پر قادر نہ ہو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں۔ (۲)

نصاب کے اوصافِ اربعہ میں سے وصفِ ثالث نصاب کا حاجتِ اصلیہ سے فارغ ہونا ہے۔ حاجتِ اصلیہ کی تفسیر ابن ملک کے حوالے سے علامہ علاء الدین حصکفی اور صاحب مجمع الانہر نے یہ کی ہے:

• ایسی چیزیں جو انسان کو ہلاکت سے دور کرنے والی ہوں خواہ تحقیقاً جیسے اس کا اور اس کی بیوی اور بال بچوں کا نفقہ یعنی کھانا، خوراک، گرمی اور سردی سے بچنے کے لیے کپڑے، رہائشی مکان، گھریلو ساز وسامان، سواری کا جانور، خدمت کے لیے غلام، جنگی ساز وسامان، آلاتِ صنعت وحرفت اہل علم کے لیے کتابیں، چوں کہ اہل علم کے نزدیک جہالت باعث ہلاکت ہے یا تقدیرًا جیسے دین چوں کہ مدیون نے اگر موجود مال سے دین ادا نہیں کیا تو یہ دین اس کو جیل میں ڈلوا سکتا ہے جو ہلاکت کے درجہ میں ہے، لہذا اگر کسی کے پاس بقدر نصاب مال ہے، لیکن وہ مذکورہ بالا حوائج کی تکمیل میں مشغول ہو تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، چوں کہ وہ حاجتِ اصلیہ سے فارغ نہیں اور اگر بقدر نصاب یا اس سے زائد مال مذکورہ بالا اشیاء کی شکل میں موجود ہو تب بھی اس میں زکوٰۃ واجب نہیں، چوں کہ یہ چیزیں نامی نہیں ہیں، حتیٰ کہ وہ برتن جو گھر کی زینت کے لیے رکھے جاتے ہیں بشرطیکہ وہ سونے چاندی کے نہ ہوں اور ایسے ہی وہ آلات جن کی ذات سے نفع اٹھایا جاتا ہو اور اس کا اثر معمول میں باقی نہ رہتا ہو، اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں جیسے صابون اور اگر اس کا اثر معمول میں باقی رہے، جیسے کپڑا رنگنے کے لیے رنگ

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ و احسن الفتاویٰ (۲) مجمع الانہر ۱/۱۹۳

کمائی میں لگانے کے لیے نہیں بلکہ ذخیرہ ہو اگر یہ بقدر نصاب ہوں اور سال گذر جائے تو ان میں
زکوٰۃ واجب ہوگی، یہ تفصیلات مجمع الانہر، ہندیہ، شامی اور بدائع سے ماخوذ ہیں۔ (۱)

حضرات فقہاء کرام کی بیان کردہ جزئیات سے اتنی بات تو ظاہر ہے کہ حاجت اصلیہ کی کوئی ایسی تحدید نہیں جس میں کمی زیادتی کی گنجائش نہ ہو، بلکہ وسعت ہے، بہ لفظ حاجت اصلیہ کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے اس کے دائرے میں جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسیع کی گنجائش ہے، مثلاً کچے مکان کی جگہ پختہ مکان، ٹٹو کی جگہ پر نفیس سواری کے جانور کی جگہ پر موٹر سائیکل، جیپ کار، تیر کمان کی جگہ پر رائفل، بندوق وغیرہ، آلات صنعت و حرفت میں دست کاری کی جگہ مشینیں۔ اسی طرح ضروریات زندگی میں بڑے مکانات میں لفٹ، ٹیلیفون، کاروباری لوگوں کے لیے باکس، ریفریجریٹر (فریج)، کولر، موسم کے اعتبار سے بجلی کے پنکھے، الغرض اس طرح کی جدید چیزیں جو روزمرہ کی ضروریات زندگی میں داخل ہیں۔ اور جن کی اصل تصریحات فقہاء میں بنیادی حیثیت سے موجود ہیں، وہ سب حاجت اصلیہ میں داخل ہیں۔ البتہ ٹی وی، وی سی آر جیسی نمائش اور ناجائز چیزیں حاجت اصلیہ میں داخل نہیں۔ فلیتأمل۔

نصاب کے ادعائی ابحاث میں سے وصف رابع نصاب کا دین سے فارغ ہونا ہے۔ دین سے مراد ہر وہ دین ہے جس کا مطالبہ بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں ہی کا ہو جیسے قرض، ثمن مبیع، ضمان متلفات، زرقم کا تاوان، بدل خلع، بدل صلح عن دم العمد، نیز خواہ از قبیل نقود ہو یا مکیل و موزون یا از قبیل ثیاب اور حیوانات، نیز خواہ حال ہو یا موجل یعنی بالفعل اس کی ادائے گی ضروری ہو یا بعد زمان کچھ دنوں کی مہلت ہو، لہذا صداق زوجہ اگرچہ وہ موجل الی الطلاق یا الی الموت ہو، وہ بھی دین میں داخل ہے اور مانع وجوب زکوٰۃ ہے، یا وہ دین اللہ تعالیٰ کا ہو جیسے دین زکوٰۃ اور ہر وہ دین جس کا مطالبہ بندہ نہ ہو جیسے دین نذر، کفارات، صدقۃ الفطر، وجوب حج، یہ دین میں داخل نہیں یعنی مانع وجوب زکوٰۃ نہیں۔

"والمراد دين له مطالب من جهة العباد سواء كان الدين لهم أو لله تعالى، وسواء كانت المطالبة بالفعل أو بعد زمان فيتناول الدين المؤجل وليدخل صداق زوجته المؤجل إلى الطلاق أو الموت" (۲)

---

(۱) مجمع الانہر ۱۹۲/۱، بدائع ۶/۲، فتاویٰ ہندیہ ۱۷۲/۱ (۲) مجمع الانہر ۱۹۳/۱

" سواء كان الدين للعباد كالقرض وثمن المبيع وضمان المتلفات وارش الجراحة و سواء كان الدين من النقود او المكيل او الموزون او الثياب او الحيوان وجب بخلع او صلح عن دم عمد وهو حال أو موجل او لله تعالى كدين الزكوٰة " (۱)

وكل دين لا مطالب له من جهة العباد...... لا يمنع كذا في المحيط السرخسي " (۲)

دیون مذکورہ بالا میں جو مال مشغول ہو وہ معدوم کے درجہ میں ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

" لان المشغول بها كالمعدوم " (۳)

اور دیگر حضرات فقہاء کے نزدیک عدم وجوب زکوٰۃ کی علت اس مال کا حوائج اصلیہ کی تکمیل میں مشغول ہونا ہے اور جو مال حوائج اصلیہ میں مشغول ہو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

" وقد علّلوا سقوط الزكوٰة بالدين بان المديون محتاج إلى هذا المال حاجة اصلية لان قضاء الدين من الحوائج الاصلية والمال المحتاج إليه حاجة اصلية لا يكون مال الزكوٰة، تأمل " (۴)

لیکن وہی دین مانع وجوب زکوٰۃ ہے جو وجوب زکوٰۃ سے پہلے کا ہو، اگر مال بقدر نصاب ہو اور حولان حول ہو گیا اس کے بعد یہ مقروض ہو گیا تو یہ قرض مانع نہیں بلکہ زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

" وهذا اذا كان الدين في ذمته قبل وجوب الزكوٰة فلو لحقه بعده لم تسقط الزكوٰة لانها تثبت في ذمته فلا يسقطها اللحق من الدين بعد ثبوتها " (۵)

چونکہ دین عبد لاحق ہے اور دین زکوٰۃ سابق ہے اور لاحق سابق کو ساقط نہیں کر سکتا، فقہاء کرام کی تصریحات میں یہ بات بھی آچکی ہے کہ دین بالفعل واجب الاداء ہو یا بعد زمان یعنی دین طویل المدت

---

(۱) هندیه ۱/۱۷۳ (۲) ایضاً (۳) مکتب الانهر ۱/۱۹۳ (۴) رد المحتار ۲/۲۶۱

(۵) جوهره، رد المحتار ۲/۲۶۰

ہو، دونوں طرح کے دیون مانع وجوبِ زکوٰۃ ہیں، لہٰذا مروج طویل الاجل دیون خواہ زراعتی ہوں یا تعمیراتی، جن کی ادائیگی کے لیے پانچ سال سے لے کر چالیس سال تک کی مدت مقرر کی جاتی ہے وہ بھی دین میں داخل ہیں اور مانع وجوب زکوٰۃ ہیں، پورے دین کو بھی اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جاسکتا ہے اور اس کی نظیر مہر ہے جو مؤجل الی الطلاق یا الی الموت ہو، نیز تصریح ہے بالفعل یا بعد زمان، البتہ احوط یہ ہے کہ صرف سالانہ واجب الأدا قسط وضع کر کے باقی اموال زکوٰۃ کی زکوٰۃ ادا کر دی جائے، یہ خیال کر کے گویا کہ اس سال واجب الأدا دین صرف یہی ہے اور باقی مال میرا ہے لیکن یہ تقویٰ ہے۔ اگر کسی نے عمل کر لیا تو ان شاء اللہ ماجور ہوگا۔

کمپنیز پر زکوٰۃ

کمپنی کے شرکاء نے اگر کمپنی کو ادائے زکوٰۃ کا وکیل بنا دیا ہو تو کمپنی پر زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، البتہ اگر اثاثے از قبیل آلات (مشینری) ہیں تو وہ مال زکوٰۃ میں شمار نہ ہوں گے، چوں کہ آلاتِ صنعت کا استثناء حضراتِ فقہاء نے کیا ہے اور اگر اثاثے از قبیل آلات نہ ہوں تو مال زکوٰۃ میں اس کو بھی شمار کیا جائے گا، اور اگر شرکاء نے کمپنی کو ادائے زکوٰۃ کا وکیل نہ بنایا ہو تو ہر حصہ دار اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرے، جس حصہ دار کا حصہ بقدر نصاب ہو یا دوسرے اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر وہ بقدر نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ واجب الادا ہوگی، اور جس حصہ دار کا حصہ بقدر نصاب نہ ہو اور نہ ہی دوسرے اموال زکوٰۃ اس کے پاس ہوں تو اس پر زکوٰۃ فرض نہ ہوگی۔ (۱)

ہیرے جواہرات

ہیرے اور جواہرات اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو بالاتفاق اس میں زکوٰۃ نہیں، چاہے جواہرات کی قیمت جتنی بھی ہو، لہٰذا جو لوگ انکم ٹیکس یا دیگر قوانین سے بچنے کے لیے اپنے سرمائے کو ہیرے و جواہرات کی شکل میں محفوظ کر دیتے ہیں اگر ان کے پاس ہیرے و جواہرات کے علاوہ دیگر اموال زکوٰۃ نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ فرض نہیں، اسی طرح خواتین کے پاس اگر ہیرے جواہرات ہوں خواہ تزئین کے لیے ہوں یا تمول کے لیے

---

(۱) فتاویٰ محمودیہ ۱۵/ ۲۰۰

بشرطیکہ تجارت کے لیے نہ ہوں ان پر بھی زکوٰۃ فرض نہیں، چوں کہ ہیرے جواہرات از قبیل احجار ہیں اور احجار میں مجوہن (ذہب وفضہ) کے علاوہ میں زکوٰۃ نہیں، چوں کہ ذہب وفضہ کو ثمن خلقی (ثمن مطلق) کی حیثیت حاصل ہے اور ان کے علاوہ باقی از قبیل عروض وسلع ہیں، ہیرے جواہرات بھی از قبیل عروض ہیں اور عروض میں زکوٰۃ نیت تجارت ہی سے واجب ہوتی ہے اس لیے جب تک نیت تجارت نہ ہو ہیرے وجواہرات میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"لا زكوة في اللآلي والجواهر ولو ساوت الفا اتفاقا الا أن تكون للتجارة والاصل ان ما عدا الحجرين والسوائم انما يزكي بنية التجارة" (۱)

"وما عدا ما ذكر كالجواهر والعقارات والمواشي العلوفة والعبيد والثياب والامتعة ونحو ذلك من العروض (۲) ـــــــ وان كانت حليا"

لیکن اگر کوئی ہیرے جواہرات کی بھی زکوٰۃ ادا کردے تو تقویٰ ہے وہ ماجور ہوگا، البتہ شرعاً واجب نہیں۔

آراضی کی زکوٰۃ

سونا چاندی کے علاوہ باقی چیزیں عروض میں داخل ہیں اور عروض کے مال زکوٰۃ بننے کے لیے نیت تجارت شرط ہے لہٰذا اگر کوئی شخص زمین بہ نیت تجارت خریدے تو اس کا بھی شمار اموال زکوٰۃ میں ہوگا اور حولانِ حول کے وقت اس کی جو قیمت مارکیٹ میں ہوگی اسی میں زکوٰۃ فرض ہوگی، قیمت خرید کا اعتبار نہیں۔

"وتعتبر القيمة عند حولان الحول الخ" (۳)

لیکن اگر کسی نے زمین رہائش کے لیے خریدی پھر تجارت کی نیت ہوگئی یا تجارت کے لیے خریدی پھر رہائش کی نیت ہوگئی تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی یا نہیں اس کی تفصیل درمختار میں موجود ہے۔ (۴)

اموال زکوٰۃ میں کون سی قیمت معتبر ہے؟

اموال زکوٰۃ میں حضرات فقہاء انفع للفقراء کی رعایت کرتے ہیں، چنانچہ بکثرت ایسی جزئیات میں

---

(۱) درمختار ۲/۳۰۰ (۲) شامی ۲/۲۷۳، الفتاوی الہندیۃ ۱/۱۸۰ (۳) ہندیہ ۱/۱۷۹ (۴) ۲/۲۷۳

جن میں اس کی تصریح ہے۔ تقویم بالدراہم والدنانیر میں بھی اسی کلیہ کی رعایت کی گئی ہے۔

"انظر هنا للفقراء وشاتها خمسة و رواية كتاب الزكوة عليها انا كان لا يتفاوت النفع في حق الفقراء بالتقويم بايهما كان

ثم ان المعتبر عند محمد الانفع للفقير من النقدين والقيمة وعنده

النقدين"[1]

اس لیے مال کی قیمت لگاتے وقت اس پہلو کی رعایت تاجر حضرات کے ذہن میں رہنی چاہیے ان کو دیکھنا چاہیے کہ تھوک میں فقراء کا زیادہ نفع ہے یا پھٹکر کی قیمت لگانے میں جس میں فقراء کا زیادہ نفع ہو وہ قیمت لگائیں لیکن بعض دکانیں تھوک ہی کی ہوتی ہیں وہاں پھٹکر سامان نہیں ملتا اس صورت میں پھٹکر دکان دار پھٹکر کی قیمت لگائیں اور قیمت کی تعیین لاگت سے نہیں بلکہ حولان حول کے وقت اس کی جو قیمت ہوگی وہی معتبر ہوگی۔

"الزكوة واجبة في عروض التجارة كائنة ما كانت اذا بلغت قيمتها نصابا من الورق والذهب كذا في الهداية ويقوم بالمضروبة كذا في التبيين وتعتبر القيمة عند حولان الحول"[2]

البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یوم الوجوب کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا یا یوم الاداء کی قیمت کا۔ حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ کے نزدیک یوم الوجوب کی قیمت معتبر ہے اور حضرات صاحبین کے نزدیک یوم الاداء کی قیمت معتبر ہے نیز اس شہر کی قیمت کا اعتبار کیا جائے گا جس شہر میں مال ہے، میدان کا اعتبار نہیں۔

"وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء .... ويقوم في البلد الذي المال فيه"[3]

تشریح نمبر

تجارتی زکوٰۃ کا وجوب بشرطیکہ وہ خود بقدر نصاب ہوں یا دیگر اموال زکوٰۃ کے ساتھ مل کر بقدر نصاب ہو جائیں اور اصل پونجی میں زکوٰۃ اس وقت فرض ہوگی جب کہ پونجی نے اس کو کسی چیز میں لگا رکھا ہو مثلاً

۱۔ [illegible]

لوہا، سیمنٹ، سامانِ الکٹرک، ریشم وغیرہ، اور اگر کمپنی نے اس کو آلات میں لگا رکھا ہے مثلاً نقل وحمل کے لیے ٹرک یا بس وغیرہ، تب اصل پونجی میں زکوٰۃ فرض نہ ہوگی چوں کہ آلاتِ صنعت کو حضراتِ فقہاء نے مستثنیٰ قرار دیا ہے، چوں کہ سکہ رائج الوقت ثمن خلقی کے حکم میں ہے اور ثمن مطلق میں بتقدیر اقرب نمو کی وجہ سے مطلقاً زکوٰۃ فرض ہے خواہ تجارت میں وہ لگایا جائے یا نہ لگایا جائے اور صورتِ مسئولہ میں یہ ثمن مطلق تجارت میں مشغول ہے اس لیے اس میں زکوٰۃ ہے۔

"غیر ان الاثمان خلقت فی الاصل للتجارۃ فلا تحتاج الی تعیین العباد للتجارۃ بالنیۃ فتجب الزکوٰۃ فیہا وان لم ینو للتجارۃ او امسک للنفقۃ الخ" (۱)

حولانِ حول کے وقت شیئرز کی جو قیمت ہوگی اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

"وتعتبر القیمۃ عند حولان الحول" (۲)

بونڈ

پرائز بونڈ ہو یا بونڈ سرٹیفکٹ، فکس ڈپوزٹ ہو یا انشورنس یہ سب سود پر مشتمل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں، اس طرح رقم کو محفوظ کر دینا روحِ شریعت کے خلاف ہے۔

فقہی سیمینار عوام کو اس پر متنبہ کرے، بونڈس پر جو سرمایہ لگایا گیا ہے اصل رقم پر زکوٰۃ فرض ہے، البتہ منافع حرام ہونے کی وجہ سے واجب التصدق ہیں، بونڈ جب کیش ہوگا اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی۔

"لو کان الدین علی مقر ملئ أو علی معسر أو مفلس الی أن قال فوصل الی ملکہ لزم زکوٰۃ ما مضی الخ" (۳)

---

(۱) تحفۃ الفقہاء ۱/۲۹۲

(۲) عالمگیری ۱/۱۷۹

(۳) درمختار ۲/۶۶

خلاصۂ جوابات

۱ــــــ ملک تام سے مراد ملک ید (قبضہ) ہے۔

۲ــــــ مالِ مُشتری قبل القبض پر زکوٰۃ واجب نہیں، البتہ علامہ سرخسیؒ کی عبارت قابلِ غور ہے۔

۳ــــــ ڈپوزٹ کی زکوٰۃ نہ کرایہ دار پر واجب ہے نہ مالکِ مکان پر، وصولی کے بعد دونوں احتمال ہے وجوب وعدم وجوب۔

۴ــــــ مدارس واداروں میں جمع ہونے والی رقم پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

۵ــــــ مالِ حرام میں زکوٰۃ واجب نہیں۔

۶ــــــ مالِ قرض میں مقروض پر زکوٰۃ نہیں، قرض خواہ پر زکوٰۃ ہے، وصولی کے بعد سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ ادا کرنی ہوگی۔

۷ــــــ پراویڈنٹ فنڈ پر زکوٰۃ ہے، سنین ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں، آئندہ سال گذرنے پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

۸ــــــ نامی سے مراد بڑھنے والا مال ہے خواہ وہ حقیقۃً نامی ہو یا تقدیراً۔

۹ــــــ حاجتِ اصلیہ سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو انسان سے ہلاکت کو دور کرنے والی ہوں خواہ حقیقۃً دافع ہوں یا تقدیراً۔

۱۰ــــــ حاجت اور اصلی کے مفہوم کو باقی رکھتے ہوئے جائز حد تک نمائش سے بچتے ہوئے توسع کی گنجائش ہے، البتہ ٹی وی، وی سی آر جیسی فحش ومنکر چیزیں حاجتِ اصلیہ میں داخل نہیں۔

۱۱ــــــ دین سے مراد وہ دین ہے جس کا مُطالِب بندہ ہو، خواہ وہ دین بندوں کا ہو یا اللہ تعالیٰ کا۔

۱۲ــــــ طویل الأجل دین خواہ زراعتی ہو یا تعمیراتی، دین میں داخل ہے، لہٰذا نصاب سے یہ بھی مستثنیٰ ہوگا۔

۱۳ــــــ اگر کمپنی ادائے زکوٰۃ کی وکیل ہو تو مجموعی مالیت معتبر ہوگی، ورنہ ہر فرد اپنے حصے کی زکوٰۃ ادا کرے۔

۱۴ــــــ ہیرے جواہرات اگر تجارت کے لیے نہ ہوں تو زکوٰۃ واجب نہیں، خواہ اس کی کتنی ہی مالیت ہو، مرد کے پاس ہو یا عورت کے پاس، تمول کے لیے ہوں یا تزین کے لیے۔

۱۵ــــــ سامانِ تجارت کی قیمت حولانِ حول کے وقت کی معتبر ہے، جس نوع کی دکان ہو اس کی نوعیت تقویم میں معتبر ہوگی۔ انفع للفقراء کی بھی رعایت کی جائے گی۔

۱۶ــــــ اراضی اگر بہ نیت تجارت خریدی گئی ہوں تو زکوٰۃ واجب ہے اور حولانِ حول کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔

۱۷ــــــ شیئرز میں منافع اور اصل پونجی دونوں پر زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ پونجی آلاتِ صنعت میں نہ لگی ہو، حولانِ حول کے وقت کی قیمت معتبر ہوگی۔

۱۸ــــــ بونڈس میں لگائی گئی رقم پر زکوٰۃ واجب ہے، نفع واجب التصدق ہے۔ بونڈس جب کیش ہو اس وقت زکوٰۃ فرض ہوگی، اور سنین ماضیہ کی بھی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

سوال نامہ کا جواب

از: ——— مولانا سلیمان بلند شہری، ہریانہ

زکوٰۃ کس قسم کے اموال میں واجب ہے؟

(۱) قبضہ نہ ہونے کی وجہ سے ملک ناتمام رہی اور ملک ناتمام ہونے کی صورت میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی، البتہ جو رقم [illegible] کی قیمت میں بطور پیشگی دی گئی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"المراد بالتام المملوک رقبۃ ویداً" (۱)

(۲) کرایہ دار پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ یہ ڈپوزٹ صاحب مکان کے ذمہ کرایہ دار کو واپس لوٹا دینا واجب ہے اور کرایہ دار کی ملک ہے جو کہ از قسم دین ہے اور ظاہر ہے کہ زکوٰۃ دین والے پر ہے نہ کہ مدیون پر۔

(۳) ان پر کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔

"وسببہ ای سبب افتراضہا ملک نصاب حولی قولہ ملک نصاب فلا زکوٰۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلۃ لعدم الملک" (۲)

(۴) اس میں کوئی زکوٰۃ واجب نہیں۔ لعدم الملک۔

---

(۱) شامی ۲/۵ (۲) ردالمحتار، کتاب الزکوٰۃ ۲/۹

ہاں البتہ اگر اس مال حرام میں حلال مال اس طرح مخلوط ہوگیا کہ ان میں باہم تمیز مشکل ہے تو اس صورت میں امام اعظمؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہے بشرطیکہ حلال مال مخلوط حرام مال سے بقدر نصاب زائد ہو۔

" ودخل ما ملك بسبب خبيث كمغصوب خلطه اذا كان له غيره منفصل عنه يوفي دينه (قوله دخل) اى في ملك النصاب المذكور نخ۔ (وقوله ما ملك بسبب خبيث) .... والمراد بالغير ما تجب فيه الزكوٰة " كذا في الشامي۔ (۲/۲)۔

(۵) دین کی زکوٰۃ دائن پر واجب ہوتی ہے نہ کہ مدیون پر۔

کل دیون جن کا مدیون اقراری ہو تین قسم ہے۔

(۱) دین ضعیف (۲) دین قوی (۳) دین متوسط۔

دین ضعیف: ہر وہ قرض ہے جس کا دائن بغیر اپنی کوشش اور بغیر کسی چیز کے بدلے مالک ہوا ہو، جیسے میراث کہ یہ بدل مال نہیں۔ یا اپنی کوشش سے تو مال حاصل ہوا مگر بغیر بدلے کے جیسے وصیت یا اپنی کوشش اور بدلے میں مال حاصل ہوا مگر بدل مال نہیں، جیسے مہر، بدل خلع، بدل صلح۔ اس قسم دین میں امام اعظمؒ کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں۔

دین متوسط: جو ایسے مال کے بدلے حاصل ہو جو مال تجارت نہ ہو، جیسے خدمت کے غلاموں کی قیمت اور عام استعمال کے کپڑے۔ بقدر نصاب حاصل ہونے پر گزشتہ ایام کی زکوٰۃ لازم ہے۔

دین قوی: وہ قرض ہے جو مال تجارت کے بدلے میں ہو، اس قرض کے نصاب زکوٰۃ کا پانچواں حصہ وصول ہونے پر ایام گزشتہ کی زکوٰۃ ادا کرنی لازم ہے۔

" قال في الفتاوى الهندية (۱): اما سائر الديون المقربها فهي على ثلث مراتب عند ابي حنيفة رحمه الله تعالى ضعيف وهو كل دين ملكه بغير فعله لا بدلاً عن شئ نحو الميراث او بفعله لا بدلاً عن شئ كالوصية او بفعله بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل

---

(۱) الفتاوى الهندية ۱/۵

الخلع وبدل الصلح عن دم العمد والدية وبدل الكتابة لا زكاة فيه عنده حتى يقبض نصابا ويحول عليه الحول.

ووسط: ما يجب بدلا عن مال ليس للتجارة كعبيد الخدمة وثياب البذلة إذا قبض مائتين زكى لما مضى في رواية الأصل.

وقوي: وهو ما يجب بدلا عن سلعة التجارة إذا قبض أربعين زكى لما مضى كذا في الزاهدي۔

(۱۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم دین ضعیف کی فہرست میں آتی ہیں لہٰذا ان رقوم میں زکوٰۃ کا لزوم نہیں آتا جب تک قدر نصاب پر قبضہ نہ ہو اور حولان حول نہ ہو۔

دوسری شرط۔

حاجت اصلیہ

حاجت اصلیہ کا تعین ہر دور اور ماحول میں اس کے اعتبار سے ہوگا۔

"ولیس في دور السكنى وثياب البدن وأثاث المنزل ودواب الركوب وعبيد الخدمة وسلاح الاستعمال زكاة لأنها مشغولة بحاجته الأصلية. كذا في الشامي ۲/۶"

دین سے محفوظ ہونا

کون سا دین مانع زکوٰۃ ہے۔ دین کی قسمیں اور اس کے احکام۔

سوال میں پیش کردہ صورتوں میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اموال زکوٰۃ سے پورے قرض کو منہا نہیں کیا جائے گا، بلکہ سالانہ واجب الادا اقساط وضع کر کے باقی اموال پر زکوٰۃ لازم قرار دی جائے گی۔

شامی[۱] میں مرقوم ہے:

"(قوله أو مؤجلا) .... والصحيح أنه غير مانع"

---

(۱) شامی ۶/۲

کمپنیز پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی مالیت کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ کمپنی کے ہر شریک کے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا یعنی اگر ہر شریک کا اپنا حصہ بقدر نصاب کو پہونچا ہوا ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، مثلاً کمپنی کے دس شرکاء ہیں اور ان دس شرکاء میں سے دو شریکوں کے حصہ کی مقدار صرف تین تین ہزار ہے تو ان تین تین ہزار روپیہ والے حصہ داروں پر زکوٰۃ لازم نہ ہوگی اور جن کے حصے بقدر نصاب ہیں ان کے ذمہ زکوٰۃ لازم و واجب ہوگی۔

کما فی الدر المختار[۱] فان بلغ نصیب احد هما نصابا زکاہ دون الآخر

ہیرے اور جواہرات

جو لوگ انکم ٹیکس اور سرکاری قوانین کی زد سے بچنے کے لیے نقد روپیہ یا سونے چاندی کی صورت میں محفوظ کرنے کی بجائے لاکھوں روپوں کے ہیرے جواہرات خرید کر کے محفوظ کر دیتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ ہیرے جواہرات حاجت اصلیہ میں داخل نہیں ہیں اور بڑی مالیت (جو کم از کم بقدر نصاب ضرور ہوتی ہے) چنانچہ اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"قال فی الشامی[۲]: فی السطر التاسع رعی هذه ما لو اعطی ذالك من الحلی و الاوانی والامتعة التی يقصد بها الزينة اذا بلغ نصابا نصيبه غنية"

اور بسا اوقات خواتین محض زینت اور آرائش کے لیے ہیرے جواہرات استعمال کرتی ہیں ان کا مقصد تمول نہیں ہوتا، ایسے ہیرے جواہرات پر زکوٰۃ کے وجوب کے بارے میں فقہاء میں اختلاف ہے اور صحیح تر بات یہ ہے کہ ان ہیرے جواہرات میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ شامی میں مرقوم ہے:

"لا زکوٰۃ فی اللآلی والجواهر وان ساوت الفا اتفاقا الا ان تكون للتجارة"[۳]

---

(۱) درمختار ۲/۳۰۲ (۲) شامی ۲/۱۸ (۳) ایضاً ۲/۱۸

اموال تجارت پر زکوٰۃ

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی "امداد الفتاویٰ"[1] میں رقم طراز ہیں اور حضرت والا کی یہ تحریر بعینہٖ سوال نامہ کے سوال کا جواب ہے۔

تحریر ہے۔ ہے:

" اس تاجر کو اپنے مال تجارت کی زکوٰۃ دیتے وقت اس مال تجارت کی قیمت عام نرخ سے لگانی ہوگی، یعنی بیچنے کا نرخ لگانا ہوگا۔"

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

سوال میں تحریر کردہ عبارت سے واضح ہے کہ بونڈس درحقیقت مقروض کی جانب سے قرض خواہ کے پاس ایک سند ہے جو اس بات کی شہادت ہے کہ مقروض اتنے قرض کا اقراری ہے اور جس قرض کا مقروض اقراری ہو، نیز وہ قرض بعوض مال تجارت ہو یا بعوض سونا چاندی ہو تو وہ قرض قوی کہلاتا ہے جس کا حکم یہ ہے کہ اس قرض قوی کی گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ دینا قرض خواہ کے ذمہ واجب ہے، مگر ادائیگی بوقت وصولیابی لازم ہوگی، اور چالیس درہم سے کم کی وصولیابی پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، لہٰذا وجوب ادا کے لیے کم از کم چالیس درہم پر قبضہ ہونا چاہیے۔ الغرض جتنا وصول ہوتا جائے گا اس کی زکوٰۃ ایام ماضیہ بھی دینی ہوگی۔

اس فقہی اصول سے معلوم ہوا کہ بونڈس کے کیش کرانے سے قبل اس کی زکوٰۃ ادا کرنا واجب نہیں ہے، جس وقت بونڈس کو کیش کرایا جائے گا اس وقت اس کی تمام سالہائے ماضیہ کی زکوٰۃ نیز سال رواں کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

شامی میں ہے:[2]

" (قوله عند قبض اربعین درهمًا) قال فی المحیط لان الزکوٰة

---

(۱) امداد الفتاویٰ ۲/۴۲ (۲) شامی ۲/۳۸، مکتبہ رشیدیہ، پاکستان

(۱) لا تجب فی کسور من النصاب الثانی عنده مالم یبلغ اربعین للحرج فکذلک لا یجب الاداء مالم یبلغ اربعین للحرج ذکر فی المنتقی: رجل له ثلاث مأة درهم دین وحال علیها ثلاثة احوال فقبض مأتی (درهما) فعند ابی حنیفة رح یزکی للسنة الاولیٰ خمسةً وللثانیة والثالثة اربعة اربعة من مأة وستین ولا شئ علیها فی الفضل۔

نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب میں چاندی کا نصاب اصل ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس سونا اور چاندی دونوں ہیں تو اس کے حق میں اخذ زکوٰۃ کی حرمت وحلت کا مدار چاندی کا بقدر دو سو درہم ہونا معتبر ہوگا۔ یعنی سونے اور چاندی دونوں کی قیمت مل کر اگر دو سو درہم چاندی کی قیمت کو پہونچ گئی تو یہ شخص مذکور صاحب نصاب (غنی شرعی) محسوب ہوگا، اور اس کے حق میں اخذ زکوٰۃ حرام ہوگی، ورنہ نہیں۔

البحر الرائق[1] میں مرقوم ہے:

" وتضم قیمة العروض الی الثمنین والذهب الی الفضة .... حتی ان من کان له مأة درهم وخمسة مثاقیل ذهب قیمتها مأة درهم فعلیه الزکوٰة عنده "

مصارف زکوٰۃ

(۱) ملحوظ خاطر رہے کہ ادائیگی زکوٰۃ کے لیے شرط فقیر شرعی کا مالکانہ قبضہ ہے، صورت مذکورہ فی السوال میں مفقود ہے کہ مال زکوٰۃ پر نہ فقیر شرعی کا قبضہ ہوا اور نہ اس کے وکیل کا۔

اور اگر یہ شبہ ہو کہ فقیر شرعی (طالب علم) نے اہل مدرسہ اپنا چیک سپرد کردیا تو گویا ان کو اپنا وکیل

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۳۲

بالقبض بنا دیا، تو موجب اس شبہ کا یہ ہے کہ اس فقیر شرعی کا قبضہ اصالۃً یا وکالۃً ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اول وہ مال اہل مدرسہ کے قبضہ سے خالی ہو، و بعد ازاں اس مال زکوٰۃ پر فقیر شرعی کا قبضہ اصالۃً یا وکالۃً ہو، کہ قبضہ ثانی (فقیر شرعی کا قبضہ) کے لیے قبضہ اول (مزکی کا قبضہ) کا ختم ہونا شرط ہے، اور وہ یہاں مذکورہ صورت میں مفقود ہے کہ ابھی وہ مال اہل مدرسہ کے قبضہ میں ہے۔

چنانچہ سوال میں ذکر کی گئی صورت درست نہیں ہے۔

اور یہ صورت بعینہٖ ایسی ہے جیسے مثلاً زید پر بکر کا ایک ہزار روپیہ قرض چاہیے اور بکر اپنی زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے زید کا ہزار روپیہ پر قبضہ کرائے بغیر اس روپیہ زکوٰۃ کو اپنے پاس رکھے اور ادائے زکوٰۃ کی نیت کر لے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں بکر کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

در مختار میں ہے: [۱]

"(هي تمليك) خرج الاباحة فلو اطعم يتيما ناويا الزكاة لم يجزيه الا اذا دفع اليه المطعوم (قوله الا اذا دفع اليه المطعوم) لانه بالدفع اليه بنيته يملكه فيصير آكلا من ملكه الخ"

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی علیہ الرحمۃ امداد الفتاویٰ میں اور حضرت مولانا عزیز الرحمٰن عثمانی صاحب علیہ الرحمۃ مفتی اول دارالعلوم دیوبند فتاویٰ دارالعلوم میں رقم طراز ہیں کہ مہتمم مدرسہ زکوٰۃ دہندگان کا وکیل ہوتا ہے اور مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہوتا۔

سوال دوم میں ذکر کی گئی دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔

(الف) زکوٰۃ کے ساتویں مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق راقم الحروف کے نزدیک غازی اور مجاہد ہے۔

(ب) صاحب بدائع نے فرمایا ہے کہ ہر وہ شخص جو کوئی نیک کام یا عبادت کرنا چاہتا ہو اور اس شخص کو اس کام کی انجام دہی میں مال کی ضرورت ہو تو وہ شخص بھی فی سبیل اللہ میں داخل ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا مال نہ ہو کہ اس مال سے اس کام کو انجام دے سکے، مثلاً دینی تعلیم اور علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت۔

---

(۱) در مختار علی ہامش رد المحتار ۲/۲

یعنی فی سبیل اللہ کے مفہوم میں وسعت پیدا کرتے وقت یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ ان امور اسلامیہ کو انجام دینے والے حضرات اسی وقت مستحق زکوٰۃ ہوں گے جب کہ وہ فقیر شرعی ہوں۔

شیخ ابن ہمام رح نے بھی یہ بات فتح القدیر میں کہی ہے۔

(۵) مصارف زکوٰۃ کو قیاس شرعی کا محل قرار دے کر آٹھ مصارف کے علاوہ کچھ دوسری قسموں کو مصارف زکوٰۃ سے ملحق کرنے پر فقر کا خاص لحاظ رکھا جائے گا۔

اس شرط کو مد نظر رکھتے ہوئے جہاد فکری اور اس کی دوسری اقسام میں صرف زکوٰۃ کی جا سکتی ہے جب کہ مستحقین زکوٰۃ کا اس مال زکوٰۃ پر مالکانہ قبضہ ہو، اگر مالکانہ قبضہ نہ ہوا تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ اور آیت "انما .... میں حصر راقم الحروف کے خیال میں حصر حقیقی ہے حصر اضافی نہیں۔

اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رح نے آیت میں حصر کو جو حصر اضافی بیان کیا ہے وہ بہ نسبت طلب منافقین کے ہے۔

نیز حضرت شاہ صاحب نے جو دلیل حصر اضافی کی بیان فرمائی ہے وہ کوئی قوی دلیل نہیں ہے۔

مزید برآں جملہ فقہا مجتہدین جب مصارف زکوٰۃ کو ان ہی آٹھ اصناف میں محصور فرماتے ہیں تو ان کے علاوہ دوسرے حضرات کی بات کہاں قابل قبول ہو سکتی ہے۔

(۶) ہر امر میں تو قوت دلیل ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ اگر اس قوت دلیل ہی سے صرف نظر کر لی جائے تو پھر قابل اعتبار کیا چیز رہے گی، کسی چیز کا معیار اعتبار باقی نہ رہنے پر ستم وسعت ہی لا پتہ ہو جائے گی۔ چنانچہ مجتہدین کی طے کی ہوئی راہ کو حالات سے متاثر ہو کر ترک کر دینا اپنے کو بے راہ روی میں مبتلا کرنا ہے۔

بنابر ہذا راقم الحروف کے خیال میں فی سبیل اللہ کے مفہوم میں اتنی وسعت کی گنجائش نہیں کہ اس وسعت کی وجہ سے ہم جیسے لوگ مجتہد فی الشرع تک کا ساتھ چھوڑ دیں۔

واللہ تعالیٰ اعلم وعلمہ اتم

زکوٰۃ کے متعلق سوالات کے جوابات

از ـــــــــــ مولانا افضال الحق ـ مہتمم دارالعلوم گورکھپور

ا ـــــ زکوٰۃ کے چند مسلمہ اصول ہیں انہیں مستحضر رکھیے تو تمام سوالات حل ہو جائیں گے ۔

اصول ـــــ زکوٰۃ ہر اس مسلمان آدمی پر فرض ہے جو مالک نصاب ہو .... وغیرہ ۔

اصول ـــــ زکوٰۃ کے لیے نصاب کی ملکیت اور قبضہ دونوں لازم ہیں دونوں کا نام ہے ملکیت تامہ ۔

اصول ـــــ مویشی کی زکوٰۃ کا نصاب تین طرح ہے ۱؎ اگر پالتو ہیں تو ان کی تعداد پر ہے ۲؎ اگر تجارت کے لیے ہیں تو ان کی سال ادائے گی کی مارکیٹ رٹ پر ہے ۳؎ اگر ان کے دودھ، انڈے، بال کی تجارت مقصود ہے تو ان چیزوں کی مارکیٹ قیمت پر ہے ۔

اصول ـــــ زمین، مکان یا جائداد کی تجارت کرنے والے پر زکوٰۃ ان کی قیمت پر ہے کہ جس دن سال پورا ہوا اس روز کل مالیت کیا تھی ۔

اصول ـــــ آلات تجارت یا زراعت یا معاش پر زکوٰۃ نہیں اس کی پیداوار پر ہوگی، اور پیداوار پر موسم زمین کی نوعیت اور حکومت کی حیثیت کے مطابق ہوگی ۔

اصول ـــــ اس حکومت کا مالی نظام سود پر ہی چل رہا ہے، جب کہ شریعت سود کو ہر طرح حرام قرار دیتی ہے؛ اس لیے جب دونوں قانون ٹکرائیں تو بھی شریعت کے مطابق زندگی گزارنی چاہیے، الّا یہ کہ کوئی شدید خطرہ ہو تو حتی القدور سود سے پرہیز کرنا چاہیے ۔

ان اصولوں کی روشنی میں آپ کے سوالوں کے جوابات عرض ہیں :

سوال ۱ - زکوٰۃ شیرز کی قیمت پر ہے یا اس کی آمدنی پر؟

جواب • حصص کی خریداری کے لیے آپ نے پانچ ہزار کی رقم جو کمپنی کو دی ہے وہ رقم آپ کی ملک ہے مگر قبضہ کمپنی کا ہے اس لیے ملک تام کے بغیر اس پر زکوٰۃ ابھی واجب نہیں ہے۔

• اس رقم کا جو اس پر آپ کو ملی ہے وہ رقم نہیں ہے بلکہ شیر ہے، جو رقم دلا سکتی ہے۔ اس لیے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

• حصص اگر فرد تجارتی سامان بن جائیں تو بھی زکوٰۃ اس رقم پر آئے گی جو آپ کے قبضے میں آیا ہے اور باقی ہو کیوں کہ آلات تجارت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

• اگر حصص کمپنی کے اندر ہیں اور بطور سامان اس کی قیمت کم و بیش ہو سکتی ہے تو آپ کے قبضے میں جو رقم آئے گی اس رقم مقبوضہ پر زکوٰۃ ہوگی، اور اگر آپ نے پیشگی زکوٰۃ دیدی تو بہتر ہے اگرچہ واجب اس وقت ہوگی جب رقم آپ کے قبضے میں آئے گی۔

سوال ۲ - مشترکہ کاروبار پر زکوٰۃ

• کمپنی کا منیجر تمام سرمایہ کا امین ——— مالک نہیں ہے اس لیے اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

• ہاں اگر فیکٹری ہے اور شخصی ملکیت ہے تو اس پر سالانہ زکوٰۃ واجب ہوگی۔

• ہر حصہ دار پر زکوٰۃ ہے مگر اس رقم پر جو اس کے قبضے میں آگئی جس سے ملکیت تام ہوتی ہے۔

• حصے دار کی جو رقم کمپنی میں ہے وہ اس کے قبضے میں نہیں ہے صرف ملکیت ہے اس لیے زکوٰۃ نہیں ہوگی۔

سوال ۳ - زکوٰۃ انڈے پر ہے یا مرغیوں پر؟

• اگر مرغی فارم میں ہے اور مرغیاں فروخت ہوتی رہتی ہیں تو مرغیوں کی موجودہ قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، کیوں کہ وہ سامان تجارت رہیں۔

• اگر صرف انڈے فروخت ہوتے ہیں تو مرغیوں سے مطلب نہیں کیوں کہ وہ آلات تجارت ہیں۔

- اگر دودھ کا فارم ہے تو دودھ کی قیمت پر زکوٰۃ ہوگی، بھینس کی قیمت وغیرہ سے کوئی مطلب نہیں کیوں کر وہ اب آلۂ تجارت میں ہے سامان تجارت نہیں ہے۔
- مرغی فارم میں اگر انڈے اور مرغی دونوں کی فروختگی ہوتی ہے تو دونوں کی صرف مالیت پر زکوٰۃ ہے اور انڈے مرغیوں کے لیے پھل کے طور پر ہوں گے جو شامل ہوں گے۔

جواب تجارت خواہ کسی چیز کی ہو تاجر کا کھانا، کپڑا اور مکان تینوں پر جو بھی خرچ ہوا ہے وہ مال زکوٰۃ نہیں تھا، اس خرچ کے سوا بچی ہوئی آمدنی پر جس کی ضرورت سال بھر نہیں ہوئی اس پر زکوٰۃ ہے یا جو تجارت ہوتی رہی اس پر زکوٰۃ ہے۔

- کھانے، کپڑے اور مکان کی حیثیت مالک یا تاجر کی اپنی حیثیت کے لوگوں میں مڈل کلاس اور اوسط درجے کے لوگوں کی مانی جائے گی، لہذا انڈے کا دوکاندار سائیکل رکھ سکتا ہے اور پولٹری فارم والا اسکوٹر، مالک کی حیثیت موٹر والے کی حیثیت ہے یہ سب ذاتی اخراجات ہوں گے۔

سوال۔ زمین داری بانڈ کا سود؟

زمین شرعی طور پر میری ملک ہے مگر کمیونزم میں ملکیت ختم اس لیے خاتمۂ زمین داری کے بعد زمین سے بے دخل کرنا شرعاً غلط تھا اور قانوناً صحیح تھا، اگرچہ اب قانون میں بھی غلط ہو جائے گا۔

اور جب زمین کا مالک ہی تھا تو میری مرضی کے بغیر اسے لینا غصب کرنا ہے، ایسے میں جو رقم ادا کی جا رہی ہے یا بانڈ دیا گیا اور اس پر انٹرسٹ دیا گیا، وہ سب کا سب میری زمین کا معاوضہ ہے۔ اس میں سود کچھ نہیں ہے، بنیادی غلطی قانون کی ہے۔

- اگر ظلم اور زیادتی سے بانڈ خرید کر بیچ سکتے ہیں تو خریدنا جائز ہوگا تاکہ اپنا مال بچایا جا سکے لیکن اس رقم پر جو انٹرسٹ ہوگا وہ سود ہوگا اسے حاصل کر کے غربا پر تقسیم کر دے۔
- فکس ڈپازٹ میں ہماری اپنی رقم سے جو بھی زائد ملتا ہے وہ بلا معاوضہ ہے، اس لیے سود ہے اسے بھی حاصل کر کے غربا کو تقسیم کر دینا لازم ہے۔
- زمین، جائداد اور مکان خریدنا صرف مال کی حفاظت کے لیے یا تجارت کر کے نفع کے لیے درست ہے اور اس سے نفع کمانا بھی درست ہے، زکوٰۃ مالیت پر ہوگی زمین پر نہیں اس کا نفع انٹرسٹ

ایسا سبب نفع ہے۔

• جوا اور قمار حرام ہے اس لیے کہ اس میں نفع و نقصان متعین نہیں، لیکن اگر دونوں کا امکان ہے اور ہم اس میں دخل دے کر یا بصیرت پیدا کر کے اس پر قابو پا سکتے ہیں تو وہ جائز نہیں ہے؟ کیونکہ حصص کی قیمت، کمپنی کی ساکھ، بازار کے دباؤ یا بین الاقوامی حالات سے گھٹتے بڑھتے ہیں، اس کی خرید فروخت میں عقل، تجربہ اور بصیرت کی ضرورت ہے، اس کی خرید و فروخت جائز ہے، الا یہ کہ کوئی غلط صورت پیدا ہو جائے۔ [illegible]

زکوٰۃ

از: ——— محمد محی الدین بڑودوی، دار الافتاء دار العلوم فلاح دارین، ترکیسر، سورت، گجرات

الحمد للہ الذی یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً، والصلاۃ والسلام علی رسولہ محمد المبعوث کافۃ للناس بشیراً ونذیراً، وعلی آلہ وصحبہ الذین ہم اتقوا الذین فصاروا ہداۃ واسوۃ للفقہاء المجتہدین لیلاً ونہاراً۔

اما بعد!

محترم قارئین کرام: امسال اسلامی فقہ اکیڈمی کی طرف سے جو سوالنامہ جاری کیا گیا اس کے جواب میں مختصر سی معروضات پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ امید کہ بنظر تحقیق و تصحیح مطالعہ فرمائیں گے۔ فإن کان صواباً فمن اللہ وإن کان خطأ فمنی۔

محور اوّل

جن اموال میں زکوٰۃ واجب ہے وہ تین قسم پر مشتمل ہیں:

اوّل: اثمان مطلقہ، سونا اور چاندی جو طبعی طور پر اموال تجارت ہیں۔ دوم: اموال تجارت یعنی وہ سامان و اسباب جو تجارت کی غرض سے تیار کیا گیا یا خریدا گیا ہے۔ سوم: سوائم وہ جانور جو سائمہ ہیں۔[1]

مذکورہ اموال پر زکوٰۃ کے وجوب کے لیے پانچ شرائط ہیں: (۱) مطلق ملک (۲) ملک مطلق یعنی ملک تام (۳) نماء، خواہ حقیقۃً ہو جیسے اموال تجارت اور سوائم، خواہ نماء حکماً ہو جیسے

[1] بدائع ۲/۱۱

سونا اور چاندی (۴) مال کا حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا جس کی وجہ سے غنا کا تحقق ہوتا ہے (۵) حولان حول اس لیے کہ مال میں نماء کے حصول کی خاطر مدت درکار ہے اور استنماء کے لیے کم از کم ایک سال چاہیے،

ملک تام کی تعریف

"وهو ان يكون مملوكا له رقبة و يدا وهذا قول اصحابنا الثلاثة، وقال زفر اليد ليست بشرط وهو قول الشافعي"[1]

"ملک تام یہ ہے کہ مال کی ذات پر ملک ہو اور وہ مال قبضۂ مالک میں بھی ہو، حضرت زفرؒ و شافعیؒ کے یہاں ملک تام میں قبضہ مشروط نہیں ہے"۔

"والمراد بالملك التام القدرة على التصرف من غير ان يلزم بهذا التصرف تبعة في الدنيا ولا في العقبى"[2]

"ملک تام سے مراد یہ ہے کہ مالک کو تصرف پر اس طرح قدرت حاصل ہو کہ تصرف سے اس پر کوئی مواخذہ دنیوی یا اخروی عائد نہ ہوتا ہو"۔

ملک تام کی روشنی میں آپ کے سوالات کے جواب ملاحظہ فرمائیں:

جوابؒ ـــــ مبیع کے قبضۂ مشتری میں نہ آنے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔

۱ ـــــ بیع سلم میں قیمت کی ادائیگی کے بعد مبیع سپرد کرنے کا وقت آنے تک مبیع مشتری کے قبضہ میں نہیں ہے۔

۲ ـــــ خیار شرط کی بنا پر بائع کے قبضہ میں ہو۔

۳ ـــــ بلا کسی شرط کے مبیع بائع کے قبضہ میں ہو۔

۴ ـــــ مبیع بائع کے پاس سے روانہ ہو چکی ابھی راہ میں ہے۔

۵ ـــــ مبیع بائع کے پاس سے روانہ ہو کر گم ہو گئی ابھی مشتری تک نہیں پہونچی، البتہ ریلوے یا ٹرانسپورٹ وغیرہ کا وثیقہ (رسید) موجود ہے۔

---

[1] حاشیۂ رد المحتار ۲/۲۶۰۔

۹۔ ——— راہ میں گم ہو گیا لیکن کوئی وثیقہ موجود نہیں، جیسے اُنگڑیا کی معرفت۔

مذکورہ بالا تمام صورتوں میں ملک تام کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر بائع کو جو قیمت پہنچ چکی ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہے اگر قیمت مستقلاً قدر نصاب ہے، تو حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہے، اور اسی قیمت سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ بائع رقبۃً و یداً قیمت میں متصرف ہے۔

اور مذکورہ بالا جملہ صورتوں میں مشتری کے لیے قبل قبضِ مبیع سے پہلے زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی کیونکہ مشتری متصرف نہیں ہے۔ قبضہ سے پہلے مشتری کے لیے مبیع کا فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ لہٰذا اگرچہ قبضہ سے پہلے پورا سال گزر جائے تب بھی مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

مبیع خواہ ریلوے سے بائع نے روانہ کی ہو یا ٹرانسپورٹ سے خواہ راہ میں گم ہو کر وثیقہ موجود ہو یا نہ ہو، یہ بائع کی طرف سے روانگی ترسیل ہے۔ اور ترسیل بائع کی صورت میں مبیع جب تک مشتری کے پاس پہونچ نہ جائے تسلیم مبیع ثابت نہیں ہوتی۔

چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ فتح القدیر میں رقمطراز ہیں:

"ولهذا لا يجب في مال الضمار ويخرج ايضاً المال المشتراة للتجارة اذا لم يقبض حتى حال حول لا زكوٰة فيه لانه لم ينعقد ملك التصرف"[1]

اور علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

"وخرج به ايضاً كما في البحر المشتري للتجارة قبل القبض والآبق بعد التجارة"[2]

ریلوے ٹرانسپورٹ کے ذریعہ بائع مال بھیجتا ہے تو یہ ترسیل ہے۔ ترسیل میں تسلیم نہیں ہوتی۔ ہاں توکیل میں تسلیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اگر مشتری نے ایک شخص کو متعین کر دیا کہ مال اس کو دیدینا اور اس متعین شخص نے ذمہ داری لے لی تو یہ شخص مشتری کا وکیل ہو گیا۔ جب اس نے مال پر قبضہ کر لیا تو اصیل کا قبضہ شمار ہو گا۔ اس لیے اس صورت میں مشتری پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

———

[1] فتح القدیر ۲/۱۶۳ [2] رد محتار ۲/۳۶۰۔

چنانچہ حضرت علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں :

"قال البائع زنه له وابعثه مع غلامك او غلامی فعل وانكسر الوعاء فی الطریق فالتلف من البائع الا ان یقول ادفعه الی الغلام لانه توكیل للغلام والدفع الیه كالدفع الی المشتری[1] "

"مشتری نے بائع سے کہا کہ تم اس کو تول لینا اور اپنے یا میرے غلام کے ساتھ اس کو بھیج دینا بائع نے ایسا ہی کیا اور راستہ میں برتن ٹوٹ گیا، تو بائع کا نقصان شمار ہوگا مگر یہ کہ مشتری نے بائع سے اس طرح کہا کہ اس غلام کو مال دیدینا اور غلام نے ذمہ داری لے لی تو یہ غلام کو وکیل بنانے کی صورت ہوگئی اور غلام کو دیدینا مشتری کو دیدینے کے حکم میں ہوگا پہلی صورت ترسیل کی ہے دوسری صورت توکیل کی ہے۔ "هذا توكیل والاول ترسیل"[2]

اسی طرح فرماتے ہیں :

"اشتری فی المصر حطبا فغصبه غاصب حال حمله الی منزله فمن البائع لان علیه التسلیم فی منزل الشاری العرف[3] "

"شہر میں لکڑیاں خریدیں پھر مشتری کے گھر پہونچاتے وقت کسی غاصب نے لکڑیاں غصب کرلیں۔ تو بائع کی لکڑی گئی، اس لیے کہ بائع پر مشتری کے گھر پہونچا کر سپرد کرنا ضروری ہے، عرف کی بناء پر۔

علامہ رافعیؒ فرماتے ہیں :

"لا دخل لهذا العلة فی الحكم بل العلة هی تحقق الهلاك قبل التسلیم ولا فرق بین كون المبیع حطبا او غیره "

"عرف کو اس میں دخل نہیں ہے بلکہ اصل علت تسلیم سے پہلے ہلاکت کا تحقق ہے، اسی طرح مبیع لکڑی ہو یا دوسری چیز حکم میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔"

مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوا کہ اگر مشتری نے کسی کو وکیل بنادیا ہے تو وکیل کا قبضہ موکل

---

[1] رد المحتار ۴/۵۴۵ [2] تقریرات رافعی ۴/۱۱۹ [3] رد المحتار ۴/۵۴۳

کا قبضہ شمار ہوگا، اور تسلیم کامل ہو جائے گی، اور اگر مشتری نے کسی کو وکیل نہیں بنایا تو اس صورت میں اگرچہ مشتری کے امر سے مال بھیجا ہو وہ ترسیل میں داخل ہے، اور ترسیل کی صورت میں تسلیم الی المشتری اس وقت متحقق ہوگی جب مال مشتری کے قبضہ میں پہونچ جائے۔

اس لیے ریلوے ٹرانسپورٹ، ڈاک وغیرہ ذرائع سے بائع کا مال بھیجنا ترسیل ہے، اس صورت میں قبضہ مشتری سے پہلے تسلیم ثابت نہیں ہوتی اور قبضہ بھی نہیں ہوا ہے، اور جو مال مشتری کے قبضہ تصرف میں نہ آیا ہو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے اگرچہ مشتری نے قبضہ کرنے کے بعد مال روانہ کیا یا مشتری نے ریلوے ٹرانسپورٹ وغیرہ سے رابطہ قائم کر کے بائع سے مال منگوایا ہے تو ریلوے وغیرہ مشتری کے وکیل ہو جاتے ایسی صورت میں مال وصول ہونے پر قبضہ کے وقت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اور چند صورتوں میں بائع پر مبیع کی زکوٰۃ فرض نہیں، کیونکہ مبیع بائع کی ملک سے نکل گئی ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

جواب — ڈپوزٹ: ڈپوزٹ میں مالک مکان کو عرفاً تصرف مباح ہوتا ہے اور ڈپوزٹ سے مقصود بھی تصرف و انتفاع ہے اس لیے ودیعت و رہن سے اس کی حیثیت مختلف ہے۔ اس لیے مالک پر دین و قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے اور خود کرایہ دار (صاحب ڈپوزٹ) کے لیے بھی مالک مکان پر قرض کی حیثیت قوی معلوم ہوتی ہے۔

مستقرض قرض کا مالک ہو جاتا ہے، طرفین کے یہاں تو صرف قبضہ سے مالک ہو جاتا ہے، اور حضرت امام ابو یوسفؒ کے نزدیک قرض میں تصرف سے مالک ہوتا ہے۔ اس لیے صاحب مکان پر اس رقم کی زکوٰۃ لازم ہوگی، اگر یہ رقم مشغول بالدین نہ ہو۔ یعنی اس کے پاس ڈپوزٹ کے علاوہ رقم ضرورت سے زائد بقدر نصاب موجود ہو، جو ڈپوزٹ کے دین کو ادا کرنے کے لیے کافی ہو، اس صورت میں اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو ڈپوزٹ مال مستفاد میں داخل ہو کر سال رواں کے حساب میں آ جائے گی ورنہ حولان حول کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر ڈپوزٹ قرض ہے، طویل مدت مقرر نہیں کرایہ دار کی طرف سے مطالبہ کا اندیشہ نہیں ہے تو دین مؤجل کے حکم میں آ جائے گی۔ جس کا بیان دیون کے ذکر میں آ رہا ہے۔

اور کرایہ دار کا مالک مکان پر یہ دین قوی ہے۔ قرض دین قوی میں داخل ہے۔ اس لیے واپس ملنے کی صورت میں سالہائے گذشتہ کی زکوٰۃ اس پر واجب ہوگی۔

حضرت علامہ علاء الدین حصکفی فرماتے ہیں:

"ویملک المستقرض القرض بنفس القبض عندهما ای الامام ومحمد خلافاً للثانی. القرض لایتعلق بالجائز من الشروط فالفاسد منها لا یبطله ولکنه یلغو شرط النفع"[1]

جواب ــــ اجارہ کی رقم مشتگی ادا کر دینے کی صورت میں مالک مکان پوری رقم کا مالک فوراً نہیں ہو جاتا، بلکہ اجارہ میں ملک ساعۃً فساعۃً بدلین میں ثابت ہوتی ہے اس لیے کم از کم ایک دن گزرنے پر ایک روز کے کرایہ کا مالک بنے گا، بقیہ رقم ودیعت سمجھی جائے گی، کرایہ دار کی رقم کرایہ دار کی ملک سے نکلی نہیں ہے۔ فسخ کرایہ پر واپس مل سکتی ہے اس لیے کرایہ دار پر اپنی رقم کی زکوٰۃ واجب ہوگی، کرایہ دار کی جس قدر رقم حولان حول سے قبل کرایہ میں مستحق بنے گی، زکوٰۃ سے خارج ہو جائے گی، اور حولان حول کے وقت جو رقم مستحق نہیں بنی ہے حساب زکوٰۃ میں معدود ہوگی۔

مالک مکان پر پوری رقم کی زکوٰۃ لازم نہ ہوگی، بلکہ جس قدر کرایہ کا وہ مستحق بن رہا ہے اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جس قدر رقم کا مستحق بن گیا ہے وہ رقم مال مستفاد میں شمار ہو کر دوسرے مال زکوٰۃ کے ساتھ حساب میں آجائے گی، حولان حول شرط نہیں۔ اگر وہ پہلے سے صاحب نصاب نہیں ہے بلکہ مستحق کرایہ سے صاحب نصاب بن رہا ہے تو زکوٰۃ کی دیگر شرط کے ساتھ حولان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔ (واللہ تعالیٰ اعلم)

"وحکمها وقوع الملك فی البدلین ساعة فساعة (درمختار) لان المنفعة عرض لاتبقی زمانین فاذا کان حدوثه کذلك فی ملك بدله کذلك قصداً للتعادل"[2]

جواب ــــ مدارس اور اداروں میں جمع ہونے والی رقم وقف ہے کسی کی ملک میں نہیں ہے زکوٰۃ کی رقم ہے تو اس پر دوبارہ زکوٰۃ نہیں، اس کی تملیک کے بعد مالکین پر صاحب نصاب ہو جائیں تو زکوٰۃ آئے گی۔ وقف کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، اس لیے کہ (مطلق ملک (شرط)) مفقود ہے۔

"واما الشرائط التی ترجع الی المال فمنها الملك فلا تجب الزکاۃ فی سوائم الوقف والخیل المسبلة لعدم الملك وهذا لان فی الزکاۃ تملیکاً والتملیك فی غیر الملك لایتصور"[3]

---

[1] درمختار مع الشامی ۵/۱۶۳ [2] شامی ۶/۵ [3] بدائع ۲/۹۔

جوابؒ ـــــ جو مال بطورِ حرام کسی کے پاس آیا، جیسے رشوت کا مال یا سود کا مال یا مغصوب مال اگر علیحدہ محفوظ ہو تب تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی، ہاں اگر اپنے مال کے ساتھ اس طرح مخلوط کر دیا کہ تمیز مشکل ہے تو اب حضرت امام ابو حنیفہ کے قول کے مطابق اس شخص کے ذمہ میں مال غیر کا ضمان لازم ہو گیا کیوں کہ مالِ غیر مستہلک ہو گیا اور جب مال غیر کا ضمان ذمہ میں واجب ہو گیا تو مخلوط مال پورا اس کا مملوک بن گیا، اس لیے اس مال پر زکوٰۃ لازم ہوگی، پورے مال پر زکوٰۃ آئے گی، وراثت بھی جاری ہوگی۔

اس زمانہ میں عام طور پر لوگوں کے مال غیر کے مال سے مخلوط رہتے ہیں، وراثت کی باقاعدہ تقسیم نہ ہونے کی وجہ سے، قمار، ربوا، رشوت اور غصب کی بنا پر۔ اس لیے مالکین کے لیے تمیز و حساب دشوار ہے، تو مالکین پر سہولت کی خاطر، نیز فقراء کے لیے بھی انفع ہے، اس لیے زکوٰۃ پورے مال پر لازم ہوگی۔

لیکن مخلوط مال پر زکوٰۃ کا وجوب اس صورت میں ہے کہ جب مخلوط مال کے علاوہ حلال مال علیحدہ موجود ہو جو بقدر نصاب بھی ہو اور فاضل عن الحاجۃ والدَّین بھی ہو، جس میں خود مال حرام کا دَین بھی شامل ہے اسی طرح اگر مخلوط مال میں حلال حصہ نصاب زکوٰۃ کو پہونچ جاتا ہے اور علیحدہ حلال مال مخلوط مال میں مال حرام کے دیون کو پورا کر دیتا ہو تب زکوٰۃ پورے مال مخلوط پر آئے گی۔

"لو خلط السلطان المال المغصوب بماله ملكه فتجب فيه الزكاة ويورث عنه لان الخلط استهلاك اذا لم يمكن تمييزه عند ابی حنيفة وقوله ارفق اذ قلما يخلو مال عن غصب وهذا اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط منفصل عنه يوفي دينه والا فلا زكوٰة . اى ما اذا كان له مال غير ما استهلكه بالخلط يفضل عنه فلا يحيط الدين بماله اه اى يفضل عنه ما يبلغ نصابًا كما كون الكل خبيثًا فى الكلية لو كان الخبيث نصابًا لا يلزمه الزكاة لان الكل واجب التصدق عليه فلا يفيد ايجاب التصدق ببعضه اه ومثله فى البزازية"[1]

یعنی اگر پورا ہی مال خبیث ہو تو واجب التصدق ہی ہے پھر اس کے بعض حصہ کو زکوٰۃ کی حیثیت

---

[1] در مختار۔ رد المحتار ۲/ ۲۹۱۔

سے واجب التصدق کہنے میں کوئی نیا فائدہ نہیں ہے۔

جواب ــــــ " وجملة الكلام في الديون انها على ثلاثة مراتب في قول ابي حنيفة دين قوي ودين ضعيف، ودين وسط كذا قال عامة مشائخنا اما القوي فهو الذي وجب بدلاً من مال التجارة كثمن عرض التجارة من ثياب التجارة وعبيدُ التجارة او غلة مال التجارة ولا خلاف في وجوب الزكاة فيه الا انه لا يخاطب باداء شئ من زكات ما مضى ما لم يقبض اربعين درهما فكلما قبض اربعين درهما ادى درهماً واحداً (عند ابي حنيفة) وعند ابي يوسف ومحمد كلما قبض شيئاً يؤدي زكوته قل المقبوض اوكثر، واما الدين الضعيف فهو الذي وجب له لا بدلاً من شئ سواء وجب له بغير صنعه كالميراث او بصنعه كالوصية او وجب بدلاً عما ليس بمال كالمهر وبدل الخلع والصلح عن القصاص وبدل الكتابة ولا زكاة فيه ما لم يقبض كله ويحول عليه الحول بعد القبض۔

واما الدين الوسط فما وجب له بدلاً من مال ليس للتجارة كثمن عبد الخدمة وثمن ثياب البذلة والمهنة وفيه الروايتان عنه ذكر في الاصل انه تجب الزكاة فيه قبل القبض لكن لا يخاطب بالاداء ما لم يقبض مائتي درهم فاذا قبض مائتي درهم زكى لما مضى۔ وروى ابن سماعة عن ابي يوسف عن ابي حنيفة انه لا زكاة فيه حتى يقبض المائتين ويحول عليه الحول من وقت القبض وهو اصح الروايتين عنه وقال ابو يوسف ومحمد الديون كلها سواء وكلها قوية تجب فيها الزكاة قبل القبض الا الدية على العاقلة ومال الكتابة فانه لا تجب فيها الزكاة اصلاً ما لم يقبض ويحول عليه الحول[1]"

دین کی تین قسمیں ہیں۔ دین قوی، دین ضعیف، دین وسط۔ دین قوی وہ ہے جو کسی

---

[1] بدائع ۲/۱۰۔

کے ذمہ میں مالِ تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہو۔ جیسے مالِ تجارت کا ثمن، خواہ کپڑے یا
غلام کا ثمن ہو، یا مالِ تجارت کی آمدنی ہو، دینِ قوی کے اندر وجوبِ زکوٰۃ میں کوئی اختلاف
نہیں ہے۔ البتہ گزشتہ مدت کی ادائیگی کا مکلف نہیں ہے جب تک کہ چالیس درہم
قبضہ میں نہ آجائیں، جب چالیس درہم قبضہ میں آجائیں تب ایک درہم زکوٰۃ لازم ہوگی۔
اور صاحبین رح کے نزدیک جس قدر وصول ہو کم یا زیادہ مقبوض کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔ دینِ
ضعیف وہ ہے جو کسی کے ذمہ بلا بدلہ کے واجب ہوتا ہے، خواہ اس کے وجوب میں بندہ
کے فعل کو دخل ہو۔ جیسے مالِ وصیت یا بندہ کا فعل دخیل نہ ہو، جیسے میراث۔ اور دینِ ضعیف
اس قرض کو بھی کہتے ہیں جو غیر مال کے بدلہ میں لازم ہوتا ہے۔ جیسے مہر، بدلِ خلع، اور بدلِ صلح
عن القصاص نیز بدلِ کتابت۔ اس کا حکم یہ ہے کہ ایسے دین میں زکوٰۃ فرض نہیں ہوتی، جب
تک پورا مال قبضہ میں آکر اس پر سال گزر نہ جائے۔

دینِ متوسط وہ دین ہے جو مالِ غیر تجارت کے بدلہ میں واجب ہوتا ہے۔ جیسے خدمت کے
غلام کا ثمن یا روزانہ استعمال کے کپڑوں کی قیمت۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ سے اس دین کے حکم کے
بارے میں دو روایات ہیں۔ اصل میں مذکور ہے کہ دینِ متوسط میں قبل القبض زکوٰۃ تو واجب ہوتی
ہے لیکن ادا کا مکلف نہیں ہے جب تک پورے دو سو درہم مقبوض نہ ہو جائیں۔ جب دو سو درہم
مقبوض ہو جائیں گے گزشتہ مدت کی زکوٰۃ لازم ہوگی۔

اور ابن سماعہؒ کی روایت عن ابی یوسف عن ابی حنیفہ یہ ہے کہ دینِ متوسط میں زکوٰۃ لازم نہیں ہے
یہاں تک کہ دو سو درہم (نصاب کا دین) مقبوض ہو کر اس پر قبضہ کے بعد ایک سال گزر جائے
دونوں روایتوں میں اصح روایت پہلی ہے۔ صاحبین فرماتے ہیں، دین سب برابر ہیں سب قوی
ہیں (فرق درجات نہیں ہے) سب میں زکوٰۃ قبضہ سے پہلے ہی واجب ہو جاتی ہے۔ سوائے
دیت علی العاقلہ اور بدلِ کتابت کہ اس میں زکوٰۃ بالکل واجب نہیں ہوتی یہاں تک کہ قبضہ
کے بعد سال گزر جائے۔ انتہیٰ۔

دین میں اس حیثیت سے کہ ذمہ میں ایک حق ہے (کوئی مال مملوک رقبۃً و یداً نہیں ہے) اس لیے
زکوٰۃ بالکل واجب ہونا ہی نہ چاہیے، جس طرح مالِ ضمار میں قبضہ نہ ہونے کی بنا پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی

اسی طرح تمام دیون میں قبضہ نہ ہونے کی بنا پر زکوٰۃ واجب نہ ہونا چاہیئے، لیکن دین قوی (جس میں قرض بھی شامل ہے، فتح القدیر) مال تجارت کا بدل ہے۔ اور مال تجارت جو مبدل ہے قبضہ کے قابل ایک عین ہے جس طرح مبدل (مبیع) مملوک رقبۃً و یداً ہے، بدل (ثمن) بھی مملوک رقبۃً و یداً سمجھ لیا گیا، اس لیے اس میں زکوٰۃ لازم ہوتی ہے۔

اسی طرح دین وسط میں بھی صحیح روایت کی بناء پر زکوٰۃ لازم نہیں ہے۔ کیوں کہ بدل مال غیر تجارت ہے، چنانچہ مال غیر تجارت جب کہ حقیقۃً مقبوض ہو تو اس پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوتی تو بدل کے اندر بھی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، مقبوض ہونے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔

مسئولہ صورت میں اگر دین سے مراد قرض ہے تو قرض پر مقرض کے ذمہ زکوٰۃ فرض ہے کیوں کہ قرض دین قوی ہے اگر چہ ید تصرف اس پر حاصل نہیں ہے، اور مستقرض بھی اس قرض کا مالک بن چکا ہے، اگر یہ قرض مشغول بالدین ہے۔ تو مستقرض پر زکوٰۃ واجب نہیں، اگر قرض مشغول بالدین نہ ہو اور نصاب تک پہونچ جاتا ہو تو مستقرض پر حولان حول کے بعد زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اگر قرض نصاب تک نہیں پہونچتا، اور مستقرض پہلے سے صاحب نصاب خالی عن الدین ہے تو قرض مال مستفاد میں شمار ہو جائے گا اور زکوٰۃ واجب ہوگی، ثمال مثول موثر نہ ہوگی۔ قرض مشغول بالدین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرض موجل ہو طویل الاجل ہو۔ مثلاً دس سال یا پانچ سال کے بعد ہی ادا کرنا ہے، اس سے پہلے کوئی مطالبہ نہیں ہوگا، تو اس صورت میں جیسے کہ آمدنی آ رہا ہے، مستقرض پر قرض کی زکوٰۃ آئے گی۔

اگر قرض کے سوا کوئی اور دین قوی ہے مال تجارت کا بدل ہے تو دائن (بائع) پر زکوٰۃ واجب ہوگی، جب مشتری کے پاس سے ثمن وصول ہوگا، ماضی کی زکوٰۃ لازم ہوگی، جس قدر وصول ہوتا جائے زکوٰۃ ادا کرتا جائے یا کم از کم چالیس درہم وصول ہونے پر زکوٰۃ ادا کرے گا۔

مدیون (مشتری) کے پاس مال تجارت آچکا ہے اس کا حساب مال تجارت میں ہوگا، مشتری پر بائع کا جو ثمن ذمہ میں باقی ہے۔ مشتری اس کا مالک نہیں ہے، نہ مشتری کا ثمن پر بحیثیت محسوس کوئی قبضہ ہے، مشتری اس لیے مالک نہیں ہے کہ وہ مبیع کا مالک بن چکا اگر بدل کا مالک ہو تو بدلین کا ایک ملک میں اجتماع ہو جائے گا۔ جو ظاہر الفساد ہے اس لیے مشتری پر ثمال مثول کرنے کی صورت میں کوئی زکوٰۃ ثمن پر نہیں آئے گی، ثمال مثول کا گناہ ضرور ہوگا اگر بے وجہ ہو۔ کیوں کہ جو مال تجارت میں مشتری

نے لگایا ہے وہ خود مشتری کا ہے۔ "الدَّرَاهِمُ وَالدَّنَانِيرُ لَا تَتَعَيَّنُ فِي الْعُقُودِ"۔

ہاں اگر ثمن عرض غیر معین ہو تو جب تک مشتری کے عرض تجارت میں شامل ہے تو عرض تجارت کی مجموعی زکوٰۃ میں شامل رہے گا۔ مشتری کے ذمہ زکوٰۃ آئے گی، عرض معین یا منفصل ہو تو مشتری پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ وہ مالک نہیں ہے، اور بائع پر دونوں صورتوں میں زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، کیوں کہ تسلیم نہیں ہوئی اور یہ تصرف حاصل نہیں ہے۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ بِالصَّوَابِ۔

حواشی —— پراویڈنٹ فنڈ دین ضعیف میں داخل ہے کیوں کہ بدل نمائیں "بیان" ہے اجرت ہے اسلیے اس میں مجموعی رقم میں گزشتہ کی زکوٰۃ لازم نہیں ہے، وصول ہونے کے بعد حولان حول پر زکوٰۃ لازم ہوگی۔ اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو مال مستفاد میں شمار ہوگا، اگر ایسا اجیر ہے جس کو ملازمت میں اپنا کچھ مال لگانا پڑتا ہو، جیسے صباغ (رنگریز) کہ رنگ اپنی استعمال کرتا ہے تو رنگ کی قیمت مستاجر پر دین قوی میں داخل ہو کر اس کی زکوٰۃ وصول ہونے پر ادا کی جائے گی۔

دوسری شرط نماء

نماء کا معنی زیادت و اضافہ ہے، مال نامی میں زکوٰۃ فرض ہوتی ہے۔

نماء خواہ حقیقۃً مال میں ہو رہا ہو جیسے اموال تجارت اور سائمہ جانور۔ خواہ نماء حکماً موجود ہو جیسے سونا، چاندی میں۔ لیکن کسی بھی صورت میں نماء کا بالفعل ہونا ضروری نہیں ہے، مقصد یہ ہے کہ مال کو طلب زیادت کے لیے تیار رکھنا، خواہ بالفعل زیادت ہو رہی ہو جیسے دکان کھلی ہے اور بکری جاری ہے؛ یا تقدیراً نماء موجود ہے جیسے دکان بند ہے آٹھ دس روز کے لیے یا کھلی ہے مگر گاہک نہیں ہے تو اگرچہ بالفعل نماء نہیں ہے لیکن تقدیراً اس کو مال نامی کہتے ہیں، اسی طرح سونا اور چاندی کہ فطرۃً نماء کے لیے ہے، کسی بھی تجارت میں ثمن بننے کی صلاحیت فطری طور پر اس میں موجود ہے، طلب زیادت کی اہلیت رکھتا ہے، اگرچہ مدتہائے دراز سے قفل میں بند ہو لیکن بالقوۃ نماء اس میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ وہ اموال جو برائے استعمال ہیں، اس میں نماء حاجت اصلیہ سے بڑھ کر نہیں ہوتا اس میں نماء ہو بھی جیسے پالتو جانوروں میں تو زیادت بھی حاجت اصلیہ میں مشغول ہوتی ہے۔

حاجت اصلیہ کی تعریف اور اس کا دائرہ

"الحاجة الاصلية وهي ما يدفع الهلاك عن الانسان تحقيقاً كالنفقة ودور السكنى وآلات الحرب والثياب المحتاج اليها لدفع الحر او البرد او تقديراً كالدين فان المديون محتاج الى قضائه بما في يده من النصاب دفعاً عن نفسه الحبس الذي هو كالهلاك وكآلات الحرفة واثاث المنزل ودواب الركوب وكتب العلم لاهلها فان الجهل عندهم كالهلاك"[1]

"حاجت اصلیہ جو انسان کو ہلاکت تحقیقی یا تقدیری سے محفوظ رکھے، ہلاکت تحقیقی سے حفاظت کی صورت یہ ہے کہ انسان روز مرہ کے خرچ، رہنے کے لیے گھر آلات جنگ اور سردی و گرمی سے بچنے کی خاطر ضروری کپڑوں کے بغیر ہلاک ہو جائے گا۔ اور تقدیری ہلاکت جیسے کہ قرضدار ہے جو اگرچہ صاحب نصاب ہو لیکن اس کو اپنا مقبوض نصاب قرض کی ادائیگی کے لیے خرچ کرنا ضروری ہوتا ہے اپنی ذات کو قید سے بچانے کے لیے جو ہلاکت کی طرح ہے۔ اسباب معیشت کے لیے آدمی کو اوزار رکھنے ہیں۔ آلات حرفت ہیں، گھر کے ضروری سامان، ان کی سواری کے لیے جانور، اور اہل علم کے لیے کتب علم بھی ضروریات میں شامل ہیں کیونکہ جہالت ان کے نزدیک موت کی طرح ہے۔"

حاجت اصلیہ کی تعریف جامع ہر زمانہ کی حوائج اصلیہ پر حاوی ہے اس لیے کوئی نئی تعریف کی جستجو کی ضرورت باقی نہیں رہتی، تاہم ہر زمانہ کے معیار اور ہر شخص کی اپنی حالت کی لحاظ سے معتبر ہوگا، اسی طرح گھر کا معیار بھی ملحوظ رہے گا۔ ہاں آلات جنگ صرف مدافعت نفس کی حیثیت و ضرورت کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے کیونکہ اجتماعی مدافعت کی ذمہ داری اس دور میں جنگ کی بدلتی ہوئی شکلوں کے ساتھ حکومت اور خاص فوجوں کی ذمہ داری میں داخل ہے۔ عوام کو ایسے آلات جنگ کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔ کپڑے بھی زمانہ، ملک اور موسم کے لحاظ سے مطلوب ہوں گے، اسی طرح آلات حرفت۔ حرفت کی بدلتی ہوئی

---

[1] رد المحتار ۲/ ۲۶۴۔

شکلوں کے مطابق ملحوظ ہوں گے۔ اس زمانہ میں بڑی بڑی فیکٹریاں بھی آلات حرفت میں محسوب ہو جائیں گی، امارت منزل ہر شخص کی اپنی ضرورت، رہن و سہن کے تقاضے کے مطابق مطلوب ہوتا ہے۔ مثلاً فرنیچر ایک ڈاکٹر کے لیے اس کے معیار کا ہوگا، ایک عالم کے لیے اس کے معیار کا ہونا چاہیے۔ جس میں مثلاً کتب کی الماریاں اور ملنے والے احباب کے لحاظ سے گھر کا اسباب ہوگا۔ تاجر کے لیے فون اور دیگر خصوصیات کے لحاظ سے فرنیچر ہوگا، مطبخ کا اسباب اعلیٰ وادنیٰ شہر و دیہات کے لحاظ سے جدا ہو سکتا ہے، کوکر، گیس، بجلی، فریج وغیرہ جدید کھانے پکانے کے آلات کا معیار ہر شخص کا جدا ہو سکتا ہے، غرض کہ ملک ملک، موسم موسم، عرف عرف اور معیار معیار کا فرق ملحوظ رہے گا، دستی گھڑی بھی اور دیواری یا ٹیبل گھڑی بھی ضروریات میں داخل ہے آج کل عالم کا کل نظام گھڑی سے وابستہ ہے، سواری کے لیے ایک اسکوٹر یا کم از کم سائیکل یا بس رکشہ وغیرہ کا کرایہ ضروریات میں داخل ہو سکتا ہے، سفر میں آدمی کی شان کے لحاظ سے A کلاس اور B کلاس کا فرق بھی پیش نظر رہنا چاہیے خاص پیشہ والے جن کو کار کی ضرورت ہو ان کے لیے کار بھی ضروریات میں داخل ہو سکتی ہے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

اگر حکومت کا دین مؤجل ہے جس کی میعاد طویل الاجل ہو اور عام طور پر حکومت کے قرضہ میں اجل سے پہلے مطالبہ نہیں ہوتا اس لیے اس قسم کے طویل المیعاد قرض مؤجل میں مقروض جس قدر ایک سال میں ادا کرتا ہے اس قدر اموال تجارت میں سے منہا کر کے کل مال تجارت کی زکوٰۃ ادا کرے، کیونکہ اس قرض میں بالفعل مطالبہ من جہۃ العباد نہیں ہے نیز جب ہر سال ادا کیے جانے والے قرض کو زکوٰۃ کے اموال میں سے منہا کر دیا گیا تو مثلاً چالیس سال میں جو مجموعی رقم گورنمنٹ کو ادا کی ہے، اس مجموعی قرض کی زکوٰۃ منہا ہو جائے گی، اور یہی مطلوب ہے۔

چنانچہ قرض مؤجل کے بارے میں علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

"او مؤجلاً، عزاہ الی المعراج الی شرح الطحاوی وقال عن ابی حنیفۃ لا یمنع وقال الصدر الشہید لا روایۃ فیہ ولکل من المنع وعدمہ وجہ زاد القہستانی عن الجواہر والصحیح انہ غیر مانع"[1]

---

[1] شامی ۲/۲۶۱۔

موجود ہے نہ وہ بھاؤ ہے اس لیے اس کو گزشتہ ہر سال کے اختتام پر جو اس کے لیے یوم ادا کا حکم رکھتا ہے، لحاظ سے زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

"وتعتبر القيمة يوم الوجوب وقالا يوم الاداء وفى السوائم يوم الاداء اجماعًا وهو الصحيح اى كون المعتبر فى السوائم يوم الاداء اجماعًا هو الصحيح فانه ذكر فى البدائع انه قيل ان المعتبر عنده فيها يوم الوجوب وقيل يوم الاداء وفى المحيط يعتبر يوم الاداء بالاجماع وهو الاصح فهو تصحيح للقول الثانى الموافق لقولهما وعليه فاعتبار يوم الاداء يكون متفقا عليه عنده وعندهما"۔

اراضی تجارت کی زکوٰۃ میں یوم ادا کے بازاری نرخ کا اعتبار کرنا چاہئے۔ متوقع نرخ نہ اس وقت موجود ہے نہ اس کا حصول ضروری ہے۔ سودا ہی نہ ہو یک دو سال گزر جائیں یا بھاؤ ہی گھٹ جائیں، اس لیے متوقع پر مدار رکھا ہی نہیں جا سکتا، متوقع مل جائے گا تو نقد میں مال مستفاد کی حیثیت سے شامل ہو جائے گا۔

شیئرز پر زکوٰۃ

شیئرز کی حقیقت کے لحاظ سے یہ اشتراک فی التجارت ہے، اس لیے تجارتی سرمایہ ہونے کی حیثیت سے زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر کمپنی میں مقدار آلاتِ حرفت (فیکٹری) میں ہے تو آلاتِ حرفت پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، اس لیے ایسے شیئرز پر زکوٰۃ نہیں ہوگی، ہاں جو آمدنی شیئرز سے حاصل ہوگی، اس پر زکوٰۃ ہوگی وقت ادا میں شیئرز کا جو بھاؤ مارکیٹ میں ہوگا وہ معتبر ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم بالصواب۔

بونڈس

مذکورہ صورت میں بونڈس قرض ہے، دین قوی ہے اس کی زکوٰۃ جس قدر وصول ہوتا جائے ادا کرنی ہوگی، گزشتہ سالوں کی بھی ادا کرنا ہوگی، اگر پہلے سے صاحب نصاب ہے تو حولان حول کی شرط بھی نہیں اگر سال بسال کر دیتا ہے اور صاحب نصاب ہے تو جائز ہے۔ یہ زکوٰۃ مؤجل شمار ہوگی۔

محور ثانی سونا اور چاندی میں سے جس نصاب کا بھی مالک ہو جائے صاحب نصاب کو غنی قرار دیا جائے گا، اس بارے میں ادنیٰ نصاب کا اعتبار ہوتا ہے، اسی طرح مال تجارت کے نصاب کی تقویم کے لیے ادنیٰ نصاب کا اعتبار ہوگا، اس زمانہ میں چاندی ادنیٰ ہونے کی وجہ سے تقویم کے لیے متعین ہے، انفع للفقراء بھی یہی ہے:

"ولو بلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به[۱]"

محور ثالث مصارف زکوٰۃ

غیر مستطیع طالب علم کو اگر زکوٰۃ کا چک دیدیا جائے اور طالب علم اس چک کے وصول کرنے کا مجاز مدرسہ کو بنادے، مدرسہ چک کی رقم وصول کرلے یا خود طالب علم چک کی رقم وصول کرکے مدرسہ میں دیدے تو تملیک کی صورت ہو جاتی ہے یہ صورت جائز ہے۔

مہتمم کی وکالت مہتمم مدرسہ مستحقین زکوٰۃ (طلبہ) کا وکیل نہیں ہے اس لیے کہ طلبہ نے اس کو وکیل نہیں بنایا توکیل نام ہے "اقامۃ الغیر مقام نفسہ"، تو جب تک طلبہ کی طرف سے زبانی خواہ کسی خاص رقم کے وصول کرنے کیلئے مہتمم کو وکیل بنایا نہیں جائے گا، توکیل وجود میں نہیں آئے گی، معین طلبہ یا طلبہ کا ضمن مہتمم کو وکیل بنادے یا ہر طالب علم سے داخلہ کے وقت داخلہ فارم میں توکیل کرائی جائے تو مہتمم وکیل بن جائے گا۔ وکیل موکل کا نائب ہوتا ہے:

"ليس كل اجر توكيلا بل لابد مما يفيد كون فعل المامور بطريق النيابة عن الآخر. فليحفظ[۲]"

کیا سفیر "عاملین علیہا" میں داخل ہے؟

چندہ وصول کرنے والا سفیر محض سفیر اور رسول ہے، وکیل و نائب نہیں ہے، رسول کے لیے کسی بھی عقد میں عقد کی اضافت مرسل کی طرف ضروری ہوتی ہے۔ وکیل کے لیے کسی کام میں موکل کی طرف نسبت ضروری نہیں ہے، سوائے امور چند کے (نکاح، خلع، ھبہ وغیرہ)

سفیر نہ معطین زکوٰۃ کا نائب ہے نہ مستحقین کا، اس لیے کہ عمل توکیل حقیقتاً یا حکماً موجود نہیں ہے:

---

[۱] درمختار مع الشامی ۲/۲۹۹ - [۲] درمختار ۵/۵۰۹

سفیر صرف مدرسہ کا رسول (قاصد) ہوتا ہے، سفیر مدرسہ کے نام سے چندہ کرتا ہے، مدرسہ کی رسید پیش کرتا ہے تب ہی اس کو معطین منتسب سمجھتے ہیں، یہی رسالت کی حقیقت ہے، بہرحال تو اس کا سفیر ہے۔

جب سفیر کسی کا نائب نہیں ہے تو سفیر کو "العاملین علیہا" کے حکم میں شمار نہیں کیا جا سکتا، عامل زکوٰۃ سلطان کا نائب ہوتا ہے۔

"واما العاملون عليها فهم الذين نصبهم الامام لجباية الصدقات"

عاملین وہ ہیں جن کو امام وصول صدقات کے لیے مقرر کرتا ہے۔[1] (بدائع)

عامل کا پورا وقت تحصیل زکوٰۃ میں صرف ہوتا ہے، عامل کو جو کچھ بھی ملتا ہے وہ بطور اجرت نہیں بلکہ اپنے اور اپنے اعوان کی کفایت کی حیثیت سے ملتا ہے، عامل خود مصرف میں شامل ہے، اس کا حق اس مال زکوٰۃ سے متعلق ہوتا ہے جو اس نے وصول کیا ہے اگر اس کا وصول کردہ مال ہلاک ہو جائے تو عامل کا حق بھی ساقط ہو جاتا ہے، نیز عامل کا یہ حق مال زکوٰۃ میں اس لیے متعلق ہوتا ہے کہ در حقیقت اصحاب مال کے کام میں لگا مصروف ہے یعنی ان کی زکوٰۃ سلطان یا امیر تک لے جاتا ہے، اس لیے ان کے اموال میں اس کی کفایت متعلق ہوتی ہے۔

اس کی عمالہ کو اجرت قرار نہیں دے سکتے اس لیے کہ عمالہ مجہول ہے کیونکہ عامل اور اس کے اعوان کے لیے کفایت کی مقدار متعین نہیں، مجہول ہے، حضرت امام شافعیؒ کے یہاں بھی اس کو اجرت قرار نہیں دے سکتے، اس لیے کہ عامل کا عمل مجہول ہے، وہ کس قدر صدقات لائے گا معلوم نہیں، اس لیے اجرت نامعلوم ہو جائے گی، اور اجارہ میں بدلین میں سے کسی کی بھی جہالت اجارہ کے جواز کے منافی ہے، تو یہاں تو دونوں بدل مجہول ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ سفیر مدرسہ نہ سلطان کی طرف سے ساعی ہے کہ اس پر ذمہ داری ہے، خود جا کر تحصیل زکوٰۃ کے لیے نہ وہ رقم رکھے گا نہ تحصیل زکوٰۃ کا حق لازم رکھتا ہے نہ معطین پر مدرسہ میں دینا واجب ہے، سفیر کی حیثیت محض اجیر کی ہے، عامل کی حیثیت اجیر کی نہیں ہے، اس لیے سفیر عاملین کے حکم میں نہیں آتا ہے، ہاشمی کو عمالہ سے ممانعت ہے، عمالہ اگر اجرت ہوتی تو ہاشمی کو ممانعت نہ ہوتی۔

---

[1] بدائع ۱/۴۴

سوالات کے جوابات

مبیع قبل القبض کی زکوٰۃ

از: مولانا محمد مصطفیٰ الاعظمی ۔ — دارالعلوم ، مئو ، یوپی ۔

۱۔ جس مال کی قیمت ادا کر دی گئی لیکن اب تک مال کی وصولی نہیں ہو سکی ہے اگر مبیع مال ہے تو قبضہ سے پہلے بیع کو اپنے اموال زکوٰۃ میں شمار کیا جائے گا اور مشتری پر اس کی زکوٰۃ واجب ہوگی ، جیسا کہ محیط سرخسی کے حوالے سے عالمگیری میں مذکور ہے ۔

"وأما المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصابا والصحیح انه یکون نصابا"[1]

اور جو رقم بطور ثمن کے بائع کے حوالہ کی جا چکی ہے اس کا ذمہ دار بائع ہے ، اگر بائع صاحب نصاب ہے تو زکوٰۃ میں اس قیمت کو بھی شامل کرے گا ، کیوں کہ یہاں ملکیت اور قبضہ دونوں موجود ہے

ڈپازٹ کی زکوٰۃ کا حکم

۲ ـــــ کرایہ کے بدلے میں دی گئی پیشگی رقم جو عقد اجارہ فسخ ہو جانے پر کرایہ دار کو واپس کی جاتی ہے اس کی زکوٰۃ کسی پر واجب نہیں ، نہ کرایہ دار پر نہ مالک مکان پر ، بلکہ وہ مثل رہن کے ہے ، اور رہن کی زکوٰۃ راہن پر بھی نہیں ہوتی کیوں کہ اس کا قبضہ نہیں اور مرتہن پر بھی نہیں ، اس لیے کہ اس کی ملک نہیں ، تو نفس ملکیت اور قبضہ کے مجموعہ سے وجوب میں آتی ہے وہ کسی کے حق میں موجود نہیں ، لہٰذا زکوٰۃ کا وجوب کسی پر نہیں ہوگا ۔

"ولا فی المرهون بعد قبضه ای لا علی المرتهن لعدم ملک الرقبة ولا علی"

۱۔ محیط السرخسی ۔

الراهن لعدم الفيوء الآن الشرورة الراهن لا يزكي عن السنين الماضية[1]

مالِ حرام کی زکوٰۃ کا حکم

۳۔ سود اور رشوت کے مال کا صدقہ بلا نیت ثواب واجب ہے یا اگر مالکِ اصلی کی طرف لوٹانا ممکن ہو تو لوٹانا واجب ہے، اس لیے ایسے مال میں زکوٰۃ کے وجوب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، کیوں کہ زکوٰۃ ایک عبادت ہے جس کو ثواب کے لیے کیا جاتا ہے۔

حرام مال حلال میں اس طرح گھل مل گیا کہ تمیز مشکل ہے تو اس صورت میں بھی صاحبین رحمہما اللہ کے نزدیک ملکیت ثابت نہیں ہوگی، لہٰذا زکوٰۃ کا وجوب اور وراثت اصل مالک ہی سے متعلق ہوں گے لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس صورت میں حق غیر کا تعلق ذمہ سے ہوگا عین مال سے نہیں، لہٰذا عین مال حرام کا امتیاز ختم ہوجانے کی بناء پر پورے مال پر ملکیت ثابت ہوگی، اور زکوٰۃ کا تعلق مجموعہ مال سے ہوگا، علامہ حصکفی فرماتے ہیں، امام صاحب کا قول قول ارفق ہے اور قابل عمل ہے[2]۔

دین کی زکوٰۃ کا حکم

۴۔ دین کی زکوٰۃ دائن ہی پر واجب ہوگی، مدیون پر نہیں، مدیون صاحب غنا ہونے کے باوجود ادا کرنے میں ٹال مٹول کر رہا ہے تو وہ اپنے اس رویہ میں بلاشبہ ظالم ہے، لیکن وہ اس مال کا مالک نہیں، البتہ اس کے ذریعہ جو نفع کما رہا ہے اس کی زکوٰۃ کا وہ ذمہ دار ہے۔

موجودہ تجارتی نظام میں بڑے چھوٹے ہر طرح کے تاجر کے مال کا بڑا حصہ ادھار رہتا ہے، بغیر ادھار کے اس زمانہ میں تجارت اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، تجارتی قرض جو فقہاء کے یہاں دین قوی کہا جاتا ہے، اس کی زکوٰۃ واجب ہے، امام ابوحنیفہ قبضہ کے بعد وجوب کے قائل ہیں، لیکن اگر متوقع قرض کی زکوٰۃ مالک اپنے موجودہ مال کی زکوٰۃ کے ساتھ ادا کر دے تو اس میں اس کے لیے بڑی آسانی ہے اس لیے کہ تجارتی قرض وقفے وقفے سے وصول ہوتا ہے تو ہر قرض کے وصول ہونے پر زکوٰۃ کا اہتمام

---

[1] رد محتار [2] شامی ۲/۲۶۔

کرنا ایک مشکل امر ہے، ابو عبید نے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت ابن عمرؓ اور جابر بن عبد اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے، اور تابعین میں سے حضرت جابر بن زید، مجاہد اور ابراہیم بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں، لیکن اگر قرض دو چار سال تک موصول نہیں ہوتا اور مالک اس کی زکوٰۃ بھی نہیں دیتا، تو ملنے کے بعد سنین ماضیہ کی زکوٰۃ دے گا، البتہ ایسا قرض جس کے ملنے کی امید نہیں ہے جو شریعت کی اصطلاح میں مال ضمار کہلاتا ہے اس کی زکوٰۃ وصولیابی کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی، ایام ماضیہ کی زکوٰۃ احناف کے نزدیک واجب نہیں۔

پراویڈنٹ فنڈ

ھ ـــــ "پراویڈنٹ فنڈ" کی زکوٰۃ وصول ہونے کے بعد سال گزرنے پر ادا کی جائے گی مدت ملازمت میں جب کردہ رقم ہماری ملک تام میں نہیں آتی اور اس کا کوئی فائدہ بھی ہم کو نہیں پہونچ رہا ہے تو اس کی مالی ذمہ داریاں بھی ہم پر عائد نہیں ہوتی، اور اس رقم کی مثال مال ضمار کی سی ہے، اس مال پر صاحب مال کی ملکیت ہے، لیکن اس سے کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا، اس کی زکوٰۃ بھی وصولیابی اور حولان حول کے بعد واجب ہوگی۔

"لا زکوٰۃ فی مال الضمار وھو ما لا یمکن الانتفاع بہ مع بقاء الملک[1]"

دوسری شرط "نما"

کونسا دین مانع زکوٰۃ ہے؟ جس دین کا مطالبہ من جہۃ العباد ہو دین مانع زکوٰۃ ہے، مہر مؤجل میں کا عورت کی طرف سے سالہا سال تک کوئی مطالبہ نہیں ہوتا وہ مانع زکوٰۃ نہیں، اس کے علاوہ دوسرے دیون مؤجلہ کے مانع زکوٰۃ ہونے میں مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ تینوں مسلک کے جمہور فقہاء کی آراء اثبات میں ہیں، معراج میں شرح طحاوی کے حوالے منقول ہے کہ مانع نہیں۔ امام ابو حنیفہ سے یہی مروی ہے، لیکن صدر الشہید کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں صاحب مذہب سے کوئی روایت نہیں، اور مانع ہونے اور نہ ہونے میں دونوں کی وجہ موجود ہے، اور قہستانی نے جواہر کے حوالے سے یہ اضافہ کیا ہے کہ صحیح یہ ہے کہ دین مؤجل مانع نہیں ہے، حکومت کی طرف سے ملنے والے طویل المیعاد قرضے بھی مؤجل ہوتے ہیں، لہٰذا ایک سال میں جو واجب الاداء

---

[1] درمختار۔

قسط سے ادا زکوٰۃ سے مانع ہوگی، اور بقیہ اقساط مانع نہیں ہوں گی۔

کمپنیوں پر زکوٰۃ

وجوب زکوٰۃ میں کمپنی کی مجموعی حالت کا اعتبار نہیں ہوگا، بلکہ شرکاء کی انفرادی حیثیت کا اعتبار ہوگا۔ ایک مسلمان کے حصے میں کمپنی کا جو حصہ آتا ہے اس میں جو مقدار محل زکوٰۃ ہے اگر وہ نصاب کو پہنچ جائے تو اس کی زکوٰۃ دی جائے گی، اور اگر وہ تنہا نصاب کو نہیں پہنچتی، لیکن حصہ دار کے پاس الگ سے نصاب موجود ہے، یعنی دونوں مل کر نصاب کو پہنچ جاتے ہیں تو وہ زکوٰۃ دے گا ورنہ نہیں۔ الغرض کمپنی کی زکوٰۃ اس کے ڈائرکٹر کو نہیں نکالنی چاہیے، بلکہ حصہ داروں کو اپنا حصہ معلوم کر کے خود اس ذمہ داری پر عمل درآمد کرنا ہوگا۔

ہیرے اور جواہرات کی زکوٰۃ

۱۔ــــــ خواتین جو آرائش کے لیے ہیرے اور جواہرات استعمال کرتی ہیں، اس کی ان پر زکوٰۃ نہیں، اسی طرح جو سرمایہ محفوظ کرنے کی نیت سے ہیرے جواہرات خرید کر اکٹھا کرتے ہیں، اصل طور پر ان پر بھی زکوٰۃ کو واجب نہیں کیا جا سکتا، لیکن ظاہر ہے اگر ان کا مقصد زکوٰۃ سے فرار حاصل کرنا ہوگا تو چاہے وہ اس حیلے سے اپنی زکوٰۃ بچالیں، مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں مواخذہ سے نہیں بچ سکتے۔

اموال تجارت پر زکوٰۃ

۲۔ــــــ اموال تجارت کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ مال جو تاجر خود تیار کرتا ہے اور دوسرے وہ مال جو بازار سے خریدتا ہے۔ دونوں قسموں پر دوران حول کے بعد بحولک قیمت فروخت کو بنیاد بنا کر زکوٰۃ نکالی جائے گی، یعنی زکوٰۃ نکالتے میں اصل سرمایہ اور اضافہ شدہ مال یعنی منافع دونوں ہی جوڑے جائیں گے۔ جمہور فقہاء کی یہی رائے ہے۔ اگرچہ ابن عباسؓ کی رائے میں فروخت ہونے تک انتظار کریں گے اور بقول ابو عبید قیمت خرید کا اعتبار ہوگا، لیکن جمہور فقہاء کی رائے راجح ہے جو اوپر مذکور ہوئی۔

شیرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

تجارتی کمپنیوں کے شیرز پر زکوٰۃ واجب ہوگی، کیوں کہ شیرز کمپنی میں لگے ہوئے مال تجارت کا ہی حصہ ہوتے ہیں جس طرح دوسرے اموال تجارت زکوٰۃ کا محل ہیں اسی طرح یہ شیرز بھی ہیں ان پر بھی زکوٰۃ نصاب کی مقدار کو پہونچنے کے بعد یا اپنے دوسرے مالوں کے ساتھ مل کر واجب ہوگی، شیرز کی مالیت کا تعین ادائیگی کے وقت بازار کے لحاظ سے ہوگا، کیوں کہ زکوٰۃ اصل مالیت اور منافع کے مجموعہ پر جاری ہوتی ہے۔

بونڈس ایک قرض ہے جو مالک اپنے اختیار سے کسی کمپنی یا حکومت کو دیتا ہے اور یہ قرض دین قوی کے قبیل سے ہے اس لیے تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب الاداء ہوگی، چاہے تو اپنے دیگر مالوں کے ساتھ سال بسال دیتے رہیں یا بونڈس کیش کرانے کے بعد گزرے ہوئے سالوں کی اکٹھا دیں۔

نصاب زکوٰۃ

چاندی اور سونے کے نصاب وہی نصاب بنیاد تسلیم کیا جائے گا جو انفع للفقراء ہو، بعض عرب علماء جیسے علامہ یوسف قرضاوی اور احمد عبدالعزیز المزینی اور دوسرے لوگوں نے بھی اس زمانہ میں سونے کے نصاب کو اصل قرار دیا ہے، استاذ ابو زہرہ، خلاف ابوحسن کی بھی یہی رائے ہے، علامہ یوسف قرضاوی تحریر فرماتے ہیں کہ ہماری رائے میں سونے کے نصاب کو اصل بنانا مبنی بر اعتدال و بلحاظ ... قوی ہے، ہم دیگر اموال کے نصاب کے ساتھ اس کا تقابل کرتے ہیں تو موجودہ زمانہ میں ہمیں سونے کا نصاب ہی ان سے قریب تر دکھائی دیتا ہے، آج پانچ اونٹ یا چالیس بکریوں کی قیمت تقریباً چار سو دینار[1] ہوتی ہے پھر کس طرح ممکن ہے کہ نقدی کی اتنی قلیل مقدار پر زکوٰۃ عائد کی جائے کہ جس سے ایک بکری بھی نہ خریدی جا سکے، علامہ یوسف قرضاوی کی اس دلیل سے ہمیں اتفاق نہیں، ممکن ہے کہ ان کے ملک میں چاندی بہت سستی ہو، اور بکریاں بہت مہنگی ہوں لیکن ہمارے ملک میں ساڑھے باون تولہ چاندی تقریباً پانچ ہزار روپے کے برابر ہوتے

---

[1] دینار (۲۰۰۵ء) کی قیمت کے اعتبار سے ۸۰ ہندوستانی روپے کے برابر ہوتا ہے۔

ہیں اور اتنے روپے میں دس بکریاں بآسانی خریدی جا سکتی ہے لہذا چاندی کو نصاب زکوٰۃ کے مسئلہ میں اصل حیثیت آج بھی حاصل ہوگی۔

مصارف زکوٰۃ

زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے جو شکل سوال میں تحریر کی گئی ہے وہ بہت موزوں اور واقعہ کے مطابق ہے صحیح ہے کہ مدرسہ کا سارا خرچ طلبہ کی خدمت یا متعلقہ انتظامی امور پر ہوتا ہے اس لیے سارے خرچ کو ماہانہ طلبہ پر تقسیم کر دیا جائے اور فقدر رقم یا چیک دیگران سے وصول کر لیا جائے، بہتر یہ ہے کہ وصول کی جانے والی رقم سے دس بیس روپے زیادہ ہی ان کو دیا جائے تاکہ مکمل طور پر تملیک کا اظہار ہو اور حیلۂ تملیک سے نجات مل جائے، اگر یہ طریقہ اہل مدارس قبول کریں تو زکوٰۃ دینے والوں اور مدارس کے ارباب اہتمام دونوں ہی صحیح طور پر اپنے اپنے فرائض منصبی سے بری الذمہ ہو جائیں گے۔

۲ ـــــ مدارس کے سفراء "والعاملین علیہا" کا مصداق نہیں ہیں۔ عامل وہ شخص ہے جس کو مسلمانوں کا امیر وصولی صدقات کے کام پر مامور کرے، جصاص کی احکام القرآن میں اس بات کی صراحت ہے:

"ھو الذی یبعثہ الامام لاخذ الصدقات"۔

مدارس کے ذمہ داران امام نہیں اور ان کے متعین کیے گئے ہر شخص کو جبری وصولی کا اختیار بھی نہیں ہے؛ سفراء کے تقرر اور تنخواہ کے سلسلہ میں دو صورتیں ہیں۔ پہلی دیگر کام کرنے والے ملازمین کی طرح باقاعدہ ماہانہ تنخواہ پر سفیر رکھے جائیں، یا اگر مدرسین ہی سے چھٹیوں میں کام لیا جا رہا ہے تو ان کی تنخواہ ڈبل کر دی جائے پھر ادارہ اپنے حالات کے اعتبار سے ان میں نشاط پیدا کرنے کے لیے مزید سہولیات مثلاً سفر خرچ اور انعام و اکرام وغیرہ دے سکتا ہے، اس سے آمدنی میں اضافہ کا امکان بھی بحال رہے گا اور بے اعتدالی نہیں پیدا ہوگی، کمیشن پر چندہ کرنے سے میں اتفاق نہیں، اگرچہ موجودہ حالات میں ہر کاروبار میں کمیشن کا رواج ہو جانے سے اسے جہالت اجرت مفضی الی النزاع کا درجہ نہیں دیا جا سکتا، لیکن اس لائن سے دوسری بے اعتدالیاں پیدا ہونے کے شدید امکانات ہیں۔ کمیشن کی اجازت کے بعد سب سے بڑا مسئلہ اس کی تحدید کا پیدا ہوگا، بعض چھوٹے مدارس میں پچاس فیصد کمیشن طے کر کے سفراء کا کام نہیں چلے گا اور بڑے مدارس میں پانچ فیصد کمیشن پاکر ایک مہینہ میں پچاس ہزار کے مستحق ہو سکتے ہیں۔

فی سبیل اللہ

فی سبیل اللہ کے موضوع پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں محسوس ہو رہی ہے۔ قرآن کے اولین مخاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب ہیں ان کے علوم کے امین اور محافظ تابعین اور تبع تابعین ہیں۔ یہ تینوں ادوار مشہود لہا بالخیر ہیں جس چیز پر متفق ہیں ان سے تجاوز کرنا ایک بڑے خطرہ کا پیش خیمہ ہے آج ہم میں تقویٰ، خشیت الٰہی کا فقدان ہے۔ اگر آج خدانخواستہ فی سبیل اللہ پر یہ بندش نہ رہے اور اسے ختم کر دیا گیا اور صحابہ، تابعین کی فہم سے صرف نظر کیا گیا، تو ہر کس و ناکس فی سبیل اللہ کے نام سے صدقات کھائے گا اور وصول کر کے ذخیرہ کرے گا۔ مستحق افراد یا اداروں کے لیے آج بھی راستے کھلے ہیں اور جو ادارے یا ادارہ فی الحقیقت کام کر رہا ہے وہ منتظمین اس کی کفالت فرما رہے ہیں، پہلے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ ادارے اپنے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، لیکن ان اداروں کی ضروریات کو سامنے رکھ کر اگر فی سبیل اللہ میں توسیع کی گئی تو بدنیت اور شرپسند عناصر اس کا غلط استعمال کریں گے۔ آج بھی کرتے ہیں لیکن چھپ کر، اور علماء کی تصدیق کے بعد علی الاعلان کریں گے۔ اس لیے فی سبیل اللہ کے بارے میں میرا موقف وہی ہے جو صحابہ اور تابعین اور ائمہ مجتہدین کا ہے۔

(فقط واللہ اعلم بالصواب)

"يقومها بما هو انفع للمساكين احتياطا لحق الفقراء"[1]

فخر الدین عثمان بن علی زیلعی لکھتے ہیں:

"ويعتبر فيهما الانفع ايهما كان انفع للمساكين"[2]

فتاویٰ ہندیہ میں ہے:

"يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء قدرا ورواجا"[3]

۲ —— دوسرا اصول یہ ہے کہ تقویم میں تخییر کے باوجود اعتبار اس کا ہوگا، جس سے نصاب کی تکمیل ہو سکے —— بنایہ میں ہے:

"لابد ان يقوم بما يبلغ نصابا حتى اذا قومت بالدراهم تبلغ نصابا واذا قومت بالذهب لا تبلغ نصابا يقوم بالدراهم وبالعكس كذالك"[4]

بحر الرائق میں ہے:

"وفي النهاية لو كان تقويمه باحد النقدين يتم النصاب وبالآخر لا فانه يقومه بما يتم به النصاب بالاتفاق .... فقد قال في الظهيرية رجل له عبد للتجارة ان قومه بالدراهم لا تجب فيه الزكوة وان قومه بالدنانير تجب فعند ابي حنيفة يقومه بما تجب فيه الزكوة دفعا لحاجة الفقير وسد الخطيئة"[5]

اور آخر میں ساری بحثوں کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فالحاصل ان المذهب تخييره الا اذا كان لا يبلغ باحدهما نصابا تعين التقويم بما يبلغ نصابا"[6]

درمختار میں ہے:

"ولو بلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به"[7]

صاحب ہدایہ اور کچھ دوسرے فقہاء کا رجحان یہ ہے کہ یہ دونوں اصول الگ الگ نہیں بلکہ

---

[1] ہدایہ، باب زکوۃ الاموال ج ۱/۱۹۵ [2] تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق ۱/۲۷۹ [3] فتاویٰ ہندیہ ۱/۱۷۹ [4] بنایہ علی ہامش ہدایہ ۱/۱۰۵ [5] بحر الرائق لابن نجیم ۲/۲۲۹ [6] ایضاً [7] درمختار ۲/۳۱۔

ایک ہی ہے اور انفع للفقراء کا مطلب یقومہا بما یبلغ بہ نصابا ہے[1]۔

تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق میں ہے:

"واشار الا انفع مذهب ابی حنیفة رحمہ اللہ یقوم بہا یبلغ نصابا"[2]

شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہیں:

"وعن ابی حنیفة رحمہ اللہ تعالیٰ فی الامالی انہ یقومہا بالانفع النقدین للفقراء"[3]

بہرکیف ان دونوں اصولوں کے ساتھ اصل نصاب کی تعیین میں ایک اور بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ کہ چاندی کا نصاب متفق علیہ ہے، اور اس سلسلے میں واضح احادیث موجود ہیں،

بدایۃ المجتہد میں ہے:

"فانہم اتفقوا علی انہ خمس اواق لقولہ علیہ السلام الثابت لیس فیما دون خمس اواق من الورق صدقۃ"[4]

اس کے برعکس سونے کے نصاب میں کافی اختلاف ہے جس کے اسباب کا ذکر کرتے ہوئے صاحب بدایۃ المجتہد لکھتے ہیں:

"وسبب اختلافہم فی نصاب الذهب انہ لم یثبت فی ذالک شئ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم کما ثبت ذالک فی نصاب الفضۃ"[5]

سوالات کے جوابات

۱۔۔۔۔ ان اقتباسات اور مباحث کی روشنی میں میرا خیال ہے کہ اصل نصاب چاندی کو قرار دیا جائے اس لیے کہ:

(الف)۔۔۔۔ یہ فقراء کے لیے زیادہ نفع بخش ہے۔

(ب)۔۔۔۔ سونے کی بہ نسبت سستی ہونے کی وجہ سے نصاب کی تکمیل آسانی سے ہو سکتی ہے۔

---

[1] ھدایۃ، ۱/۱۹۵ [2] تبیین الحقائق شرح کنز الدقائق، ۱/۲۷۹ [3] مبسوط، ۲/۱۹۱، بدائع، ۲/۲۱
[4] و [5] بدایۃ المجتہد، ۱/۱۹۹۔

(ج) ـــــ اس کا نصاب صحیح حدیث سے ثابت ہے اور فقہاء سب کے سب متفق ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

زیادہ سے زیادہ چاندی کے نصاب کو اصل تسلیم کرنے میں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس میں مالدار کی رعایت نہیں کی گئی ہے۔ حالانکہ معاملہ قطعًا ایسا نہیں ہے صاحب فتح القدیر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

"ان المال کان فی ید المالک ینتفع بہ زمانا طویلا فلا بد من اعتبار منفعۃ الفقراء عند التقویم" [1]

بنایہ میں لکھا ہے:

"المالک اسقط حقہ بالاستمرار مدۃ الحول فیظہر منفعۃ الفقراء بالتقویم بالانفع مراعاۃ الحقین بقدر الامکان" [2]

معاصر علماء کی آراء

دوسری فقہی سیمینار میں کرنسی نوٹ کی زکوٰۃ پر معاصر علماء نے جو کچھ لکھا تھا اور جو فیصلے ہوئے تھے اس کا حاصل بھی یہی تھا کہ اصل نصاب چاندی کو مانا جائے، چنانچہ مولانا خالد سیف اللہ لکھتے ہیں:

"احکام زکوٰۃ میں یہ بات متفق علیہ ہے کہ جس پہلو میں فقراء کا فائدہ ہو اس کو اختیار کیا جائے، اس لئے زکوٰۃ کی حد تک ان سکوں اور نوٹوں کے لیے اصل چاندی ہی ہوگی اور اتنی رقم کا مالک ہونے پر جس سے چاندی کا نصاب خرید کیا جائے زکوٰۃ واجب ہوگی" [3]

مولانا عبدالرحیم لاجپوری کا بھی خیال یہی ہے کہ:

"جتنے روپے میں ساڑھے باون تولہ چاندی خریدی جا سکے اتنے روپے کے مالک کو صاحب نصاب قرار دیا جائے گا" [4]

---

[1] فتح القدیر ۲۲۶/۱ [2] بنایہ علی هامش هدایة ۱۶۹/۱ [3] جدید فقہی مسائل ۲۴/۱ [4] فتاویٰ رحیمیہ ۲۲۳/۶۔

نصابِ زکوٰۃ

از ——— مولانا افضل حسین (بستی) ———

اس زمانے میں جب کہ چاندی سونا کے مقابلے میں بہت ہی سستی اور سونے کی قیمت بہت زیادہ ہے، لہٰذا نقد روپیہ یا مال تجارت وغیرہ میں چاندی کا نصاب تو جلد تیار ہو جائے گا اور سونے کا نصاب کافی نقد یا تجارتی مال کے زیادہ ہونے پر تیار ہوگا، کتب فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے، کہ مال میں زکوٰۃ واجب ہونے کے لیے وہ نصاب معتبر ہے جو انفع للفقراء ہو اور ظاہر ہے کہ چاندی کا نصاب جلد تیار ہو جانے کی وجہ سے فقیروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے کیوں کہ ساڑھے باون (۵۲½) تولہ چاندی کے بقدر مال جب کہ سال گزر گیا ہو اور ضرورت اصلیہ سے فارغ ہو، زکوٰۃ واجب ہونے پر فقیروں کو نفع پہونچے گا، برخلاف سونے کے نصاب کے کہ اگر اس کا اعتبار کیا جائے تو بہت کم صورتوں میں (یعنی جس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا کے بقدر مال ضرورت اصلیہ سے فارغ ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو) زکوٰۃ واجب ہو سکے گی، کیوں کہ ساڑھے سات تولہ سونا کی قیمت آج کل کے نرخ کے اعتبار سے تقریباً تیس ہزار (۳۰۰۰۰) روپے ہوگی، پس اگر سونے کے نصاب کو اصل قرار دیکر اسی کا اعتبار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے پاس تیس ہزار نقد روپے ضرورت اصلیہ سے فارغ ہوں یا اس کے بقدر مال تجارت ہو اور اس پر سال بھی گزر گیا ہو تو زکوٰۃ واجب ہوگی جو فقیروں کے لیے کسی طرح بھی نفع بخش نہیں ہے، اور اگر چاندی کے نصاب کو اصل قرار دیکر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے تو تقریباً ۴ ہزار نقد روپے یا اس کے بقدر مال تجارت ہونے پر زکوٰۃ واجب ہو جائے گی، پس

چاندی کے نصاب کو اصل قرار دینے میں زکوٰۃ جلد واجب ہوتی ہے اور سونے کے نصاب کو اصل قرار دینے میں زکوٰۃ دیر سے واجب ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں نصاب نقدین میں سے اس سے بنایا جائے گا جو فقیروں کے لیے انفع ہو۔

رہی بات اس کی کہ نقدین میں سے کونسا نصاب اصل ہے تو دونوں نصاب اصل ہیں مگر اس زمانے میں اعتبار چاندی کے نصاب کا کیا جائے گا۔ ہاں اگر پھر وہی زمانہ لوٹ آئے کہ بیس مثقال سونے کی قیمت وہی ہو جائے جو دو سو درہم کی قیمت ہے، تو اختیار رہے گا چاہے جس کو نصاب بنالیا جائے گا۔

"او عرض تجارة قيمته نصاب من ذهب او ورق مقوما باحدهما ان استويا فلو احدهما اروج تعين التقويم به ولو بلغ باحدهما نصابا دون الآخر تعين ما يبلغ به ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا وبالآخر اقل قومه بالانفع للفقير"[1]

اس عبارت میں انفع للفقیر کی رعایت یہاں تک کی گئی ہے کہ اگر نصاب دونوں سے بن جاتا ہے مگر ایک کیساتھ تقویم سے نصاب اور خمس نصاب بن جاتا ہے، اور دوسرے سے صرف نصاب یا نصاب اور خمس نصاب سے کم بنتا ہے جس نقد کے ساتھ تقویم سے نصاب اور خمس نصاب بنتا ہو اسی سے قیمت لگا کر زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ (ولو بلغ باحدهما نصابا وخمسا) کے تحت شامی نے اس کی تصریح کی ہے:

"بيان لما في النهر عن السراج لو كان بحيث لو قومها بالدراهم مائتين واربعين وبالدنانير ثلاثا وعشرين قومها بالدراهم لوجوب ستة فيها بخلاف الدنانير فانما يجب فيها نصف دينار وقيمته خمسة ولو بلغت بالدنانير اربعة وعشرين وبالدراهم ثلاثمائة وثلاثين قومها بالدنانير"

معلوم ہوا انفع للفقیر کی رعایت ہر صورت کی جائے گی، پس چاندی اور سونے کے نرخ میں تفاوت چاہے جتنا ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل کی حیثیت رکھتے ہیں مگر اس زمانہ اموال کے اندر چاندی کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا۔

"مقوما باحدهما" کے تحت علامہ شامی نے تصریح فرمائی ہے کہ اموال کی قیمت لگانے کا اختیار

---

[1] درمختار علی الشامی قدیم ج۲ ص۲۲۔

اس وقت ہے جب کہ سونا چاندی دونوں برابر ہوں (یعنی نصف دینار برابر پانچ درہم کے ہو) لیکن اگر دونوں کے نرخ میں تفاوت ہے تو پھر اعتبار انفع کا ہوگا۔ (ای انفع للفقیر لا انفع لصاحب المال)

"قال ومحل التخییر اذا استویا فقط واما اذا اختلفا قوم بالانفع"۔

صاحب بحر نے بھی اس کی تصریح ان لفظوں میں فرمائی ہے:

"وفی عروض تجارۃ بلغت نصاب ورق او ذھب قال بعدہ انہ یجب ربع العشر فی عروض التجارۃ اذا بلغت نصابا من احدھما وقال بعد عدۃ سطور واشار بقولہ ورق او ذھب الی انہ مخیر ان شاء قومھا بالفضۃ وان شاء بالذھب لان الثمنین فی تقدیر قیم الاشیاء بھما سواء وفی النھایۃ لو کان تقویمہ باحد النقدین یتم النصاب وبالآخر لا فانہ یقومہ بما یتم بہ النصاب بالاتفاق" ؎

بہرحال اصل مذہب تخییر کا ہے یعنی نصاب چاہے چاندی کو قرار دے کر اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرے چاہے تو سونے کے نصاب کو مان کر زکوٰۃ ادا کرے، لیکن یہ اختیار اس وقت تک ہے جب کہ نصاب دونوں نقدوں سے بن جاتا ہو، اور اگر نصاب کسی ایک سے بنتا ہے اور دوسرے سے نہیں بنتا تو تقویم ذی نصاب سے متعین ہو جائے گی، جیسا کہ اس کی تصریح درمختار کی عبارت سے آ چکی ہے، صاحب بحر نے بھی اس موقع پر اس کی تصریح ان الفاظ میں فرمائی ہے:

"فالحاصل ان المذھب تخییر الا اذا کان لا یبلغ باحدھما نصابا تعین التقویم بما یبلغ نصابا وھو مراد من قال یقوم بالانفع ولذا قال فی الھدایۃ وتفسیر الانفع ان یقومھا بما یبلغ نصابا"۔

"انفع" کی تفسیر سے متعلق ایک جزئیہ درمختار کا بھی گزرا ہے کہ اگر نقدین میں ایک کے ساتھ تقویم سے مال نصاب تک پہونچتا ہے اور دوسرے سے نصاب اور خمس تک پہونچتا ہے تو ایسی صورت میں انفع یہ دوسری صورت ہوگی، کیوں کہ خمس نصاب سے کم میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک واجب نہیں ہوتی لیکن جب خمس نصاب بعد تکمیل نصاب ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ اسی اعتبار سے واجب ہوگی، اس صورت

ؔ بحر الرائق ص ۲۲۸-۲۲۹ ج ۲۔

ظاہر ہے اس نقد کے ساتھ تقویم پر دوسرے کے مقابلے میں زکوٰۃ زیادہ نکلے گی جو فقیروں کے لیے زیادہ نفع بخش ہے، بہرحال اس جزئیہ سے یہ بات صراحۃً پائی اور سمجھی جاتی ہے کہ جب انفع کا اعتبار بعد تکمیل نصاب بھی کیا جائے گا تو نصاب بنانے وقت کیوں اس کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔ ضرور کیا جائے گا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص (جو کہ دونوں نصابوں کا مالک ہے) ایک نصاب کو دوسرے نصاب کے ساتھ ملا کر کل زکوٰۃ سونے سے یا چاندی سے ادا کرنا چاہتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے البتہ اس کا لحاظ ضرور کرنا ہوگا کہ جس کے ساتھ ملانے سے فقیروں کو زیادہ نفع ہو اس کے ساتھ ملایا جائے گا، پس جس کے ساتھ ملانے سے زکوٰۃ زیادہ نکلتی ہو اس کے ساتھ ملا کر دونوں کی زکوٰۃ ادا کرے۔

"ولو ضم احد النصابين الى الاخرى حتى يؤدي كله من الذهب او من الفضة لا بأس به لكن يجب ان يكون التقويم بما هو انفع للفقراء قدراً ورواجاً والا فيؤدي من كل واحد ربع عشره كذا في محيط السرخسي. عالمگیری ج۱

"وايضاً فسّر التقويم صريح بالتخيير يقوم بما شاء من الدراهم عند عدم التفاوت لا تبلغ باحدهما نصاباً وبالاخرى تعين التقويم بما يبلغ نصاباً كذا في البحر الرائق."

خلاصۂ بحث

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ سونے چاندی کے نرخ میں چاہے جتنا تفاوت ہو جائے دونوں نصاب اپنی جگہ پر اصل ہیں، مذکورہ جزئیات سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اموال کی تقویم میں تخییر اس وقت ہے جب کہ دونوں قیمت میں برابر ہوں (یعنی نصف مثقال برابر پانچ درہم کے ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تھا) پس اگر تفاوت نرخ کی وجہ سے ایک ساتھ تقویم میں نصاب تک نہیں پہونچتا اور دوسرے سے پہونچ جاتا ہے تو دوسرے ہی سے قیمت لگانی ضروری ہوگی۔

لہٰذا نصاب حرمت زکوٰۃ بھی اور اسی طرح نصاب موجب زکوٰۃ کی کم سے کم مقدار چاندی کے نصاب سے مقرر کی جائے گی۔

واللہ اعلم بالصواب۔

زکوٰۃ

از ——— حضرت مولانا محمد افضال الحق صاحب مہتمم دارالعلوم گورکھپور

سوال ۱ ——— کا جواب، ملک تام :

(الف) ——— اگر وہ رمضان کو سال تام کا حساب بنایا ہے تو ان کی تجارت کو موجودہ مالیت پر زکوٰۃ ہے یا مال پر ہے۔

(ب) ——— آپ نے جو رقم مثلاً بیع سلم کے لیے کسی کو دیدی ہے اور طے کر لیا ہے کہ وہ آپ کی نہیں بلکہ فریق ثانی کی رقم ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر واجب نہیں، اگر قرض دیا ہوتا تو آپ کی رقم ہوتی، مگر ادائیگی کی ہے تو اس کا مال ہے، جس کو دیا ہے۔

(ج) ——— جو مال آپ نے بیع سلم میں مثلاً خرید لیا ہے اور ابتک آپ کے قبضہ میں نہیں آیا ہے، اس کی زکوٰۃ آپ پر اس لیے واجب نہیں کہ آپ کا قبضہ نہیں صرف ملکیت ہے، ملکیت اور قبضہ دونوں ضروری ہے زکوٰۃ کے لیے۔

سوال ۲ ——— ڈپازٹ وغیرہ، یہ رقم آپ کی ہے مگر آپ کا قبضہ نہیں ہے اس لیے زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب رقم آپ کے ہاتھ میں آجائے گی، ہاں اگر آپ کے پاس جمع کرنے کا ثبوت پکا ہے تو احتیاطاً ادا کر سکتے ہیں آج ہی۔

سوال ۳ ——— مہمل سوال ہے، کیوں مدرسہ کا مہتمم یا ناظم بیت المال کی رقم کا صرف امین اور وکیل ہے جو خرچ کر سکتا ہے، نہ وہ مالک ہے نہ زکوٰۃ وغیرہ کی جمع شدہ رقم کسی کی ملک ہے وہ تو مال موقوفہ ہے اس لیے غیر متعلق سوال ہے۔

سوال ۴ ——— یہ عجیب سوال ہے، مال حرام کا کمانا، وصول کرنا، رکھنا سب حرام

جس کو واپس کرنا یا کسی غریب کو دے کر بری الذمہ ہونا واجب ہے پھر اس کی زکوٰۃ کی کیا بحث۔ زکوٰۃ تو تملیک پر ہے اور مال حرام شرعاً کالعدم ہے، کیونکہ وہ غاصب ہے آج بھی مالک وہی ہے جس کا مال لیا ہے، کیا ایسے غاصب کا قبضہ ہے ملکیت نہیں ہے، زکوٰۃ کیسی ؟

۱ ـــــــ اگر حلال مال، حرام مال مخلوط ہے تو حلال کا حساب کر کے زکوٰۃ دے گا، ورنہ تخمینہ کرے گا، جیسے بھی کرے۔

۲ ـــــــ حرام کی یا حلال کی کثرت وقلت یا غلبہ کا کوئی اعتبار نہیں کیونکہ وہ حرام ہے تو شرعاً کالعدم ہے، اعتبار کیسے ہوگا۔

۳۔ اگر حرام وحلال میں تمیز مشکل ہے تو زکوٰۃ کا سوال ہی کیوں پیدا ہوگا ایسی کمائی والے کے یہاں۔

سوال ـــــــ جو قرض دیا گیا ہے وہ ملک آپ کی ہے مگر قبضہ مدیون کا ہے اب اگر دینے کا ثبوت ہے اور مدیون کو انکار نہیں ہے تو واپسی کے بعد پوری مدت کی زکوٰۃ واجب ہے اور اگر ثبوت کم ہے یا مدیون کو انکار ہے یا مال مفقود ہے تو شرعاً وہ مال ضمار ہے، حدیث میں ہے "لا زکوٰۃ فی الضمار" اب اس کی زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ قرض واپس ہوگا یا مال مل جائے گا اور از سر نو واجب ہوگی، یہ ہے شرعی رحم دلی۔

۱ ـــــــ مدیون کے مال مشغول ہے وہ گنہگار ہے اس کے انکار سے آپ پر زکوٰۃ لازم نہیں ہوگی کیونکہ قبضہ نہیں ہے اور ثبوت بھی کمزور ہے، اصول زکوٰۃ کے لیے ملکیت اور قبضہ دونوں ضروری شرطیں ہیں، دونوں سے مل کر ملکیت تام ہوگی۔

سوال ـــــــ پی فنڈ میں آپ کی تنخواہ سے جو رقم جمع ہو رہی ہے وہ آپ کی ملک ہے مگر قبضہ نہیں ہے، قبضہ سرکار کا ہے لہذا اس کے بعد ہی قبضہ ہوگا اور زکوٰۃ ہوگی، پوری مدت کی زکوٰۃ۔

۲ ـــــــ سرکار نے جب رقم کے لوٹانے کا وعدہ کیا ہے وہ نہ آپ کی اب تک ملک ہے نہ قبضہ، جب ہوگا تب زکوٰۃ شروع ہوگی، اور حولان حول کے بعد ہوگی۔

۳ ـــــــ اور سود کی جو رقم ملے گی وہ آپ کی ہو نہیں سکتی ہے اسے غریبوں کو تقسیم کر دیجئے ہرگز نہ رکھئے زکوٰۃ کا سوال ہی نہیں۔ کیونکہ مال حرام کالعدم ہے۔

دوسری شرط نمو ہے

یہاں مال صرف تین ہیں۔ ثمن ___ چوپائے ___ سامان تجارت ___
مال کی تین قسمیں ہیں:

۱ ___ تو سونا چاندی شرعاً ثمن ہیں، لین دین کے لیے قدرت نے اس کو بنایا ہی ہے اس لیے ان پر زکوٰۃ واجب ہے، شرطیکہ قبضے میں ہو، مال مفقود یا مال قمار نہ ہو۔

۲ ___ جانور اگر نر مادہ دونوں ہوں، چرائی پر گزر بسر کرتے ہوں تو ان میں نمو ہوگا۔ ان پر ایک خاص نصاب ہو تو زکوٰۃ واجب ہے، تفصیل کے لیے فقہ دیکھیے۔

۳ ___ مال تجارت چاہے کوئی سامان ہو، مٹی سے ہیرے تک ان کی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، اور پورا سال گزرنے کے بعد ہوگی تاکہ بھاؤ کے اتار چڑھاؤ سے ان کی مالیت کا نمو ممکن ہو سکے۔

تیسری شرط حاجت اصلیہ سے فارغ ہونا ہے

سوال ___ انسان کی بنیادی ضرورتیں شرعاً ۹ ہیں اگر وہ پوری ہو جائیں تو مسلمان غنی ہے ورنہ فقیر اور قابل امداد ہے۔

اول ___ نفقہ یعنی کھانے پینے کے لیے غلہ، دال، نمک، گوشت، ترکاری وغیرہ سال بھر مہیا کر سکے۔

دوم ___ سکنیٰ، اپنی حیثیت اور ضرورت کے مکان پر یا مالکانہ حقوق حاصل ہوں خواہ مکان ہو یا کوٹھی یا چھپر ہے سامان زندگی یا کرایہ کا مکان ہو۔

سوم ___ سواری، گھوڑا، گدھا، ہاتھی، موٹر، سائیکل حسب حیثیت حسب ماحول مع ضروریات و توابع۔

چہارم ___ نوکر، چاکر یا لونڈی، اگر خوش حال گھرانہ ہو یا ڈرائیور وغیرہ جو موٹر چلا سکے۔

پنجم ___ آلات معاش، مثلاً کسان کے لیے کھیتی کے سامان، لوہار، بڑھئی، ڈاکٹر، انجینئر وغیرہ کے کاروباری سامان جن کے بغیر معاشی مسائل کا حل نہ ہو سکتا ہو۔

ششم ــــــ اپنے لیے بچوں کے لیے پہننے، اوڑھنے، بچھانے کے وہ سامان جو ہر موسم کو جھیل سکیں۔

ہفتم ــــــ بچوں کی پڑھائی یا تربیت کے سامان اور صاحب علم ہو تو اچھی لائبریری کی ضرورت

ہشتم ــــــ اس پر کسی کا قرض نہ ہو، اتنا قرض جو اس کی بچت کی رقم کو منہا کر دے یا نصاب نہ پورا ہونے دے۔

نہم ــــــ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے باوجود اگر بچت کی رقم ہے اور وہ رقم پورے سال تجارت میں یا بینک میں یا تجوری میں یا کہیں محفوظ رہ گئی ہے، اور اس کی مقدار، نصاب زکوٰۃ کے برابر ہے تو اس کی رقم پر ۲ ½ فیصدی زکوٰۃ واجب ہوگی کہ کسی مستحق کو دیدی جائے۔

چوتھی شرط دین سے محفوظ ہونا

ترکٹر، کسان کے لیے آلات زراعت میں ہے وہ اگر ایک لاکھ کا ہے تب بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

الف ــــــ جو قرض لیا گیا ہے اس سے حاجت اصلیہ پوری کر رہا ہے اگر اس کے پورے کاروبار پر وہ دین جاری ہے تو بچت کی رقم کے بغیر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ب ــــــ فیکٹری اور کارخانے کے لیے جو قرض لیا گیا ہے وہ قرض اگر تجارت کی لاگت سے زائد ہے تو زکوٰۃ واجب نہیں، اگر بچت اس سے فاضل ہے اور نصاب کے برابر ہے تو واجب ہے۔

ج ــــــ اگر کاروبار کی لاگت ۲ کروڑ ہے اور قرض ا کروڑ تو حاجت اصلیہ سے فاضل مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور جب دس لاکھ کی قسط ادا کر دے گا تو ایک کروڑ دس لاکھ کی زکوٰۃ دے گا پھر بیس لاکھ کی اسی طرح چلتا رہے گا۔

د ــــــ اگر ایک کروڑ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو کوئی زکوٰۃ نہیں، وہ قرض اور اس کا سود اس کی لاگت کو کھا جائے گا، بچت کا سوال ہی نہیں ہوگا، اس سے غنی نہیں ہو سکتا۔

ہ ــــــ اگر پچاس لاکھ کی لاگت ہے اور ایک کروڑ قرض تو قسط اور سود سے اس کا کاروبار مکان اور جائداد کوئی محفوظ نہیں رہے گا، بہرحال خدا اس پر رحم کرے اس مالدار فقیر پر۔

کمپنی اور کارپوریشن پر زکوٰۃ

زکوٰۃ کے مخاطب وہ مسلمان ہیں جو مالک نصاب ہیں، اس لیے جس کمپنی کو آپ لوگ ایک کروڑ کی لاگت سے چلا رہے ہیں، اس کے جس حصہ دار کے حصے یا جس انداز کی رقم نصاب کو پہنچ جائے گی اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، مشترک سرمایہ پر زکوٰۃ نہیں ہوتی، ذاتی مال پر ہوتی ہے۔

اہم اصول

۱۔ زکوٰۃ کا مدار ملکیت پر ہے جو ذاتی ہو، پس انداز ہو یا ضروریات سے فارغ ہو، اور پورے سال کا ہر موسم جھیل چکی ہو پھر بھی موجود ہو اور آپ کے قبضے میں ہو۔

۲۔ ہیرے جواہرت اگر مال تجارت ہیں تو ملکیت پر زکوٰۃ ہے ورنہ کوئی زکوٰۃ نہیں۔

کما قال صلی اللہ علیہ وسلم۔

اموال تجارت

سال پورا ہوا تو آپ کی دوکان میں جو مال ہے اس کی لاگت پر زکوٰۃ ہوگی پھر جب وہ فروخت ہوگا تو پتہ چلے گا کہ لاگت کیا تھی، نفع کیا ہوا۔ آج تک فروخت نہیں ہوا آپ کی لاگت والا مال ہے اس پر زکوٰۃ ہے۔

۱۔ آپ کی لاگت جتنی ہے اس پر زکوٰۃ ہے خواہ تبرک ہو یا چھلکر جیسی حیثیت ہو یا جیسی مالیت۔ مال کی تھوک یا خوردہ قیمت کا نہیں بلکہ جتنے میں وہ مال باربرداری کے بعد آپ کو پڑا ہے اس لاگت سے مالیت نکال کر زکوٰۃ دی جائے گی، پھر اس مالیت کو فروختگی میں نفع کی بنیاد بناتے ہیں۔

۲۔ جو زمین کا کاروبار کرتے ہیں، سال ختم ہونے پر جتنی زمین ان کے قبضے میں ہے اس کی لاگت والی مالیت پر زکوٰۃ ہوگی، کیوں کہ اس کے قبضے میں رہی ہے، قوت خرید سے خریدار کو رغبت ہے بائع کو نہیں یہ معاملہ صرف بائع کی ذاتی حیثیت کا ہے جو اس وقت موجود ہے۔

حصص کی زکوٰۃ

۱۔۔۔۔۔ آپ نے کسی کمپنی کے جو حصے خریدے ہیں وہ آپ کی ملکیت ہیں مگر آپ کے قبضے میں نہیں ہیں، لہٰذا اس پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوگی جب وہ حصہ واپس ہوگا یا اس کا بدل یا نفع ملے گا تو جتنا قبضے میں آئے گا، اتنی رقم اگر نصاب کے برابر ہے تو زکوٰۃ دیں گے ورنہ نہیں۔

۲۔۔۔۔۔ حصص کی جو بھی قیمت آپ کو مل جائے گی، اس کے تناسب سے زکوٰۃ ہوگی اگر گھٹے گی تو کم پر زیادہ ملی تو زیادہ پر۔ فرق یہ ہوگا کہ حصص آپ کے اصل پونجی کے اور اس کی کمی بیشی کا نام نفع نقصان ہوگا مگر اس کا اعتبار رقم کی واپسی پر ہوگا، چنانچہ بمبئی کا اسکنڈل اور لندن کے بینک کا اسکنڈل گواہ ہے کہ حصص کا اعتبار اس وقت ہوگا جب وہ حصہ دار کے قبضے میں آجائیں، یہ اصول بہت وسیع ہے۔

بانڈ

جس رقم کو میں نے دیا ہے اور بینک نے یا سرکار نے مجھے مدتی بانڈ عطا کر دیا ہے یہ بانڈ نوٹ نہیں ہے، نقد نہیں ہیں، بلکہ سرکاری رسید ہیں کہ تمہارا مال ہمارے مال میں ہے اس لیے وہ رقم جو آپ کے قبضے میں نہیں ہے، اس پر آج زکوٰۃ واجب نہیں، اس وقت واجب ہوگی جب بانڈ کیش ہو جائے گا اور ان تمام سالوں کی واجب ہوگی، جتنے سال سرکاری تحویل میں وہ رقم رہی ہے، وجہ وہی ہے کہ ملک تام نہیں، کیونکہ قبضہ نہیں ہے۔ اور چونکہ آپ کے پاس بھی رسید ہے، اور سرکار کو انکار نہیں، اس لیے وہ مال ضمار بھی نہیں ہے، اس لیے پوری مدت کی زکوٰۃ ہوگی۔

محور ثانی

نصابِ زکوٰۃ

سوالات کے جوابات

شرعاً چاندی اور سونا دونوں ثمن ہیں اور آپ کے ماننے نہ ماننے کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ وہ ثمن خلقی ہی رہیں گے، اس لیے:

الف۔۔۔۔ اگر کسی کے پاس صرف چاندی ہے تو ۲۰۰ درہم سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہونچے حساب ہی سے گا۔

ب۔۔۔۔ اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے تو ۲۰ مثقال سے نصاب شروع ہوگا، جہاں تک پہونچے۔

ج۔۔۔۔ اگر دونوں میں سے کسی کا نصاب مکمل نہیں ہے تو دونوں کو وزن یا قیمت کے لحاظ سے دیکھیں گے۔ اگر کوئی نصاب مکمل ہو جاتے ہیں تو زکوٰۃ واجب ہوگی نہیں تو نہیں ہوگی۔

د۔۔۔۔ رہا مال تجارت تو اگر کسی تاجر کے پاس اس کی حاجت اصلیہ سے فاضل جو مالیت کے وہ ۲۰۰ درہم سے زائد ہے تو وہ غنی ہے اس پر شرائط کے بعد زکوٰۃ واجب ہوگی، لیکن اگر مال تجارت کی قیمت ۲۰۰ درہم سے کم ہے تو وہ مسلمان شرعاً فقیر ہے زکوٰۃ اس کو دیا سکتی ہے، اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

ہ۔۔۔۔ ایسا اس لیے ہے کہ فقیروں کے لیے یہ مفید ہے کہ چاندی کا نصاب مان لیا ہے ورنہ سونے کو محور بنایا جائے گا، تو تاجروں کو تھوڑا نفع اور مل جائے گا، مگر فقیروں کا نقصان ہوگا اور یہ فرق صرف ابتدا کرنے میں ہے کہ کہاں سے شروع کیا ہے ورنہ جب شروع ہوگیا تو ہر مالک نصاب دوسرے کے برابر ہے۔

و۔۔۔۔ سونے چاندی کی زکوٰۃ کا مسئلہ ہر مسلمان سے متعلق ہے خواہ ہمالیہ کی ترائی

کا ہو یا امریکہ کے بازار کا ۱۹۹۲ء کا ہو یا ۲۰۰۳ء کا۔ دوسرے یہ کہ من موہن سنگھ نے جو پالیسی اختیار کی ہے اس کے سونے کی وہ برتری خاک میں مل جائے گی، جو ہندوستان میں اس کو حاصل ہو گئی ہے، تیسرے یہ کہ اگر ثبوت غنا کے لیے سونا اور ثبوت فقر کے لیے چاندی کو معیار قرار دیں گے تو فقر و غنا کے درمیان ناقابل عبور خلیج پیدا ہو جائے گی، اور یہ طے نہیں ہو سکے کہ غنا کب اور فقر کب شروع ہوا اسی لیے شریعت نے دونوں میں سے ہر ایک کو ثمن قرار دے کر مالوں کو پابند کر دیا ہے، اور فقر و غنا کے درمیان کوئی واسطہ نہ رکھ کر کام آسان کر دیا ہے۔

مصارف زکوٰۃ

مہتمم یا ناظم یا منیجر عطیہ یا زکوٰۃ دینے والوں کا وکیل ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ زکوٰۃ دینے والوں کی رقوم کو مستحقین زکوٰۃ تک پہونچا دے، مستحقین تو مصرف زکوٰۃ ہیں اور مہتمم دونوں کے درمیان واسطہ ہیں،

الف: —— مہتمم کی طرف سے کسی مستحق کو جو رقم سپرد کر دی گئی وہ زکوٰۃ ادا ہو گئی، اور وہ شخص اتنی رقم کا مالک ہو گیا، اب ایسے شخص کو حق ہے کہ اپنے کھانے کا، رہائش کا، پوشش کا، نظم و ضبط کا، خود انتظام کرے کیونکہ مال ان کے پاس ہے، وہ انجمن بنا کر اسے چلائیں گے اور جہاں چاہیں گے کرایہ کا مکان لے کر رہیں گے، جس کو چاہیں گے مدرس رکھ کر پڑھیں گے، پھر مہتمم صاحب کہاں جائیں گے؟ انہیں سوچ لینا چاہیے جیسے الہ آباد روڈ کے مدرسین مالک مدرسہ ہیں اور کاغذ کا مہتمم نام کا مہتمم —— یہ فتنے کا گھر ہے اس دروازے کو نہ کھولیے۔

ب: —— پھر جن لوگوں نے جائداد، کمرے، سامان بطور اوقاف مدرسہ میں دیا ہے کہ ان کا اب گویا ان کے ورثاء کو ثواب ملتا رہے گا، یہ صدقہ جاریہ ہیں، اس کا سلسلہ ختم ہو جائے گا، پھر تو سارا مال تجارتی سامان ہو گا، کرایہ کا مکان، کرایہ کی زمین، کرایہ کی سواری۔

ج: —— بہت سے علماء کو عطیات کی رقم سے تنخواہ لینے میں تردد ہوتا ہے اور آپ نے زکوٰۃ سے تنخواہ لینے اور طلباء کے ہاتھوں ذلیل کرنے کا راستہ نکال کر اداروں کی دینی حیثیت کو داؤں پر لگا دیا ہے اور اسکولوں کی طرح تجارت گاہ بنا دیا ہے، خدارا رحم کیجئے دینی اداروں پر۔

د۔ ـــــــ یہ صورت بہت اچھی ہے کہ طلباء کے خوراک اور وظیفے کی رقم ان کو نقد دیدیا جائے، اور وہ مطبخ میں جمع کردیں، وہاں سے سارے انتظام ہوتے رہیں، اس سے تملیک بھی ہوتی رہے گی، انتظام بھی چلتا رہے گا۔

عاملین علیہا

رمضان وغیرہ میں اداروں کے جو مدرسین، ملازمین، نظماء اور اراکین چندہ وصول کرتے ہیں ان میں اکثر اداروں کے مستقل ملازم ہوتے ہیں، ان کی تنخواہ وغیرہ زکوٰۃ سے نہیں دی جاسکتیں۔

الف۔ ـــــــ ہاں پورے سال میں وہ زکوٰۃ جتنی وصول کرلاتے ہیں تو ایسی وصولی کے تناسب سے ان کی تنخواہ کا کوئی حصہ زکوٰۃ سے لیا جاسکتا ہے۔

ب۔ ـــــــ زکوٰۃ کے مصارف بیان کرنے کا انداز انحصار کا ہے، "إنما الصدقات" اس لیے جب تک مستحق زکوٰۃ ہوں گے دی جائے گی، جتنے مستحق زکوٰۃ ہوں گے اسی مقدار سے دی جائے گی اور "عاملین علیہا" کی اصطلاح بھی مستقل ملازمین کو شامل ہونے نہیں دیتی ـــــــ متکلم کی منشا کا خیال رکھنا ہمارا فرض ہے۔

ج۔ ـــــــ کمیشن اہل علم کا کبھی دستور نہیں رہا، نہ علماء نے اجازت دی ہے، اگر اس سے آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے، تو جو لوگ ½ فیصدی کمیشن لیتے ہیں اور پھر مصارف سفر وصول کرتے ہیں اور اگر کوئی رقم کہیں باقی رہ گئی ہے تو اس کا بھی کمیشن لے لیتے ہیں، ان کو آپ کیا کہیں گے۔ بعض لوگ فرماتے ہیں کہ ہماری جیب سے کیا گیا؟ مگر انہیں معلوم نہیں کہ جتنی رسید آپ کے سفیر نے کاٹ دی ہیں ان سب رقوم کا آپ کو یہاں سے آخرت تک حساب دینا ہے، پھر خدا سے کیا معذرت فرمائیں گے؟

د۔ ـــــــ جو ادارے کا کلرک ہے وہ بیت المال کا منشی ہے وہ رقم کی وصولی نہیں کرتا بلکہ اس رقم کے خرچ کا حساب لکھتا ہے، اس لیے "عاملین علیہا" کی مد میں شامل نہیں ہوسکتا (واللہ اعلم)۔

فی سبیل اللہ

قرآن، کتاب الٰہی، فرمان خداوندی اور بندوں کے نام احکام لے کر آیا ہے۔ قرآن نے عبادات و معاملات اور زندگی کے مختلف شعبوں کی تعبیرات کے لیے اصطلاحیں وضع کی ہیں۔ آپ ان اصطلاحوں کا معنوی تعین آج کی لغت سے نہیں کر سکتے، اس وقت کے فہم و ادراک سے کر سکتے ہیں۔

الف: ـــــ "فی سبیل اللہ" قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے، سوال یہ ہے کہ اس سے متکلم کا منشا کیا ہے؟ کیوں کہ متکلم کی منشا کا نام تفسیر ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی منشا اگر معلوم ہوگی تو خود قرآن سے ہوگی یا پیغمبر سے معلوم ہوگی حدیث سے، حدیث ہے کہ صحابۂ کرام کی زبانی معلوم ہوگی ـــــ ہاں اگر ان میں سے کسی سے معلوم ہو تو تفسیر کرنا ممکن نہیں، ہم لغت، محاورہ یا اصول کے ذریعہ اس کی تاویل کر سکتے ہیں، تفسیر نہیں کر سکتے ہیں ـــــ یہاں تاویل کی اس لیے گنجائش نہیں کہ تفسیر موجود ہے اور جب خود حضور سے تفسیر موجود ہے تو لغت کیوں کر اس کا معارضہ کرنا خلاف اصول اور جرأت ہے۔

ب: ـــــ حافظ ابن حجر نقل کرتے ہیں کہ "فی سبیل اللہ" کا استعمال جہاد کے لیے ہوتا ہے یہی بات عام مفسرین کہتے ہیں اور خود حضور نے غازی فی سبیل اللہ کہہ کر واضح کر دیا ہے کہ فی سبیل اللہ کا ترجمہ اور مطلب جہاد ہے ـــــ نیز بخاری میں حضور کا شعر مروی ہے کہ انگلی زخمی ہو گئی تو فی سبیل اللہ فرمایا:

"ان انت الا اصبع دمیت ۔ وفی سبیل اللہ ما لقیت"

ج: ـــــ انہی وجوہ سے جمہور فقہا نے فی سبیل اللہ سے مراد جہاد لیا ہے اور بعض احادیث کے تقاضے سے امام محمد جیسے حضرات نے حج کو بھی فی سبیل اللہ میں صرف اس وجہ سے داخل کر دیا ہے کہ ان کے نزدیک حضور سے ثابت ہے، اور ویسے بھی ہو سکتا ہے کہ حضور نے حج کو عورتوں کا جہاد فرمایا ہے۔

د ـــــ رہا اختلاف رویے یا اختلاف مسائل کو ختم کرنا تو یہ کوئی شرعی عذر نہیں ہے ، نہ دلیل ہے نہ اس سے ان مسائل کا اختلاف ختم ہو سکتا ہے جو صدر اول سے چلے آ رہے ہیں ، نہ اس کے لیے لغت اور ان کے لیے توسع سے کام نکالا جا سکتا ہے کیوں کہ اس سے صرف اتنا ہو گا کہ پانچویں رائے اور پیدا ہو جائے گی ، کہ علامہ مجیب اللہ نے لغت کے سہارے زکوٰۃ کو عام کر دیا ہے کہ اک اجتہادی مسئلہ بن گیا ہے ۔ اور اصل یہ ہے کہ صدر اول میں فقہاء اور علماء نے قرآن و احادیث کے پر معانی اشارات کی روشنی میں متعین کر دیے ہیں ، ان کے دور کی رائے قبول کر لی جائے ـــــ ہاں جو نئے مسائل پیدا ہوں ، ان کے دلائل ، اقوال اور علت و اسباب کا پتہ لگا کر کوئی رائے قائم کی جائے ، ورنہ پرانے مسائل کو نئے رجحان سے طے کرنا ایک خطرناک کھیل ہے اور بے سود محنت ۔

ہ ـــــ علامہ کاسانی کا یہ استدلال بہت اچھا ہے کہ حضرت معاذ کو معلم اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ہدایت دی ہیں ، اس میں ، بخاری و مسلم کی روایتوں میں ہے کہ :

« توخذ من اغنیائهم و ترد الی فقرائهم »

اس سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ کے لحاظ سے انسانوں کی دو صنفیں ہیں ، ایک اغنیاء کی دوسری فقراء کی ، اور زکوٰۃ کا مصرف وہ فقراء ہیں جن کی فہرست قرآن نے دی ہے ۔ البتہ یوں کہ حدیث صحیح کی وجہ سے "عاملین علیہا" کے غناء کے باوجود دیا جائے گا ۔ اس لیے اس فہرست میں ان کا اضافہ غالباً اس لیے ہے کہ زکوٰۃ جب تک جمع نہ کی جائے گی ، اس فہرست کے مطابق تقسیم نہیں کی جا سکتی اس لیے غناء کے باوجود اجازت دی گئی ہے ورنہ اصل ہے فقر و حاجت وغیرہ ، اس وجہ سے علامہ کاسانی نے فی سبیل اللہ میں اگر وسعت بھی رکھی ہے تو فقر کی قید لگا دی ہے اور شخصی طور پر ادا کرنے کی رعایت کی ہے ۔

و ـــــ بہتر ہو کہ جن مسائل کو ائمہ نے نصوص کی روشنی میں جمع کر دیا ہے اور جمہور فقہاء نے اسے قبول کر لیا ہے اس پر لغت اور محاورے کی مدد سے اضافہ نہ کیا جائے ورنہ دین بازیچۂ اطفال بن جائے گا ۔

سوالات کے جوابات

از: مولانا محمد علاء الدین ندوی فاضل دیوبند، بیالخیف، ضلع کھگڑیا

مصارف زکوٰۃ یا صدقات واجبہ کے مصارف سے متعلق آنجناب نے اظہار خیال کا حکم فرمایا ہے تو اس بارے میں عرض ہے کہ کیا میں اور کیا میری رائے اور کیا میرا مبلغ علم۔ لیکن پھر بھی ہر کس و ناکس کو کسی بھی طرح کی رائے قائم کرنے کا میرے خیال میں کچھ نہ کچھ حق ضرور ہوتا ہے، اگرچہ بہت ممکن ہے کہ اس کی وہ رائے ارباب علم و فکر کی نگاہوں میں کچھ زیادہ قابل اعتناء نہ ٹھہرے، لیکن اس سے رائے دہندہ کے حق رائے دہی پر غالباً کوئی اثر نہیں پڑتا۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اپنی رائے اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی جرأت و جسارت کر رہا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی عرض کردوں کہ مجھے اپنی بات یا رائے پر اصرار بہرحال نہیں ہے یہ رائے ہے اور صرف رائے۔

آیت کریمہ "انما الصدقات للفقراء" الآیۃ میں لفظ "فی سبیل اللہ" میرے خیال میں کسی مخصوص متعین اور محدود معنی پر دلالت نہیں کرتا، اگرچہ متقدمین و متاخرین مفسرین میں سے تقریباً سبھوں نے اس سے مراد مجاہدین یا مجاہدین کے لیے سامان جہاد خریدنا سمجھا اور یہی مراد لیا ہے۔ قرآن و حدیث کے سلسلہ میں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ یہ دونوں چیزیں قیامت تک کے لیے ہیں اور دونوں عہد نبوی علی صاحبہ الصلوٰۃ والسلام سے لے کر قیامت تک کے سرچشمۂ ہدایت ہیں، ہر دور، ہر زمانہ اور ہر قسم کے حالات میں پیش آمدہ ضرورتوں اور مسائل کے حل کے لیے ہمیں بنیادی طور پر ان کی جانب ہی رجوع کرنا ہوگا، پھر حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین، تابعین عظام اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ

کے اقوال و تفقہ سے استفادہ کرنا لازمی ہوگا۔

آج کا دور پُرفتن جیسا کچھ ہے وہ کسی صاحب علم و بصیرت کی نگاہوں سے مخفی نہیں، جتنے فتنے ان دنوں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف برپا کیے جا رہے ہیں، عالمی و ملکی پیمانے پر مسلمانوں کو مذہب سے دور رکھنے اور انھیں اس سے برگشتہ کرنے کی جس قدر سازشیں رچی جا رہی ہیں غالباً اس کی نظیر و مثال گذشتہ تاریخ میں نہ مل سکے، ان حالات میں یہ تو ممکن نہیں کہ کوئی فرد واحد اپنے بل بوتے اور اسباب و وسائل کے ساتھ ان سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اٹھے اور ان کا قلع قمع کر کے رکھ دے، البتہ یہ ممکن ہے کہ ملت اسلامیہ کے ارباب علم و فکر، دانشور اور دل دردمند رکھنے والے کمربستہ ہوں، میدان عمل میں اتریں اور ایسے ادارے یا اکیڈمیاں قائم کریں جہاں سے قلمی اور تبلیغی جہاد اچھے پیمانہ پر علمی و فکری انداز سے شروع کیا جائے اور ملت کو ان مفاسد سے خبردار کرنے کے علاوہ اپنا تحفظ اور دین پر کاربند رہنے کی مؤثر طور پر تلقین کی جائے۔

لیکن اس کام کی ابتدا کرنے سے پہلے جو بات سب سے پہلے سامنے آتی ہے وہ سرمایہ کی ہے، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ کام جس نوعیت کا ہے اور اسے جس پیمانہ پر انجام دیا جانا چاہیے اس کے لیے ضرورت کثیر سرمایہ کی ہوگی، اور وہ کہاں سے آئے گا؟ کسی فرد واحد سے اس کی توقع نہیں کہ وہ تنہا اس بارگراں کا متحمل ہو سکے گا، ملت کا حال اور عالم یہ ہے کہ اس کے استحقاق محدود و مختصر افراد کی تعداد صدقات غیر واجبہ (نافلہ) کی جانب میلان رکھتی ہے۔ ہاں زکوٰۃ ادا کرتی ہے، لیکن مصارف زکوٰۃ میں اگر قدماء و متاخرین کی رائیں اختیار کی جائیں تو ایسے کاموں کے لیے اس رقم میں کوئی گنجائش نہیں نکلتی تو پھر آخر کون سی راہ اختیار کی جائے کہ عالمی پیمانے پر کی جانے والی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سد باب ہو سکے اور ملت کو در پیش فکری ارتداد اور عملی گمراہی سے بچانے کی منظم طور پر باقاعدہ کوشش کی جا سکے۔

حالات کی سنگینی، ضرورت کی اہمیت و شدت اور ملت و وقت کی پکار کا تقاضا ہے کہ امام قفالؒ کے اس قول پر غور کیا جائے، جسے انھوں نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ امام موصوف نے اس قول کی نسبت بعض فقہاء کی جانب بھی کی ہے، اگرچہ ان کے ناموں کی صراحت نہیں کی ہے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے،

"واعلم ان ظاهر اللفظ في قوله تعالى "وفي سبيل الله" لا يوجب

القصر علی کل الغزاة فلهذا المعنی نقل القفال في تفسيره عن
بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الی جميع وجوه
الخير من تكفين الموتی وبناء الحصون وعمارة المساجد لأن
قوله في سبيل الله عام في الكل"

ان کے علاوہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور نواب صدیق حسن خان صاحب مرحوم وغیرہ کی تحریروں سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ آیت کریمہ انما الصدقات میں انما حصر کے لیے تو ہے لیکن یہ حصر حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے۔ اس کے علاوہ فی سبیل اللہ بھی عام ہے، اسے محدود و مخصوص کسی دلیل کی بنیاد پر کیا جائے۔

بہرحال میری رائے یہ ہے کہ آج کا دور اس بات کا متقاضی ہے کہ اس طرح کے کاموں میں زکوٰۃ و صدقات کی رقمیں صرف کی جا سکتی ہیں اور اگر کام بہتر طور پر اس رقم کے بغیر بھی چل سکتا ہو اور زکوٰۃ کی رقم نکالنے سے بچایا جا سکتا ہو تو احتیاط اسی میں ہے کہ اس سے بچا جائے۔

واللہ اعلم وعلمہ اتم واحکم

سوالنامہ کا جواب

از: ـــــــــــــ مولانا عبد القیوم صاحب پالنپوری

ملک تام سے متعلق سوالات کے جوابات

(۱) جس مال تجارت کی قیمت دے دی گئی ہے، لیکن مال پر ابھی مشتری نے قبضہ نہیں کیا ہے، اس میں پیشگی ادا کردہ قیمت کی زکوٰۃ بائع پر ـــــــ جو اس کا مالک ہو گیا ہے اور قبضہ بھی کر لیا ہے ـــــــ واجب ہے، لانہا مملوکۃ ملکاً یداً۔

اور وہ خریدا ہوا مال تجارت جس پر مشتری نے ابھی تک قبضہ نہیں کیا ہے صحیح قول کے مطابق مشتری پر قبضہ سے قبل اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے، اور قبضہ کے بعد گزرے ہوئے سال کی زکوٰۃ بھی واجب ہے۔

"وذکر فی المحیط ..... ان المبیع قبل القبض قیل لا یکون نصاباً لان الملك ناقص ـــــ والصحیح أنہ یکون نصاباً لأنہ عوض عن مال كانت یدہ ثابتۃ علیہ وقد امکنہ احتواء الید علی العوض فتعتبر یدہ باقیۃ علی النصاب باعتبار التمکن شرعاً اھ۔ فعلی ھذا قولھم لا تجب الزکاۃ معناہ قبل قبضہ واما بعد قبضہ فتجب زکاتہ فیما مضی کالدین القوی"۔ (۱)

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۲۵

(۲) کرایہ کی مد میں دی ہوئی پیشگی رقم کا شرعاً مالک مکان مالک ہو جاتا ہے لہٰذا اس نے جو کرایہ کی پیشگی رقم وصول کی ہے اس کی زکوٰۃ اس مالک مکان پر واجب ہے۔

اس لیے کہ اس کا قبضہ بھی ہو چکا ہے اور وہ مالک مکان اس پیشگی وصول کردہ رقم کا مالک ہو گیا ہے جیسا کہ حسب ذیل جزئیہ سے ظاہر ہوتا ہے:

"رجل له ألف درهم لا مال له غيرها استأجر بها دارا عشر سنين لكل سنة مائة فدفعها ولم يسكنها حتى مضت السنون والدار في يد الآخر يزكي الآخر في السنة الأولى عن تسع مائة وفي الثانية عن ثمان مائة لا زكاة للسنة الأولى ثم ينقص لكل سنة زكاة مائة أخرى وما وجب عليه بالسنين الماضية لأنه ملك الألف بالتعجيل كلها فإذا لم يسلم الدار إليه سنة انتقضت الإجارة في العشر لأنه استهلك المعقود عليه قبل التسليم فزال عن ملكه مائة وصار دينا على الآجر، كذا الخ .... ولا زكاة على المستأجر في السنة الأولى والثانية لنقصان نصابه في الأولى ولعدم تمام الحول في الثانية الخ" (۱)

ڈپوزٹ کی رقم رہن ہے اور شئ مرہون کی زکوٰۃ نہ راہن پر ہوتی ہے نہ مرتہن پر لہٰذا ڈپوزٹ کی رقم کی زکوٰۃ نہ مرتہن یعنی مالک مکان یا دکان پر واجب ہے نہ کرایہ دار پر واجب ہے:

"ولا في مرهون بعد قبضه أي لا على المرتهن لعدم ملك الرقبة ولا على الراهن لعدم اليد وإذا استرده الراهن لا يزكي عن السنين الماضية وهو معنى قول الشارح "بعد قبضه" ويدل عليه قول البحر ومن موانع الوجوب الرهن وظاهره ولو كان الرهن أزيد من الدين" (۲)

---

(۱) البحر الرائق ۲/۲۱۹ و فتاوی عالمگیریہ ۱/۱۷۵

(۲) شامی ۲/۹

(۳) اداروں اور مدارس وغیرہ میں جمع ہونے والی رقوم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

صدقات واجبہ میں عدم وجوب ظاہر ہے اس لیے کہ اگر خود معطین کے پاس وہ رقم رہتی تو ان پر زکوٰۃ اس رقم کی واجب نہ ہوتی اور عطیات کی رقم معطی کی ملک سے نکل جاتی ہے اور مدرسہ اور ادارہ کے ساتھ مختص ہو جاتی ہے۔

(۴) اگر وہ مال خالص حرام ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ کیوں کہ اس کے مالک معلوم ہیں تب تو واجب الرد ہے اور اگر معلوم نہیں تو کل واجب التصدق ہے۔

"وفی رد المحتار: فی القنیة لو کان الخبیث نصاباً لا یلزمه الزکاة لأن الکل واجب التصدق علیه فلا یفید ایجاب التصدق ببعضه اھ ومثله فی البزازیة" (۱)

لأن المغصوب ان علمت اصحابه او ورثتهم وجب رده علیهم والا وجب التصدق به" (۲)

اگر یہ حرام مال حلال میں مخلوط ہو (خواہ باہم تمیز مشکل ہو یا نہ ہو) تو دیکھا جائے گا کہ اگر مال حرام کی مقدار اس میں سے نکالی جاوے تو بقدر نصاب بچتا ہے یا نہیں، اگر بچتا ہے تو اس مقدار باقی میں زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر نہیں بچتا تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

"قالوا لو ان سلطاناً غصب مالاً وخلطه صار ملکاً له حتی وجبت علیه الزکاة وورث عنه علی قول أبی حنیفة رح لأن خلط دراهمه بدراهم غیره عند استهلاک .... اھ۔ هکذا ذکروا وهو مشکل لأنه وان کان ملکه عند ابی حنیفة بالخلط فهو مشغول بالدین والشرط الفراغ عنه فینبغی ان لا تجب الزکاة فیه علی قوله ایضاً ولذا شرط فی المبتغی بالمعجمه ان یبرأه اصحاب الاموال لأنه قبل الابراء مشغول بالدین وهو قید حسن یجب حفظه" (۳)

---

(۱) ۳۳/۲ (۲) شامی ۳۳/۲ (۳) البحر الرائق ۲۲۱/۲، امداد الفتاویٰ حاشیہ

(۵) امام صاحب رح کے نزدیک دیون کی تین قسمیں ہیں۔ قوی ۔ متوسط۔ ضعیف۔
دین قوی وہ دین ہے جو کسی مال تجارت یا سونے چاندی کے عوض میں کسی کے ذمہ واجب ہوا ہو۔ دین قوی میں زکوٰۃ دائن ہی کے ذمہ ایام ماضیہ کی بھی واجب ہوگی، مگر ادائے گی لازم اس وقت ہوگی جب کہ بقدر چالیس درہم کے وصول ہو جائے۔

"وفی الدر المختار: فتجب زکاتہا اذا تم نصابا وحال الحول لکن لا فوراً بل عند قبض اربعین درھما من الدین القوی کقرض وبدل مال تجارۃ الخ۔" (۱)

مدیون پر کسی حال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی اگرچہ اس مال کو تجارت میں لگا کر فائدہ اٹھا رہا ہو۔

"وسببہ ملک نصاب حولی تام فارغ عن دین لہ مطالب من جہۃ العباد۔" (۲)

جس دین قوی کے وصول ہونے کی امید ضعیف ہو یا بالکل نہ ہو، قبل وصول دائن پر اس کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اور وصول ہونے کے بعد سال گزرنے کے بعد (اگر دوسرا مال زکوٰۃ موجود نہیں ہے) اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اور گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔

"ولو کان الدین علی مقر ملئ او علی معسر او مفلس ای محکوم بافلاسہ او علی جاحد علیہ بینۃ وعن محمد لا زکاۃ وھو الصحیح (الدر المختار) وفی رد المحتار: والحاصل فیہ اختلاف التصحیح ۔ (۳)۔ وفیہ ایضاً وقدمنا اول الزکاۃ اختلاف التصحیح فیہ ومال السرخسی الی ھذا وقال بل فی زماننا یقر المدیون بالدین وبملاءتہ لا یقدر الدائن علی تخلیصہ منہ فھو بمنزلۃ العدم۔" (۴)

دین متوسط جو مال تجارت اور سونے چاندی کے علاوہ مال کا معاوضہ ہو اور دین ضعیف جو مال کا

---

(۱) الدر المختار علی الشامی ۲/۳۹۔۴۰ (۲) شامی ۲/۵۰۶
(۳) رد المحتار ۲/۴ (۴) رد المحتار ۲/۹۵

معاوضہ ہو، جیسے دین مہر یا بالکل معاوضہ نہ ہو، جیسے حصہ میراث و وصیت، دین متوسط کا حکم امام صاحب ؒ سے اصح الروایتین کے مطابق اور دین ضعیف کا حکم یہ ہے کہ ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے بلکہ وصول ہونے کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"وعند قبض مأتين مع حولان الحول بعده اى بعد القبض من دين ضعيف وهو بدل غير مال كمهر الخ"[1] قال فى البدائع ان رواية ابن سماعة انه لازكاة فيه (اى فى الدين المتوسط) حتى يقبض المأتين ويحول الحول من وقت القبض هى الاصح من الروايتين عن ابى حنيفةؒ اهـ ومثله فى غاية البيان وعليه فحكمه حكم الدين الضعيف الخ"[2]

(۶) پراویڈنٹ فنڈ کی رقوم پر قبل وصول زکوٰۃ واجب نہیں ہے اور وصولیابی کے بعد جب سال گزر جائے اس وقت زکوٰۃ واجب ہوگی، اور ایام ماضیہ کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔(۳)
حاجت اصلیہ کے تعین کے متعلق سوال واضح نہیں ہے۔

چوتھی شرط کے متعلق سوال کا جواب

(۱) حکومت سے حاصل کردہ قرض طویل الاجل کی صورت میں وجوب زکوٰۃ کے لیے پورے قرض کو اموال زکوٰۃ سے منہا کیا جائے گا، صرف سالانہ واجب الادا قسط وضع نہیں کی جاوے گی۔

"وفى الزيلعى ايضا لايتحقق الغنى بالمال المستقرض مالم يقبض"[4]

---

(۱) الدرالمختار (۲) رد المحتار مع الدر المختار ۲۹/۲

(۳) پراویڈنٹ فنڈ کی رقم دین متوسط اور قوی میں داخل نہیں، اس لیے کہ یہ مال ہی کا بدل نہیں ہے کیوں کہ اجرت ثمن کا جز ہے اور خدمت حر مال نہیں، لہٰذا دین ضعیف میں داخل ہے اور دین ضعیف کی طرح اس میں بھی سابقہ سالوں کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی بلکہ وصول ہونے کے بعد سال گزر جائے تب زکوٰۃ واجب ہوگی اگر اس کے پاس زکوٰۃ کا نصاب پہلے سے موجود نہیں ہے۔

(۴) رد المحتار ۲/۱۰، مطبوعہ استنبول

ومنها: ان لا یکون علیه دین مطالب به من جهة العباد عندنا فان کان

فانه یمنع وجوب الزکاة بقدره حالاً کان او مؤجلاً ۔ (۱)

حکومت سے لیے ہوئے قرضوں کے بارے میں عبارت زاد الفقیر عن الجواہر المعنی انه (ای المؤجل) غیر مانع[۱] سے واضح ہونا چاہیے اس لیے کہ قرض میں شرعاً تاجیل صحیح نہیں ہے لہٰذا شرعاً وہ مؤجل نہیں ہیں۔ کما فی رد المحتار (۲)

قال فی الهدایه فان تاجیله لا یصح .... ویؤیده ما فی الفتح

من القنیة التاجیل فی القرض باطل۔

کمپنی پر زکوٰۃ

تجارت مشترکہ اور کمپنی وغیرہ میں احناف رحمہم اللہ کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے ہر حصہ دار کے اپنے انفرادی حصہ کا اعتبار ہوگا۔

"لا تجب الزکاة عندنا فی نصاب مشترک من سائمة ومال تجارة (۳)

المراد ان یکون بلوغه النصاب بسبب الاشتراک وضم احد المالین الی

الآخر بحیث لا یبلغ مال کل منهما بانفراده نصاباً[۴] فان بلغ نصیب

احدهما نصاباً زکاه دون الآخر (۵)

جواہرات کی زکوٰۃ

جو لوگ ہیرے جواہرات کی تجارت کرتے ہیں ان پر ان جواہرات وغیرہ کی زکوٰۃ یقیناً واجب ہے لیکن جو لوگ سرمایہ محفوظ کرنے کے لیے ہیرے جواہرات خریدتے ہیں اور خریدتے وقت تجارت کی نیت نہیں ہوتی ہے ان پر ان جواہرات کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ اسی طرح جو عورتیں زیب و آرائش کے لیے

---

(۱) شامی ۲/۷ (۲) رد المحتار ۲/۲۶۰ (۳) الدر المختار

(۴) رد المحتار (۵) شامی مع الدر ۲/۳۰۴

استعمال کرتی ہیں ان پر بھی احناف کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

"اما الیواقیت واللآلی والجواهر فلا زکاۃ فیها وان کانت حلیا الا ان تکون للتجارۃ کذا فی الجوهرۃ" (۱)

اموال تجارت پر زکوٰۃ

تاجر اگر تھوک سے فروخت کرتا ہے تو سامان تجارت کی زکوٰۃ کی ادائیگی کے دن جس تھوک بھاؤ سے بیچا جارہا ہے اس بھاؤ سے قیمت لگائے اور اگر تاجر پھٹکر سے فروخت کرتا ہے تو پھٹکر فروختگی کے بھاؤ کا اعتبار کرے۔ الحاصل تھوک خریدار جس قیمت سے لیتا ہے وہ معتبر ہے۔

جو لوگ زمینوں کی تجارت کرتے ہیں وہ زمینیں عشری یا خراجی ہیں تو ان میں عشر یا خراج واجب ہے ان میں تجارت کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

"ما فی البدائع: قال اصحابنا فیمن اشتری ارض عشر للتجارۃ او اشتری ارض خراج للتجارۃ ان فیها العشر او الخراج ولا تجب الزکاۃ التجارۃ مع احدهما هو الروایۃ المشهورۃ عنهم" (۲)

شیئرز اور بونڈس کی زکوٰۃ

کمپنیوں کے شیئرز کی خریداری اگر تجارت کی نیت سے ہی ہوئی ہے تو کمپنیوں کے یہ تمام حصص مال تجارت ہونے کی وجہ سے ان کی پوری مالیت پر زکوٰۃ واجب ہوگی اور وجوب زکوٰۃ کے دن مارکیٹ کا جو بھاؤ ہوگا اس کا اعتبار ہوگا۔

"واللازم فی ...... وفی عرض تجارۃ قیمته نصاب من ذهب او ورق" (۳)

"ویجاز دفع القیمۃ وانها تعتبر یوم الوجوب وقالا یوم الاداء کما فی السراج" (۴)

---

(۱) عالمگیری ۱/۱۸۰ (۲) البدائع ۲/۵۷ - رد المحتار ۲/۴

(۳) تنویر الابصار - شامی ۲/۳۰ (۴) رد المحتار ۲/۳۱

اور اگر شیئرز کی خرید تجارت کی نیت سے نہیں کی ہے تو وجوب زکوٰۃ کے دن کمپنی کے پاس ان شیئرز کا جو حصہ تجارت میں لگا ہوا ہے اس حصہ اور نفع پر زکوٰۃ واجب ہوگی، خواہ وہ نفع اسی کو پورا مل گیا ہو خواہ کچھ تقسیم ہو کر بقیہ تجارت میں شامل ہو گیا ہو، اور جو حصہ عمارات و آلات میں لگا ہوا ہے اس کی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔

"ولا فی ثیاب البدن ...... ونحوها[1] فی ردالمحتار وکالحوانیت والعقار۔[2]

وفی الدر: وکذا آلات المحترفین۔[3]

قرض دہندہ نے جو سرمایہ بونڈز میں لگایا ہے ان بونڈز کے کیش کرانے کے وقت یعنی اس رقم کے وصول ہونے کے بعد اس سرمایہ پر سابقہ تمام سالوں کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔

"تجب زکاتها اذا تم نصابا وحال الحول ...... عند قبض اربعین درهما من الدین القوی کقرض۔[4]"

مجموعی نصاب زکوٰۃ

کسی شخص کے پاس صرف سونا ہے تو وجوب زکوٰۃ کے لیے سونے کے نصاب کا اعتبار کیا جائے گا مثلاً کسی کے پاس دو تولہ سونا ہے اور مال تجارت، چاندی، نقد روپیہ میں سے کوئی نہیں ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے اگرچہ اس کی قیمت چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر یا اس سے چند گنا زیادہ ہو جائے۔

"واجمعوا انه لا تعتبر القیمة فی الذهب والفضة عند الانفراد فی حق التکمیل النصاب حتی ...... وکذلک لو کان له آنیة ذهب وزنها عشرة وقیمتها لصناعتها مأتا درهم لا تجب فیه الزکاة باعتبار القیمة[5] ولما اذا کان له الصنفان جمیعا فان لم یکن کل واحد منهما نصابا ...... فانه یضم احدهما الی الآخر فی حق تکمیل النصاب عندنا۔[6]

---

(۱) الهندیه (۲) شامی ۲/۱۲ (۳) الدر ۲/۱ (۴) الدر علی الشامی ۲/۳۰۵
(۵) البدائع ۲/۱۹ (۶) ایضاً ۲/۱۹

واما اموال التجارة فتقدير النصاب فيها بقيمتها من الدنانير والدراهم فلا شئ فيها مالم تبلغ قيمتها مأتي درهم او عشرين مثقالا من ذهب فتجب فيها الزكاة۔ (۱)

لو كان بالتقويم باحدهما يتم النصاب وبالآخر لا، فانه يقوم بما يتم به النصاب نظراً للفقراء واحتياطا۔ (۲)

اذا كان مع عروض التجارة ذهب وفضة فانه يضمها الى العروض ويقوم جملة لان معنى التجارة يشمل الكل۔ (۳)

ہاں اگر کسی کے پاس سونے کے علاوہ مال تجارت چاندی اور نقد روپے میں سے کوئی ہے تو ان کی مالیت چاندی کے نصاب کے برابر ہو جاتی ہے تو زکوۃ واجب ہوگی یعنی اس صورت میں چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔ اسی طرح صرف مال تجارت یا صرف روپے یا دونوں ہیں اور ان کی مالیت چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر ہے تو زکوۃ واجب ہوگی۔

اسی طرح نصاب حرمت زکوۃ اور غناء کے مستحق ہونے کے لیے اگر کسی کے پاس صرف سونا ہے اور مال تجارت، روپے، چاندی اور ضرورت سے زاید کوئی چیز بھی نہیں ہے تو سونے کے نصاب کا اعتبار ہوگا، مثلاً کسی کے پاس ۶ تولہ سونا ہے اور اس کے پاس دوسری کوئی چیز ضرورت سے زاید مال تجارت چاندی اور روپے وغیرہ میں سے نہیں تو ایسے شخص کے لیے زکوۃ لینا جائز ہے حرام نہیں ہے، اس لیے کہ یہ نصاب سے کم کا مالک ہے۔

لیکن اگر سونے کے علاوہ ان مذکورہ اشیاء میں سے کسی چیز کا مالک ہے تو اب چاندی کے نصاب کی قیمت کا اعتبار ہوگا۔ اگر چاندی کے نصاب کی قیمت کے بقدر پہونچ جاتی ہے ان کی قیمت تو وہ غنی ہے اس کے لیے زکوۃ لینا جائز نہیں ہے۔ حاصل یہ ہے کہ حرمت زکوۃ کے لیے اگر اس کے پاس صرف سونا ہے تو سونے کا کے نصاب کا اعتبار ہوگا اور اگر سونا نہیں ہے یا ہے لیکن دیگر مذکورہ اشیاء میں سے کسی ایک چیز کا بھی وہ شخص مالک ہے تو چاندی کے نصاب کا اعتبار ہوگا۔

---

(۱) بدائع ۲/۲۰ (۲) البدائع ۲/۲۱ (۳) بدائع ۲/۲۰

"ولا إلى غني يملك قدر نصاب فارغ عن الحاجة الأصلية من أي

مال كان الخ ـ (۱)

وبهذا ظهر أن المعتبر نصاب النقد من أي مال كان بلغ نصاباً من

جنسه أو لم يبلغ اهـ ـ (۲)

روى عن محمد روايتان في النصاب المحرم للزكاة هل المعتبر فيه

القيمة أو الوزن ففي المحيط عنه الأول وفي الظهيرية عنه الثاني

.... والظاهر اعتبار الوزن في الموزون الخ ـ" (۳)

مصارف زکوٰۃ

(۱) صورت مسئولہ میں بہتر اور جائز صورت یہ ہے کہ ہر طالب علم سے شروع مہینہ میں معاملہ طے کر دیا جائے اور ختم ماہ پر اس کو ۲۵۰ روپے کا مالک بنا دیا جائے پھر مدرسہ میں وہ روپے جمع کرادے یا اس سے وصول کر لیے جاویں۔
مہتمم مدرسہ معطیین زکوٰۃ کا وکیل ہے اور مستحقین زکوٰۃ طلبہ کا وکیل نہیں ہے۔

(۲) مدرسہ کے سفرا اور چندہ حاصل کرنے والے العاملین علیہا میں داخل نہیں ہیں، نیز انھیں شرح فی صد متعین کمیشن پر سفیر مقرر کرنا صحیح نہیں ہے اس لیے کہ اجرت مجہول ہے۔
اسی طرح حساب آمد و خرچ کے اندراج پر جو عملہ مقرر ہے ان کی ماہانہ تنخواہ مد زکوٰۃ سے ادا کرنا بھی جائز نہیں ہے۔

مصرف فی سبیل اللہ

فقہاء مجتہدین رح کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن پاک میں مذکور مصارف ہی میں زکوٰۃ صرف کی جائے گی، ان کے علاوہ دوسری جگہوں میں صرف نہیں کی جاوے گی۔ مصارف زکوٰۃ پر قیاس کر کے

---

(۱) الدر المختار مع الشامی ۲/۹۹ (۲) رد المحتار ۲/۲۹ (۳) ایضاً (۴) وأما العاملون عليها فهم الذين نصبهم الإمام لجباية الصدقات [illegible]

کر کے دوسری اشیا کو علت کے اشتراک کی وجہ سے مصارف زکوٰۃ میں داخل نہیں کیا جائے گا، اور ان میں توسیع اور تعمیم کرنا صحیح نہیں ہے۔

"واتفقوا علی انہ لا یجوز ان تخرج الزکاۃ الی بناء المسجد .... وان کان من القرب لتعیین الزکاۃ بما بینت لہ" (۱)

ولا یجوز صرف الزکاۃ الی غیر من ذکر اللّٰہ تعالیٰ من بناء المسجد ...... واشباہ ذلک من القرب التی لم یذکرھا اللّٰہ تعالیٰ" (۲)

اور الخرشی میں ہے: (۳)

"ولا یجوز صرف شیٔ من الصدقات فی غیر الوجوہ المبینۃ الخ۔

وفی البدائع وعلی ھذا یخرج صرف الزکاۃ الی وجوہ البر من بناء المسجد والرباطات .... انہ لا یجوز" (۴)

اور جمہور فقہاء ومفسرین کے نزدیک مصرف فی سبیل اللہ کا مصداق صرف غازی ہیں جو جہاد عسکری میں مشغول ہیں۔

"واما فی سبیل اللّٰہ فقال مالک رح: فی سبیل اللّٰہ مواضع الجہاد والرباط وبہ قال ابو حنیفۃ رح وقال غیرہ الحجاج والعمار وقال الشافعی ھو الغازی جار الصدقۃ۔ (۵)

وفی الدر المختار: وفی سبیل اللّٰہ وھو منقطع الغزاۃ وقیل الحاج۔ وفی رد المحتار: ھذا قول محمد رح والاول قول ابی یوسف رح ...... وفی نھایۃ البیان انہ الاظھر وفی الاسبیجابی انہ الصحیح" (۶)

اور فقہاء احناف کے نزدیک عاملین زکوٰۃ اور مولفۃ قلوب کے علاوہ زکوٰۃ کے تمام مصارف میں استحقاق زکوٰۃ کے لیے فقر و احتیاج کی شرط ہے۔

(۱) الافصاح ۱/۲۳۱ (۲) المغنی لابن قدامہ ۲/۵۲۷ (۳) الخرشی ۲/۲۱۹

(۴) ۲/۳۹۔ بحوالہ منقول ہیں الفرقان لکھنؤ، اگست ۱۹۸۸ء سے۔ (۵) بدایۃ المجتہد ۱/۲۷۶

(۶) رد المحتار ۲/۸۳

ادارۃ القرآن کراچی کی چند اہم اور مفید مطبوعات

کیا آپ موت کیلئے تیار ہیں	اللہ کا خطاب (اہل ایمان سے)
بنیادی فقہی احکام	اشرف المکتوبات
اجتماعی ختم قرآن کی شرعی حیثیت	احکام وآداب طہارت، وضو، نماز
جدید تجارتی شکلیں	حج عمرہ اور انکے جدید مسائل
سوال وجواب (آپ کے مسائل اور ان کا حل)	شیئرز اور کمپنی طریقہ کار و احکام
ضرورت وحاجت کا احکام شرعیہ میں اعتبار	لڑکے اور لڑکیوں کے نکاح کا اختیار
وقف املاک کے شرعی احکام	ذکر سید الکونین ﷺ
اہم فقہی فیصلے	طبی اخلاقیات
تعلیم سیرت	مسند ابوداؤد طیالسی ۲ جلد
بائبل قرآن سائنس	فضائل اعمال اعلیٰ
طشت جواہر	نکاح مشروط
جواہر حکیم الامت	نبیوں کی سچی کہانیاں
جدید فقہی مباحث ۱۷ جلد	JESUS .... (تعلیم اسلام حضرت عیسیٰ) The Authority of Sunnah (حجیت حدیث) ISLAM AN INTRODUCTION (تعارف اسلام)
جو تم مسکراؤ تو سب مسکرائیں	The Life and Message. (خطبات مدراس) SHAMAA-IL TIRMIDHI (شمائل ترمذی) BIBLE QURAN & SCIENCE (بائبل قرآن اور سائنس)
دل کی دنیا	"Life Example of P.U.H" (اسوۂ رسول اکرم ﷺ) "The Islamic way in the Death" (احکام میت) COMPENDIUM OF ISLAMIC LAW مجموعہ قوانین اسلامی

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

مجموعہ

قوانین اسلامی

(مسلم پرسنل لا سے متعلق احکام شریعت کا دفعہ وار مرتب مجموعہ)

ناشر

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

اُسوۂ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

حدیث کی مستند کتابوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائل و خصائل کو جمع کر کے انسانی زندگی کے ہر پہلو، ہر شعبہ اور ہر حال کے متعلق ہدایات پیش کی گئی ہیں جن سے اتباعِ سنت اور اتباعِ رسول کا صحیح مفہوم متعین ہو جاتا ہے

مؤلف

حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبد الحی صاحب قدس سرہ

خلیفۂ مجاز

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

مقدمہ: حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تأثرات: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ

دیباچہ: مولانا سید ابو الحسن علی ندوی صاحب مد ظلہ العالی

ناشر

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیۃ

ادارۃ القرآن کراچی کی چند جدید ومفید عربی مطبوعات

فقہ المشکلات (عربی)	جامع احادیث الاحکام (متن اعلاء السنن ۲ جلد)
الفقہ الحنفی وادلتہ ۳ جلد	اعلاء السنن ۱۸ جلد مع فہارس
شرح الزیادات للامام محمد ۶ ج	الاشباہ والنظائر ابن ملقن ۲ جلد
جمع الفوائد من جامع الاصول ۲ ج	الاشباہ والنظائر ابن نجیم ۳ جلد
مجموعہ رسائل لکھنوی، ۶ جلد	شرح طیبی ۱۲ جلد
انوار المحمود شرح سنن ابی داود ۲ ج	مصنف عبد الرزاق ۱۲ جلد
اعلام الاعلام بمفہوم الدین والاسلام	الفتاویٰ تاتارخانیہ ۵ جلد
کتاب الرد علی سیر الاوزاعی	ہدایہ حاشیہ عبد الحئی لکھنوی ۴ جلد
شرح مقامات الحریری للشریشی	مجموعہ رسائل کشمیری ۴ جلد
شرح شرح المنار فی اصول الفقہ	الکوکب الدری ۴ جلد
فتح الغفار معجم رد المحتار	احکام القرآن تھانوی ۵ جلد
مجموعۃ الخطب المکتوبۃ	جدید فقہی مباحث ۱ تا ۱۷ (اردو)
معجم لغۃ الفقہاء	JESUS .... (تعلیم اسلام حضرت عیسیٰ) The Authority of Sunnah (حجیت حدیث) ISLAM AN INTRODUCTION (تعارف اسلام)
مکانۃ الامام ابو حنیفۃ بین المحدثین	The Life and Message (مطالعہ سیرت) SHAMAA-IL TIRMIDHI (شمائل ترمذی) [illegible] (علوم القرآن و علوم حدیث)
المدخل الی دراسۃ علم الکلام	"Life Example of P.U.H" (اسوۂ رسول ﷺ) "The Islamic way in the Death" (اسلام اور میت)

ادارۃ القرآن والعلوم الاسلامیہ